



## فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1-	انوکھا انتقام	5
2-	محروم محبت	51
3-	جرم بے گناہی	110
4-	زمین اندوز	153
5-	بعد از وقت	209

## انوکھا انتقام

منظر روٹکے کھڑے کر دینے والا تھا!

چوہدری فرزند علی کی لاش کو دو متوازی حصوں میں تقسیم کر کے نشان عبرت بنا دیا گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس کی شادی خانہ آبادی ہونے والی تھی۔ وہ اپنے گھر کے تین خانے پہلے ہی آباد کر چکا تھا، اب چوتھے خانے کو آباد کرنے جا رہا تھا۔ یہ اس کی چوتھی شادی تھی مگر چوتھا خانہ آباد ہونے سے پیشتر ہی وہ برباد ہو چکا تھا۔ کسی نے اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

میں نے پولیس کی نوکری کے دوران میں بڑے بڑے بہت ناک مناظر دیکھے تھے، لرزہ طاری کر دینے والے بہت سے واقعات کا میں یعنی شاہد تھا مگر چوہدری فرزند علی کی لاش کے منظر نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ رات دن خطرناک مجرموں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے میں خاصا سخت دل ہو گیا تھا۔ یہ کوئی دو چار برس کا قصہ نہیں تھا بلکہ سال ہا سال سے یہ میرا معمول رہا تھا لیکن آج میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اس سے مجھے اپنے وجود میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

میں روڈ سے چوہدری فرزند علی کی حویلی کی طرف جانے والی سڑک حال ہی میں بنی تھی۔ دراصل یہ پختہ اینٹوں کا راستہ تھا.... میں روڈ سے حویلی تک فاصلہ کم و بیش ایک فرلانگ ہو گا۔ لاش کے دونوں متوازی حصوں کو میں روڈ پر عین اس مقام پر لمبائی کے رخ بچھایا گیا تھا جہاں سے حویلی کی جانب جانے والے راستے کا آغاز ہوتا تھا۔ دونوں متوازی حصے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑے گئے تھے کہ وہ ایک شہتیر کی صورت اختیار کر گئے تھے یعنی لاش کا بایاں پاؤں پختہ راستے کو چھو رہا تھا۔ اس حصے کی کھوپڑی میں روڈ کے وسط تک چلی گئی تھی، یہاں سے لاش کا دوسرا حصہ شروع ہوتا تھا۔ دایاں پاؤں کھوپڑی کے بائیں حصے کے ساتھ ملا ہوا تھا اور کھوپڑی کا دایاں حصہ سڑک کی دوسری جانب تک چلا گیا تھا۔ سڑک کے اس طرف بکاو (گنے) کے لہلاتے کھیت تھے۔

کسی زندہ انسان کو یوں اتنی صفائی کے ساتھ دو ایک جیسے حصوں میں کاٹ ڈالنا کہ

دونوں میں، سر مو فرق دکھائی نہ دے ناممکنات میں سے تھا۔ جان ہر شخص کو پیاری ہوتی ہے اور جب جان پر بن آئے تو انسان خود حفاظتی میں ہاتھ پاؤں ضرور چلاتا ہے۔ جیتے جی آسانی سے خود کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلتا بلکہ اپنی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

وہ تو چوہدری فرزند علی تھا جس کا رعب و دبدبہ آس پاس کے کئی گاؤں تک مشہور تھا مگر اس وقت ایک کیچڑے سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو ایک مکوڑے سے بھی زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا جو دو حصوں میں بٹ کر بھی حرکت کے قابل رہتا ہے۔ کوئی بڑا ہی جی دار شخص تھا جس نے جابر اور مطلق العنان چوہدری پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ بڑا دل گردے والا کام تھا۔ لاش کو پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چوہدری کے ساتھ جو بھی کارروائی کی گئی تھی وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد کی گئی تھی۔ منقسم لاش کوئی نہایت ہی پر اسرار کہانی سنارہی تھی۔ بعد میں میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

چوہدری فرزند علی کی لاش کا حشر جس برے طریقے سے خراب کیا گیا تھا وہ کسی عام قاتل کا کارنامہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لاش کی بے حرمتی سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل..... انتہائی سفاک اور شقی القلب تھا۔ ایک بات حتمی تھی کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، اپنے دل میں چوہدری کے لئے نفرت کا ایک طوفان رکھتا تھا۔ میں اس وقت اپنے گھر میں گہری نیند سو رہا تھا جب مجھے اس واقعے کی اطلاع ملی۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر تھانے پہنچا تو شبینہ ڈیوٹی والے ایک اے ایس آئی نے بتایا۔ ”ملک صاحب، بڑی سنگین واردات ہو گئی ہے۔“

جو کانشیل مجھے اطلاع دینے گیا تھا اس کی زبانی مجھے کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے سب انسپکٹر خادم حسین اور دو کانشیلوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ لاش کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ چوہدری فرزند علی کے اہل خانہ پیش پیش تھے۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی سب کو پیچھے ہٹا دیا اور بغور لاش کا جائزہ لینے لگا۔

متنول چوہدری نے موسم کی مناسبت سے کلف لگا چکن کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ کرتے کے نیچے ریشمی تہ بند تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی یا کرنے ہی والی تھی۔ عمر کو چھپانے کے لئے سر کے بالوں اور مونچھوں میں خضاب کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے بائیں

ہاتھ کی تمام انگلیاں سونے چاندی کی انگشتریوں سے بھری ہوئی تھیں جن میں بیش قیمت گینے جگمگ رہے تھے ان میں سب سے نمایاں ایک یاقت تھا جو ایک بھاری طلائی انگوٹھی میں جڑا ہوا تھا۔ مذکورہ یاقت کسی بھی طرح میں قیڑا سے کم کا نہیں تھا۔

چوہدری کا لباس بھی اس کے جسم کے ساتھ ہی دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ کرتے کے نیچے ایک سفید شلوکہ جھانک رہا تھا جس کی دائیں زیریں جیب خاصی پھولی ہوئی تھی۔ میری تلاش پر اس میں سے بڑی نوٹوں کی صورت میں ایک بھاری رقم برآمد ہوئی۔ یہ بات تعجب خیز تھی کہ قاتل نے کوئی بھی قیمتی چیز اڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی تھی کہ وہ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں تھا بلکہ اس کا یہ کارنامہ سراسر ایک انتقامی کارروائی تھی۔

شلو کے کی بالائی جانب جیب میں سے ایک تہ شدہ پرچہ بھی برآمد ہوا جس پر ایک عجیب و غریب نسخہ تحریر تھا وہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بہر حال وہ پرچہ میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ منقسم کھوپڑی کے بائیں حصے میں کھن سے تھوڑا اوپر مجھے ایک چوٹ کا نشان بھی دکھائی دیا۔ ضرب کسی آہنی چیز سے لگائی گئی تھی۔ چوٹ کی جگہ پر ایک گومڑ سا بن گیا تھا تاہم وہاں سے خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ غالباً چوہدری کو ”ٹوپس“ کرنے سے پہلے اسے چوٹ کے ذریعے دنیا و مافیہا سے بے خبر کیا تھا۔ الفاظ دیگر موت کی نیند سلا دیا تھا۔

ایک بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ چوہدری نے قیمتی کمیشن جوتے پہن رکھے تھے مگر اب اس کا دایاں پاؤں ننگا تھا، صرف بائیں پاؤں میں جوتا موجود تھا۔ اس بات سے مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے سوچا، شاید لاش کو یہاں پہنچانے میں کیس گر گرا گیا ہو گا۔ یہ کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں تھی۔

میں نے چند معتبر افراد کی موجودگی میں مشیر نامہ یعنی وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور چوہدری فرزند علی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے شہر کے اسپتال بھجوا دیا۔ چوہدری کا جواں سال بیٹا طارق محمود پوسٹ مارٹم کے حق میں نہیں تھا۔

”تھانے دار صاحب، ہم پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیں گے۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا ”اباجی کے ساتھ پہلے کیا کم ہوئی ہے۔ اب کون سی کسرتی ہے؟“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ضابطے کی کارروائی تو ہر صورت میں کرنا ہی پڑتی ہے۔“

”میں نے سارے ضابطے دیکھ رکھے ہیں پولیس والوں کے۔“ اسکے لہجے میں بدتمیزی کا

پینے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں رفیق عرف لیکھا بھی وہاں پہنچ گیا۔

وہ لگ بھگ ستائیس اٹھائیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ وہ گاؤں کا موچی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ فجر کی اذان کے ساتھ اٹھنے کا عادی تھا اور منہ اندھیرے ہی اپنے موشیوں کے چارے کے لئے گھر سے نکل جاتا تھا۔ آج جب وہ بڑی سڑک پر پہنچا تو اسے وہاں کوئی چیز پڑی دکھائی دی۔ رات خاصی تیز آندھی بھی آئی تھی۔ اس نے سوچا شاید کوئی درخت وغیرہ گر گیا ہے مگر قریب پہنچ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ وحشت زدہ انداز میں دوڑتے ہوئے واپس پلٹا اور ”لاش لاش“ چیختا ہوا گاؤں میں داخل ہو گیا۔ اس وقت تک اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ لاش چوہدری فرزند علی کی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

”تم عموماً کتنے بچے گھر سے نکلتے ہو؟“

”اذانوں کے فوراً بعد جناب!“ اس کی آواز میں خوف کی جھلک تھی۔

خادم حسین نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اوائے بندے دے پتر اذان کے بعد تو لوگ سیدھے مسجد کی طرف جاتے ہیں۔“

”میں کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتا ہوں جی۔“

میں نے پوچھا ”تم جب سڑک پر پہنچے تو کیا دیکھا تھا تم نے وہاں؟“

”کچھ نہ پوچھیں جناب“ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔ ”چوہدری صاحب بڑی بری حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ میں تو انہیں دیکھتے ہی الٹے قدموں واپس بھاگ آیا تھا۔“

”تو تم نے لاش کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ وہ چوہدری صاحب ہیں؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”اس وقت تو اچھا خاصا اندھیرا تھا۔“

اس نے سسمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ”یہ تو مجھے بعد میں بتا چلا تھا جی کہ وہ لاش چوہدری صاحب کی تھی۔ اس وقت تو مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ میں کس طرح واپس پہنچا تھا۔“

”تم نے لاش کے نزدیک کوئی غیر معمولی حرکت نہیں لوٹ کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، تم نے لاش کے آس پاس کسی کو دیکھا تھا؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے جناب!“ وہ روٹی صورت بنا کر بولا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا۔“

لیکھ موچی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ گویا اس کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے ایک دو ضمنی

عنصر نمایاں تھا۔ ”مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں تمہارے وار صاحب۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو میں چوہدری زاوے کو اس انداز گفتگو پر اس کا مزاج درست کر دیتا مگر میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے بیٹا۔ میں تمہارے باپ کے قاتل کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں مجھے جھوٹی تسلیوں کی۔“ وہ پھر کر بولا۔ ”میرے بازوؤں میں بہت طاقت ہے۔ اب وہ حرام زادہ میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گا۔“

ایک خوش لباس ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر طارق کو بازو سے تھام لیا۔ ”زیادہ جذباتی نہ ہو پتر۔ ملک ہو راں لوں اپنا کام کرنے دے۔“

”چاچا“ چٹڈ دے مینوں۔ میں اباجی دی لاش نہیں جانے دوں گا۔ مجھے پتا ہے اسپتال والے مردے کو کس طرح چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔“

”اب اور کیا چیر پھاڑ کریں گے وہ!“ ادھیڑ عمر شخص نے چوہدری کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پولیس اپنا کام کرے، ہم اپنا کام کریں گے۔“

کچھ اور لوگوں نے بھی طارق کو سمجھانا شروع کر دیا۔ بہر حال لاش کو اسپتال روانہ کرنے کے بعد میں نے موقع پر موجود کچھ لوگوں کے بیانات نوٹ کرنا شروع کئے۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی جس نے سب سے پہلے لاش کو دیکھا تھا۔ میرے استفسار پر اسی خوش پوش ادھیڑ عمر شخص نے بتایا جسے طارق چاچا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کا نام خدا بخش تھا۔ اور وہ مقتول کا دور پار کا ایک رشتے دار تھا۔ وہ بولا۔ ”ملک صاحب، لیکھا ابھی ابھی گھر گیا ہے۔ اسی نے ہمیں اس حادثے کی اطلاع دی تھی۔“

”اس کا گھر کدھر ہے؟“ خادم حسین نے پوچھا۔

چاچا خدا بخش نے کہا۔ ”لو ہاشاؤ“ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ ٹیکہ کو کھر۔ بلا لیتے ہیں۔“ پھر اس نے ایک نو عمر لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”اومے کا کا، نس کے جا اپنے ابے کو کہہ فوراً حویلی میں آ جائے۔“

اس کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا ”ملک صاحب، آپ بھی حویلی چلیں۔ باقی کی کارروائی وہیں چل کر کریں گے۔“

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں نے کانشیلوں کو وقوعہ پر چھوڑا اور خود خادم حسین کے ساتھ حویلی کا رخ کیا۔

حویلی میں ایک کھرام چا ہوا تھا۔ ہمیں بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ اندرونی کمروں سے رونے

چوہدری فرزند علی کے ظلم و ستم کی داستانیں اور عیاشیوں کے قصے مجھ سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ مجھے اس تھانے میں آتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ دو سال قبل انتقام کی آگ میں اندھے ہو کر چوہدری نے گاؤں کے ایک گھر میں آگ لگوا دی تھی۔ گھر کے کینوں کو اتنا بے بس کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکے تھے اور اندر ہی جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس گھر کے ایک فرد نے چوہدری فرزند علی کی جواں سال بیٹی خالدہ پروین کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

میں حویلی سے نکلنے سے پہلے طارق کو ایک طرف تنہائی میں لے گیا اور پوچھا ”چوہدری صاحب کی کسی سے دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟“

”دیکھیں ملک صاحب، انسان کے دوست دشمن تو ہوتے ہی ہیں۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”پر ایسا کوئی دشمن نہیں تھا جو اتنی جرات کرتا۔“

”میں نے سنا ہے،“ بونا ارائیں آج کل چوہدری صاحب سے ناراض رہنے لگا تھا؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا ”چوہدری صاحب کی چوتھی شادی.....“

میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑ دیا تھا، وہ جز بڑ ہو کر بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے جی۔ بونا“ اباجی کا بہت وفادار ہے جی۔ ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو وہ اہمیت نہیں دیتا۔“

طارق جسے چھوٹی موٹی بات سے تعبیر کر رہا تھا وہ میرے نزدیک اتنی بڑی بات تھی کہ بونا، چوہدری فرزند علی کا قتل کر سکتا تھا۔ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق مقتول چوہدری جس سولہ سالہ لڑکی سے شادی کرنے جا رہا تھا وہ بونا کی چچا زاد تھی اور خاص بات یہ تھی کہ بونا اسے پسند کرتا تھا۔ لڑکی کا نام یاسمین تھا۔ یاسمین کا باپ فتح محمد ایک غریب مزارع تھا۔ یاسمین کے والدین اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ بونا ان کی فرزندگی میں آنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر چوہدری فرزند علی کے سامنے مجبور ہو گئے تھے۔ وہ چوہدری کی مخالفت مول لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے طارق کو مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔ ”بونا حویلی میں کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا اس کو پتہ نہیں کہ چوہدری صاحب کے ساتھ کتنا بڑا حادثہ پیش آ چکا ہے؟“

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بونا کو کل سے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے، اباجی نے اسے کسی خاص کام سے کہیں بھیجا ہو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔“ میں نے ایک لمحے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”کہیں

سوالات کے بعد اسے جانے دیا۔

تقریب کے لئے آنے والے لوگوں سے حویلی بھرتی جاری تھی۔ ان میں اونچے اونچے شملوں والے کچھ افراد بھی شامل تھے جو یقیناً چوہدری فرزند علی کے عزیز واقارب تھے۔ میں مقتول چوہدری کی بیواؤں سے بھی ملاقات کا ارادہ رکھتا تھا مگر فی الحال ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا تاہم مجھے فوری طور پر جو بھی معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ یہ تھا۔

چوہدری فرزند علی کل صبح لائل پور جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ اس نے گھر میں یہی بتایا تھا کہ وہ لائل پور کے ایک زمیندار رائے بشیر احمد کھل سے ملنے جا رہا تھا۔ اسے شام کو واپس آ جانا تھا مگر نہیں آیا پھر دوسری صبح سڑک پر اس کی کئی ہوئی لاش ملی۔

میں جانتا تھا کہ چوہدری ٹائپ کے لوگ جب گھر سے نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ حاشیہ بردار بھی چلتے ہیں جس سے چوہدری کے رعب اور شان و شوکت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے خیال کی تصدیق کے لئے میں نے طارق محمود سے دریافت کیا۔

”کیا چوہدری صاحب کل گھر سے اکیلے ہی نکلے تھے؟“

وہ اب خاصی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب، وہ اکیلے نہیں گئے تھے۔ شوٹنگ گھر بھی ان کے ساتھ تھا۔“

شوٹنگ گھر کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا سیدھا نام شوکت علی تھا اور اس کا شمار چوہدری فرزند علی کے خاص آدمیوں میں ہوتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق شوٹنگ گھر اور بونا ارائیں چوہدری کے دو بازو تھے۔ انہیں ہر قسم کے جائز اور ناجائز کاموں میں چوہدری کی پشت پناہی حاصل تھی۔

مجھے شیخوپورہ کے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں چوہدری فرزند علی کے بارے میں میری رائے خراب ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنے رعب میں لینے کے لئے چوہدری راہٹ کا استعمال کیا تھا مگر ابھی تک اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”شوٹنگ گھر کہاں ہے؟“

”اس کا ابھی کچھ پتا نہیں چلا۔“ طارق نے بتایا۔ ”وہ گھر بھی نہیں پہنچا۔“

”مجھے چوہدری صاحب کی ساری بیویوں کے بیان بھی لینے ہیں۔“ میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں شام میں پھر آؤں گا۔ اس دوران میں اگر شوٹنگ گھر آ جائے تو اسے تھانے بھیج دیں۔“

ہو تا بھی کل چوہدری صاحب کے ساتھ ہی لاکل پور تو نہیں چلا گیا تھا؟

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں دوبارہ آؤں گا۔ اس دوران میں اگر کوئی خاص

بات پتہ چلے تو فوراً مجھے بتانا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم حویلی سے نکلے تو سب انسپکٹر خادم حسین نے کہا۔ ”اب کیا ارادہ ہے ملک صاحب؟“

”ذرا بوٹے کو بھی دیکھ لیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ گھر میں مل جائے اور اگر نہ ملا تو اس کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو گا۔ اس کا یوں اچانک منظر سے غائب ہو جانا تشویش ناک ہے۔“

بوٹے ارائیں کا گھر حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازہ ایک ضعیف العر شخص نے کھولا۔ اپنے سامنے پولیس کو دیکھ کر اس کی چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”بوٹا کہاں ہے؟“

”بوٹا.... کیوں.... خیریت تو ہے؟“ اس نے انک انک کر اپنی بات پوری کی۔ ”بوٹا تو گھر پر نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔

خادم حسین نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو پکڑ لیا پھر بولا۔ ”ملک صاحب، یہ بوڑھا ایسے نہیں مانے گا۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔“

”آپ زبردستی کیوں گھر میں گھس رہے ہیں؟“ بوڑھا منمنایا۔ ”ہم نے کیا قصور کیا ہے۔ آپ بوٹے پتر کو کس لئے تلاش کر رہے ہیں؟“

”اس نے چوہدری صاحب کا قتل کیا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وہ قانون سے بچ کر نہیں جاسکتا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ وہ تیز آواز میں بولا۔ ”بوٹا تو دو دن سے گاؤں میں نہیں ہے۔“

”پھر بچ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جھانک کر گلی میں دائیں بائیں دیکھا پھر راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”آپ لوگ اندر آ جائیں۔“

اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا، میں نے کہا۔ ”یہ بات تو تمہیں بھی معلوم ہو چکی

ہو گی کہ آج صبح چوہدری فرزند علی کی لاش ملی ہے۔ انہیں بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔“

”میں نے بھی ان کی لاش دیکھی ہے پر....“

”پر کیا؟“ خادم حسین نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چاچا، سیدھی طرح سب کچھ سچ بتا دے ورنہ ہمیں سختی کرنا پڑے گی۔ ہم تجھے تھانے میں بند کر دیں گے۔“

اس نے سسپی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے پوچھا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ بوٹا دو روز سے گاؤں میں نہیں ہے۔ وہ کہاں گیا ہوا ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتا اور وہ مداخلت کو پسند بھی نہیں کرتا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ خود کوئی بات مجھے بتا دے تو بتا دے ورنہ میری کیا مجال کہ اس سے پوچھ سکوں۔ میں....“

میں نے اس کی بات کٹ کر کہا۔ ”تو تمہیں کچھ پتا نہیں، وہ دو روز سے کہاں غائب ہے؟“

”وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ گیا ہوا ہے۔“ بوڑھے نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔ ”اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔ کہہ رہا تھا، چوہدری صاحب کے کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ واپسی میں چند دن لگ جائیں گے۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے اپنی رواں گی کی اطلاع مجھے دینا کیوں ضروری سمجھا مگر مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

میں نے گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے اچانک سوال کیا۔ ”یہ یاسمین کا کیا چکر ہے چاچا؟ سنا ہے، چوہدری صاحب کی اس سے شادی ہونے والی تھی؟“

”جی۔“ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب مالک ہیں، وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جہاں پہنچ گئے ہیں وہاں آدمی مزید کچھ نہیں کر سکتا، زندگی بھر کے کئے کو بھگتنا پڑتا ہے۔“

”اللہ کی مرضی ہے جی۔“ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ ایک آہ بھر کر بولا۔ ”بندہ کیا کر سکتا ہے۔“

”بندہ بہت کچھ کر سکتا ہے چاچا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جیسے بوٹے نے بہت کچھ کر دکھایا ہے۔“

شاید وہ میری بات کو سمجھ نہیں پایا تھا، الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔



خادم حسین نے آگے بڑھ کر اسے ایک ٹھڈا مارا ”اویسے کون ہو تم؟“  
میں نے دیکھا خادم حسین کے ٹھڈے کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور مجھے  
گھور رہا تھا۔ اتنی دیر میں کچھ لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔  
ایک شخص نے بتایا۔ ”پاگل ہے جی۔ اس کا دماغ کام نہیں کرتا۔“  
ایک اور آواز آئی۔ ”تھانے دار صاحب‘ اسے کچھ نہ کہیں۔ ہمارے کو اپنا ہوش نہیں ہے  
جی۔ بڑے بوہڑ کے نیچے دن رات پڑا رہتا ہے۔“

”بہت پہنچا ہوا بندہ ہے جناب!“ میرے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ ”خواہ  
مخوہ اس کی بددعا نہ لیں۔“

اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے پاؤں تک ایک لمبا سبز چولا پہن رکھا  
تھاجس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں مجھے کئی ملائیں بھی نظر آئیں۔  
وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ اس کے پاؤں غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔  
پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھیتوں کی جانب دوڑ لگادی۔

دوڑتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا رکھے تھے اور بہ آواز بلند بولتا  
چلا جا رہا تھا ”پہلے ایک..... پھر دو..... دو اور دو چار..... اللہ کی پڑے گی مار..... حق چار یار“  
حق چار یار۔“

”ملنگ بابا کی باتیں اللہ ہی جانے۔“ ایک شخص نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا پھر  
انسانہ کیا۔ ”اللہ کی شان ہے۔ پتا نہیں کس کس رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔“  
لوگ آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔ میں نے خادم حسین سے استفسار کیا۔ ”اس بابے کے  
بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”مجھے تو کوئی پاگل لگتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جاہل لوگ خواہ مخوہ مختلف کہانیاں  
گھڑ لیتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں میں ایسے بابے بہت مل جاتے ہیں۔“  
”ہوں۔“ میں نے جواباً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ہم ایک تانٹے میں بیٹھ کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے چوہدری فرزند علی کی لاش ملی  
تھی۔ وہاں پر متعین کانشیلوں کو میں نے نئی ڈیوٹی سونپ دی۔ ایک کو شوٹنگ گھر کے گھر کی  
مگرانی پر مامور کر دیا اور دوسرے کو ہدایت کی کہ وہ بوٹے ارائیں کے گھر پر نظر رکھے اور  
جیسے ہی وہ کوئی خاص بات نوٹ کریں فوراً مجھے اطلاع دیں۔ اس کے بعد میں خادم حسین  
کے ساتھ واپس تھانے آگیا۔

میں نے مزید کہا۔ ”اور اب اسے بھی اپنے کئے کو بھگتنا ہے۔ ہم بہت جلد اسے گرفتار کر  
لیں گے۔ بہت من مانی کر لی ہے اس نے چوہدری صاحب کے بل بوتے پر۔ سارا حساب  
برابر ہو چائے گا۔“

”تھانے دار صاحب‘ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ بوڑھے کا انداز خوشامدانه تھا۔  
”میرا بیٹا چوہدری صاحب کا قتل نہیں کر سکتا۔ وہ تو ان کا دایاں بازو تھا۔ بھلا بازو بھی کبھی  
اپنے وجود پر وار کر سکتا ہے۔“

”یہ محبت بڑی عجیب و غریب شے ہے چاچا“ آدی کو اندھا کر دیتی ہے۔“ میں نے ردِ لہجہ  
کو ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”محبت کی آگ میں انسان خود تو جلتا ہی رہتا ہے لیکن کبھی کبھی  
دوسروں کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔“

بوٹے کے باپ نے کہا۔ ”تھانے دار صاحب‘ بوٹا‘ یاسمین کو صرف پسند کرتا تھا۔ وہ  
اس کی خاطر اتنا سنگین قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”مجھے پتہ  
چلا ہے کہ چند روز قبل یاسمین کے معاملے پر بوٹا اور مقتول چوہدری کے درمیان خاصی تلخ  
کلامی بھی ہو چکی تھی؟“

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا تھا جو جا کر نشانے پر لگا۔  
وہ بولا۔ ”تلخ کلامی کیا ہوتا تھی جی۔ وہ تو چوہدری صاحب نے اسے اونچ نیچ سمجھائی تھی  
اور بات بوٹے کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے بعد تو سب ٹھیک ہو گیا تھا۔“  
”واقعی سب ٹھیک ہو گیا تھا۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”بوٹے نے سارا  
معاملہ فٹ کر دیا۔“

”پتا نہیں جی‘ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“  
”سب پتا چل جائے گا۔ ذرا بوٹے کا سراغ ملے دو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں  
شام میں پھر آؤں گا۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ گاؤں ہی میں رہتا۔ کیا سمجھے؟“  
”سمجھ گیا جناب‘ جو حکم سرکار کا۔“

ہم بوٹے کی گلی سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک مضبوط الحواس بوڑھا اچانک مجھ سے لپٹ  
گیا۔ بدبو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے نکرایا۔ میں نے پورے زور سے اسے دھکا دے کر  
خود سے جدا کیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے زمین پر جا گرا پھر سرخ انگارا آنکھوں سے مجھے گھورنے  
لگا۔



سب کچھ اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔“

اگرچہ فرزند علی اور زلیخا بیگم کی شادی کی مخالفت عمر بی بی کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ فرزند علی کے خاندان والوں نے بھی کی تھی مگر فرزند علی نے ہر مخالفت کا مقابلہ بڑی دھمکی سے کیا تھا۔ وہ اپنے دفاع میں دوسری شادی کا جو جواز پیش کرتا تھا وہ بڑا محسوس اور ناقابل تردید تھا۔ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی نسل آگے بڑھائے۔

زلیخا بیگم سے اوپر تلے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چار سال بعد ہی فرزند علی تیسری شادی کے لئے پر تول رہا تھا۔

”میں تو بانجھ نہیں ہوں چوہدری صاحب!“ زلیخا بیگم فرزند علی کو چوہدری صاحب کہہ کر مخاطب کرتی تھی ”شاء اللہ میری چاند سی تین بیٹیاں ہیں۔ آپ کو کس چیز کی کمی ہے؟“ ”بھلے لوگ، دھیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔“ فرزند علی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ سدا ہمارے ساتھ تو نہیں رہ سکتی نا۔ ایک دن یہ اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔“

”آپ اتنے ناامید کیوں ہوتے ہیں۔“ زلیخا بیگم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تین لڑکیاں پیدا ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب آئندہ بھی لڑکیاں ہی ہوں گی۔ اللہ خیر کرے، اگلے سال ہمارے گھر میں لڑکا بھی تو آ سکتا ہے۔“

”ہوں، کتنی تو تم ٹھیک ہی ہو۔“ فرزند علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”چلو میں ایک سال انتظار کر لیتا ہوں اور اگر اب بھی ہمارے گھر میں لڑکی۔۔۔“

زلیخا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔“ ”لیکن مجھے تو اپنی نسل چلانے کے لئے اولاد زرینہ درکار ہے۔“ فرزند علی نے بدستور

نرم لہجے میں کہا۔ ”اگلے سال بیٹا آنا چاہئے۔“ ”انشاء اللہ بیٹا ہی آئے گا۔“ زلیخا نے پرامید لہجے میں کہا۔

عمر بی بی کی یہ نسبت زلیخا سے فرزند علی کا رویہ خاصا مختلف تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ زلیخا نے اسے باپ بنا دیا تھا مگر وہ پوری طرح مطمئن اب بھی نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہوتا بھی کیسے۔ نئی سے نئی عورت تو اس کی کمزوری تھی۔ عورت کا حصول اس کے لئے کوئی مسئلہ تو تھا نہیں۔ اسکی غیر فصلی سرگرمیاں تو بارہ مہینے جاری رہتی تھیں مگر اپنی چودھراہٹ کا بھرم قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔ دوسروں کی نظروں میں خود کو معزز ثابت کرنے کے لئے یہ بات بہت اہم تھی کہ چوہدری صاحب صرف اپنی ازدواج تک ہی محدود تھے۔

عمر بی بی نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ بڑی ہونے کے ثلثے ساری حویلی کا انتظام و انصرام

میں آج صبح ہنگامی حالت میں گھر سے نکلا تھا اس لئے ناشتا بھی نہیں کر سکا تھا۔ تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ناشتا کیا پھر اے ایس آئی امانت علی کو دو سپاہیوں کے ساتھ لائل پور روانہ کر دیا۔ حویلی سے آتے وقت میں نے مقتول چوہدری کے بیٹے طارق محمود سے لائل پور کے زمیندار رائے بشیر احمد کھل کا پتہ لے لیا تھا۔ رائے صاحب سے یہ تصدیق کرنا ضروری تھی کہ چوہدری فرزند علی وہاں سے واپسی کے لئے کتنے بجے دروانہ ہوا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو خصوصی ہدایت کر دی تھی کہ وہ شام سے پہلے پہلے واپس آ جائے۔ رائے بشیر احمد لائل پور میں گھنٹہ گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔

اس کیس کی مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے مقتول چوہدری فرزند علی کا مختصر تعارف پیش کر دوں تاکہ واقعات میں تسلسل رہے اور آپ کو کوئی الجھن محسوس نہ ہو۔



چوہدری فرزند علی نے پہلی شادی عمر بی بی سے تیس سال کی عمر میں کی تھی۔ عمر بی بی کی عمر شادی کے وقت بیس سال تھی۔ اس کا تعلق ضلع جھنگ کے علاقے شاہ جیونا سے تھا۔ شادی کے بعد چھ سال تک جب عمر بی بی کی گود ہری نہ ہوئی تو فرزند علی نے اسے بانجھ قرار دے کر زلیخا بیگم سے دوسری شادی رچالی۔ عمر بی بی نے اس موقع پر بہت داویلا چھایا تھا مگر فرزند علی نے اس کی ایک نہ سنی۔

”مجھے اپنی نسل تو چلانی ہے۔“ فرزند علی نے دوسری شادی کے حق میں دلیل دی۔ ”میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ چھ سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔“

عمر بی بی نے رد ہانے لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ ابھی تک باپ نہیں بنے تو اس میں میرا کیا قصور ہے سرتاج۔ آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟“

”تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی چلنے لگی ہے عمر بی بی۔“ فرزند علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہئے کہ میں تمہاری حیثیت کو ختم نہیں کر رہا ہوں ورنہ میں اگر چاہوں تو تمہیں۔۔۔۔۔“

”نہیں سرتاج، ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔“ عمر بی بی نے فرزند علی کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کو میری پرواہ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں مگر میں آپ سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تو آپ کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ چاہے میرے ساتھ جیسا بھی رویہ روا رکھیں، میری محبت میں فرق نہیں آئے گا۔ میں یہ

اسی کے ہاتھ میں تھا۔ زلیخا کی دی ہوئی مدت گزر گئی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ لڑکا اور نہ ہی لڑکی۔ پھر ایک سال اور گزر گیا۔ یہ سال بھی خالی گیا تھا۔ زلیخا رات دن پریشان رہنے لگی تھی۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ پھر ایک رات فرزند علی نے اس کے سر پر بم پھوڑ دی دیا۔

”میں نے تمہاری بات رکھ لی۔ ایک چھوڑ دو سال تک انتظار کر لیا۔“ فرزند علی نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ”اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو۔ میں مرنے سے پہلے اپنی نسل کی بنیاد رکھ جانا چاہتا ہوں۔“

”اللہ خیر کرے“ آپ کو میری عمر بھی لگ جائے چوہدری صاحب! زلیخا نے تشویش ناک انداز میں دل تھام لیا۔ ”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

فرزند علی نے کہا۔ ”میں بیالیس سال کا ہو چکا ہوں۔ اب اور کتنا جیوں گا۔ پھر آدمی سدا جوان تھوڑا ہی رہتا ہے۔ بڑھاپا بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔“

”میں آپ کے دشمن۔“ زلیخا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور بڑھاپا تو آپ سے کوسوں دور ہے چوہدری صاحب!“

زلیخا کے معنی خیز انداز پر فرزند علی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم تو میرے دل کی ملکہ ہو۔ اتنے عرصے میں تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ عمر بی بی کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا ہوں۔ میری ساری توجہ تم پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ آنے والی بھی تمہاری نوکرانی ہی بن کر رہے گی۔“

”مجھے کسی نئی نوکرانی کا شوق نہیں ہے“ زلیخا نے میٹھی ناراضی سے کہا۔ ”حویلی میں نوکرانیوں کی کیا کمی ہے۔ میں تو آپ کی نوکرانی بن کر رہنا چاہتی ہوں۔“

فرزند علی نے اس کا دل بھلانے کی خاطر کہا۔ ”تم نوکرانی نہیں، رانی ہو۔ میرے دل پر راج کرو گی۔“

”آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں چوہدری صاحب!“ فرزند علی نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا، اس نے کہا۔ ”آپ میری زندگی میں دوسری شادی نہیں کریں گے۔“

”میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے روکھے پھیکے لہجے میں جواب دیا۔ ”تم مجھ پر بھروسہ رکھو، تمہارے لئے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

زلیخا نے بحث کو مزید نہیں بڑھایا بلکہ خامشی اختیار کر لی۔ اپنی ناراضی کا اظہار اس نے اس طریقے سے کیا کہ بچیوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ اس کے والدین ایک قریبی گاؤں میں

رہتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ چند روز ہی میں چوہدری کا دل بچیوں کے لئے تڑپے گا اور وہ اسے منا کر لے جائے گا مگر یہ اس کی بھول تھی۔

اسے میکے آئے ہوئے دس دن ہی گزرے تھے کہ اطلاع ملی کہ چوہدری فرزند علی کی حویلی میں تیسری شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ فوراً سے پیشتر حویلی پہنچ گئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ فرزند علی نے آج تک کسی کی مانی تھی جو اس کی مانتا۔

قصہ مختصر، ہاجرہ، فرزند علی کی تیسری بیوی بن کر حویلی میں آگئی۔ زلیخا کے دل پر آڑے چل رہے تھے مگر وہ بے بس تھی۔ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ

اسے اپنے گھر والوں سے کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں تھی۔ اس کے باپ نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے تانا نے چار شادیاں کی تھیں۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کو ان کے خاندان میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

عمر بی بی اور زلیخا کی بہ نسبت ہاجرہ حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھی پھر وہ عمر میں بھی ان سے چھوٹی تھی۔ فرزند علی دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا مگر قدرت کو کچھ اور

ہی منظور تھا۔ شادی کے تین سال بعد ہاجرہ کو ہیضہ ہو گیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے چل بسی۔ اس تین سالہ ازدواجی زندگی کی رفاقت کے نتیجے میں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا طارق محمود

اور اس سے ایک سال چھوٹی لڑکی خالدہ پروین۔

گویا چوہدری فرزند علی کی اولاد نرینہ کی خواہش بالآخر پوری ہو گئی۔ پھر اٹھارہ سال تک چوہدری نے شادی کا نام نہیں لیا۔ اسے اپنی نسل جاری رکھنے کے لئے ایک فرزند ارجمند مل گیا تھا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا مگر اس دوران میں بھی اس کی

”آؤٹ ڈور“ سمات جاری تھیں۔

چوہدری ٹائپ لوگوں کو اپنی دھاک قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے دُشکروں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے مخالفین کو پکیل کر ان کی ”عظمت“ کا پرچم سر بلند رکھتے ہیں۔

ایسے ہی دو دُشکرے چوہدری فرزند علی نے بھی پال رکھے تھے۔ شوکت علی عرف شوکا گجر اور یونا اراکین۔

ان دونوں بد معاشوں نے پورے علاقے میں اندھیر مچا رکھی تھی۔ میں نے جب اس تھانے کا چارج سنبھالا تو دوسرے ہی روز شوکت گجر سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا کہ ایک مسکین صورت شخص تھانے میں داخل ہوا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ کسی نے نہایت بے رحمی سے اسے مارا ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

وفا دار تھے اور اس کے پالتو غنڈوں کے سیاہ کارناموں کی پردہ پوشی کرتے رہتے تھے جس کے بدلے میں انہیں مناسب ”نذرانے“ بھی ملتے رہتے تھے۔ مجھے ہر قدم پھونک کر اٹھانا تھا۔

رمضان نامی وہ مظلوم شخص میرے کمرے سے نکل گیا تو میں نے آواز دے کر ایک کانٹیل کو اندر بلایا پھر اس سے پوچھا کہ وہ شوکنے گجر کو جانتا ہے۔  
اس نے متذبذب نظروں سے مجھے دیکھا پھر بتایا۔ ”جی ملک صاحب، شوکا یہاں کا بہت مشہور شخص ہے۔“

”اسے فوراً پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔“ میں نے حکمانہ لہجے میں کہا۔  
”خیر تو ہے ملک صاحب!“ وہ پر تشویش انداز میں بولا۔ ”کیا شوکنے نے کوئی واردات شادوات کر دی ہے؟“

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”تم سے جو کہا جا رہا ہے وہی کرو۔ میں ابھی اور اسی وقت شوکنے کو اپنے سامنے کھڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہیں سر!“ کانٹیل نے سیلوٹ مارا اور کمرے سے نکل گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ پھر میرے پاس موجود تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک کوتاہ قد شخص بھی موجود تھا۔ وہ اپنے بٹے سے کسی گینڈے کی طرح مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک ظالم، جابر اور سفاک شخص تھا۔ اپنے خلیجے کے برعکس اس وقت وہ میرے سامنے بیٹگی بلی بنا کھڑا تھا۔

کانٹیل نے ایک مرتبہ پھر سیلوٹ مارا۔ ”بندہ حاضر ہے سر۔“  
میں نے محسوس کیا کہ کانٹیل خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دی رہا تھا۔ وہ چور نظروں سے شوکنے گجر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”برآمدے میں جو شخص بیٹھا ہوا ہے اسے اندر لے آؤ۔“

وہ فریادی کو لیکر اندر آ گیا پھر دوسرے ہی لمحے واپس جانے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ شوکنے کا سامنا کرنے سے بچ رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ذہن میں موجود کالی بھیڑوں کی لسٹ میں اس کا نام درج کر لیا پھر یہ آواز بلند کہا۔ ”کانٹیل سلطان کو فوراً اندر بھیجو۔“

سلطان ایک ہٹا کٹا جلاو صورت کانٹیل تھا اور میرے تھانے کا سب سے زیادہ ”مہمان نواز“ سپاہی واقع ہوا تھا۔ وہ ”مہمانوں“ کی ”آؤ بھگت“ ایسے شاندار طریقے سے کرتا تھا کہ ان کے حلق سے برآمد ہونے والی سریلی آوازوں سے سماعت کی تسکین ہوتی تھی۔

”تھانے دار صاحب، شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ غریب آدمی کا تو جینا مشکل ہو گیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آخر ہوا کیا ہے، تمہاری یہ حالت کس نے بنائی ہے؟“  
”وہ شوکا ہے ناجی، اس نے میرے ساتھ بہت زیادتی (زیادتی) کی ہے۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں بتایا۔  
”جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟“

”ایک تو میں نے کیلے بہت سستے لگا دیئے اوپر سے پیسے بھی نہیں دے رہا تھا۔“ وہ چہرے کے زخموں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ میں نے دیکھا، اس کی دائیں آنکھ کے نیچے سے لہو رس رہا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کی مرضی کے پیسے لگا دیئے تھے حالانکہ یہ میری قیمت خرید سے بھی کم تھے، پر کیا کریں جی۔ ان غنڈوں بد معاشوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں کبھی کبھی اپنا نقصان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس سرکاری سائنڈ نے دو درجن کیلے منوں میں صاف کر دیئے اور پیسے دیئے بغیر چل دیا۔“

میں اس کے پیچھے لپکا اور پیسوں کا تقاضا کیا تو اس نے میرے ساتھ جھگڑا شروع کر دیا۔ میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا تو اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور مار مار کے میرا حشر خراب کر دیا۔ میں طاقت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے پٹا رہا۔۔۔ اور اب آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کیسے قانون کے رکھوالے ہیں کہ آپ کی موجودگی میں ان کن ٹٹے بد معاشوں نے آفت مچا رکھی ہے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ”کہاں پر کیلے بیچتے ہو؟“

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام رمضان ہے جی، آٹے والی چکی کے پاس پھل فروٹ بیچتا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔“ میں نے کہا۔  
شوکنے گجر کی زیادتیوں کی داستانیں میرے کانوں تک پہنچتی رہتی تھیں مگر ابھی تک مجھے اس پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی مناسب موقع نہیں ملا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی آئی تھی کہ اس تھانے میں کچھ کالی بھیڑیں بھی موجود تھیں جو قانون سے زیادہ چوہدری فرزند علی کے

اسی وقت چوہدری فرزند علی بہ نفس نفیس دندنا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ”ملک صاحب، بڑی کارروائیاں ڈال رہے ہیں آپ!“ وہ طفرے سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”شوٹنے نے کیا کوئی قتل میں کر دیا ہے جو آپ نے اسے پکڑ رکھا ہے؟“

مجھے اس کا اندازہ انتہائی ناگوار گزرا تھا تاہم میں نے قتل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب، ہم اپنے کام کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ خیر سے آپ سناٹیں، آپ کی تشریف آوری کس سلسلے میں ہوئی ہے؟“

وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے رعونت آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے پتا چلا تھا، آپ نے شوٹنے کو خواہ مخواہ بند کر دیا ہے۔“

”اگر ضرورت پڑی تو بند بھی کر دیں گے چوہدری صاحب!“ میں نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ہم خواہ مخواہ کچھ نہیں کرتے شوٹنے نے اس شخص کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“ میں نے رمضان کی جانب اشارہ کیا۔

چوہدری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شوٹنے سے خاموش گفتگو کی۔ وہ کینچلی بدلتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری صاحب، میں تو تھلنے دار صاحب سے کہہ بھی رہا تھا کہ رمضان چاچے کے پیسے ابھی دے دیتا ہوں۔ میں تو اس سے معافی مانگنے کو بھی تیار ہوں مگر تھلنے دار صاحب میری بات ہی نہیں سنتے۔“

شوٹنے کے چہرے پر طاری تسلیت کے تاثرات کو دیکھ کر مجھے ذرا حیرت نہیں ہوئی۔ چوہدری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جانے دیں ملک صاحب۔ میں اس شخص کا نقصان پورا کر دیتا ہوں۔ آپ شوٹنے کو چھوڑ دیں۔“

”یہ تو اب یونہی نہیں چھوڑے گا چوہدری صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اس کے خلاف قانونی کارروائی تو ہو گی۔“

وہ اپنی اسلیٹ پر اتر آیا۔ ”شوٹکا میرا بندہ ہے۔“ اس نے پتہ ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے خلاف کارروائی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔“

”مہنگی سستی کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا چوہدری صاحب۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ تھانہ ہے اور میں یہاں کا انچارج ہوں۔ آپ قانونی معاملات میں مداخلت نہ کریں تو بہتر ہے ورنہ آپ کے خلاف بھی قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔“

میرے الفاظ نے سنسنائی ہوئی گولی کا کام کیا۔ وہ پھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب، آپ کا تبادلہ بھی ہو سکتا ہے۔ میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔“

سلطان آکر شوٹنے گجر کے پیچھے کھڑا ہو گیا تو میں نے شوٹنے سے پوچھا۔ ”تم نے بہت تھر تھلی چار رکھی ہے اس علاقے میں؟“

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے نہایت ہی پرسکون لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کسی نے میرے خلاف بھڑکا دیا ہے سرکار۔ میں تو بہت سیدھا سادہ آدمی ہوں۔“

”اوسے جلیبی کی طرح سیدھے، ہم تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں“ سلطان نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”ملک صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا سیدھا سیدھا جواب دو۔“

”جتنا جی چاہے مار لیں سرکار۔“ اس کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ”ایسی ماریں بندے نے بہت کھائی ہیں۔“

میں نے گھور کر اسے دیکھا پھر رمضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رعب دار لہجے میں پوچھا۔ ”اس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ زیادتی کیوں کی؟“

”رب دی سوں (قسم) میں نے اسے کچھ نہیں کہا“ اس نے حقارت آمیز نظروں سے رمضان کو دیکھا۔ ”اس نے تو مجھے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ میں نے گریبان چھڑانے کے لئے زور لگایا تو یہ نیچے گر گیا۔“

سلطان نے پیچھے سے اسے ایک زور دار دھکا دیا مگر اس پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ میں نے غصے میں اسے ایک رولر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک تو تم اس غریب کے درجنوں کیلے ڈکار گئے، پیسے بھی نہیں دیئے لوپر سے اس کو مارا بھی۔ تمہیں شرم نہیں آتی بے بس اور لاچار لوگوں پر ظلم کرتے ہوئے۔“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”مائی باپ، میں نے پیسے دینے سے انکار تو نہیں کیا تھا۔ وہ تو میرے پاس کھلے پیسے نہیں تھے۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ شام کو دے دوں گا مگر اس نے مجھے گریبان....“

”یہ جھوٹ بولتا ہے جناب!“ اچانک رمضان نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”اس نے میرے پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔“

”پیسے تو اس کا باپ بھی دے گا چاچا!“ سلطان نے ایک زور دار ٹھڈا شوٹنے کی پٹلی پر رسید کیا۔ اس نے دانت کچکا کر تکلیف کی شدت کو برداشت کیا مگر صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ملک صاحب، اگر اجازت ہو تو مہمان کو ”ڈرائنگ روم“ میں لے جاؤں؟ تھوڑی بہت خاطر مدارات تو ہونا چاہئے اس کی۔“

جاری ہو گئے۔ ”تھانے دار صاحب“ میں غریب اور کمزور آدمی ہوں، چوہدری صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ چوہدری صاحب ان پر قہر بن کر نازل ہو جائیں گے۔“

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم فکر نہ کرو“ میں چوہدری سے نمٹ لوں گا۔ تمہارے گھر کی حفاظت کے لئے میں سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہو گا تھانے دار صاحب!“ وہ میرے قدموں میں گر کر زار و قطار رونے لگا۔ ”آپ مجھ غریب پر ترس کھائیں۔ میں چوہدری کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔“ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر میں نے شوٹنے کو نہیں چھوڑا تو ممکن ہے عدالت میں جا کر رمضان اپنے دعوے ہی سے مکر جائے۔ پھر میرے لئے مشکل ہو جائے گی اور خواہ مخواہ رمضان کی بھی شامت آ جائے گی۔ اس نے صحیح کہا تھا، قانون ساری عمر اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری کسی بھی وقت اور کسی بھی انداز سے اسے اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

ہمارے لئے اس وقت بہت مشکل ہو جاتی ہے جب مدعی ہی تعاون پر آمادہ نہ ہو۔ مجبوراً ہمیں جرائم پیشہ افراد کو چھوٹے موٹے معاملات کے لئے ڈھیل دینا پڑتی ہے اور ہم اس موقع کے انتظار میں رہتے ہیں جب وہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہو کر پوری طرح ہمارے قبضے میں آ جائے۔

میں نے رمضان کو چوہدری کے قہر و غضب سے محفوظ رکھنے کے لئے شوٹنے کو ڈھیل دینے کا فیصلہ کر لیا اور چوہدری کے پالتو کتوں کے بجائے براہ راست چوہدری فرزند علی پر ہاتھ ڈالنے کی تیاری کرنے لگا۔ مجھے اپنی منصوبے میں خاصی کامیابی حاصل ہو چکی تھی مگر اس سے پہلے کہ میں عملی قدم اٹھاتا، چوہدری فرزند علی کو اوپر والے نے اٹھالیا تھا۔



دوسرے روز میں خاصی تاخیر سے تھانے پہنچا تھا۔

گزشتہ رات میں دوبارہ حویلی میں گیا تھا اور مقتول چوہدری کی بیواؤں سے ملاقات بھی کی تھی مگر کوئی بھی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی جس کی مدد سے چوہدری کے قتل کے کیس میں کوئی پیش رفت ہوتی۔

چوہدری کی پہلی بیوی عمر بی بی تو اب اس عمر کو پہنچ چکی تھی کہ اس سے ماننا بے سود ہی ثابت ہوا تھا۔ وہ بہری ہو چکی تھی اور آنکھوں میں بھی موتیا اتر آیا تھا۔ اس کا ذہنی توازن

میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”اوپر کا معاملہ اوپر والا جانے۔ آپ کسی اور کو جا کر دھمکائیں۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں نے آپ جیسے بہت سے چوہدریوں کو نٹھ ڈالی ہے ماضی میں۔“

وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔ ”آپ جیسے کئی تھانے دار آئے اور چلے گئے۔ آپ کو چوہدری فرزند علی کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس تھانے میں رہنے کے لئے میری خوشنودی ضروری ہے۔“

”میرے اعلیٰ حکام میری کارکردگی سے مطمئن اور خوش ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آپ جیسے چوہدریوں کو میں جب میں ڈالے پھرتا ہوں۔“ اس کا غصہ ساتویں آسمان پر جا پہنچا، غرا کر بولا۔ ”شوٹنے کو چھوڑ دیں ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ میں پہلی ہی پیشی پر اسے چھڑا لوں گا۔“

”عدالت سے چھڑا سکتے ہو تو چھڑا لیتا۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”یہاں سے تو نہیں چھوٹے گا تمہارا بندہ۔“

وہ تھوڑی دیر تک خوں خوار نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں نے سلطان سے کہا۔ ”اس ڈشکرے کو ڈرائنگ روم میں لے جاؤ اور اپنے ارمان نکالنے کے بعد حوالات میں ڈال دو۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے رمضان کو بھی رخصت کر دیا۔

شام کو وہ پھر میرے پاس چلا آیا اور گڑگڑانے لگا۔ ”تھانے دار صاحب“ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ شوٹنے کو چھوڑ دیں۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔ مجھ پر رحم کریں۔“

مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”اب کیا ہوا۔ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو؟“

”کچھ نہ پوچھیں جی، آپ بس شوٹنے کو چھوڑ دیں۔ نہیں تو میں برباد ہو جاؤں گا۔“

”کون برباد کر دے گا تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”مجھے پوری بات بتاؤ۔“

وہ سخت خوف زدہ تھا اور زبان کھولنے پر تیار نہیں تھا تاہم میں نے بہلا پھسلا کر اسے اعتماد میں لیا اور سب کچھ اگوا لیا۔ اس نے بتایا۔

”چوہدری صاحب نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے شوٹنے کے خلاف رپورٹ داپس نہ لی تو وہ میری بیوی کو ننگا کر کے گلی گلی گھمائیں گے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو

بولا ہو گا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سگھ جا رہا ہے۔“  
اتنی دیر میں کسی نے آکر بتایا کہ پولیس شوٹکے گجر کو پکڑ کر حویلی کی طرف لا رہی ہے۔ میں اور طارق ایک ساتھ باہر کی جانب لپکے۔ میں نے دیکھا، شوٹکا دو سپاہیوں کے آگے آگے چلتے ہوئے حویلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ دونوں وہی سپاہی تھے جنہیں میں نے شوٹکے اور بوٹے کی نگرانی پر متعین کر رکھا تھا۔

شوٹکے کی نگرانی پر مامور سپاہی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”ملک صاحب، میں تو اسے لے کر تھانے کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے پتا چلا کہ آپ یہاں ہیں تو میں سیدھا یہیں چلا آیا۔ شوٹکا ابھی گھر آیا ہے۔“

میں نے دوسرے سپاہی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیسے نظر آ رہے ہو؟ تمہاری ڈیوٹی تو میں نے بوٹے کے گھر پر لگائی تھی۔“ اس جوان سال سپاہی کا نام جبرو تھا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”سرجی، یہ شوٹکا بہت شور مچا رہا تھا، طفیل کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔“ طفیل اس کا ٹیلیں کا نام تھا جس نے شوٹکے کو پکڑا تھا۔ ”جب یہ لوگ بوٹے کی گلی کے پاس سے گزرے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔“

شوٹکے گجر سے دوسری بار میرا آمناسامنا ہو رہا تھا مگر اس وقت مجھے شوٹکے میں وہ اکڑ اور اعتماد دکھائی نہیں دیا جو پہلی مرتبہ نظر آیا تھا۔ اسے بھی چوہدری فرزند علی کی موت کا پتا چل چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ساری اکڑ فوں غائب ہو چکی تھی۔

”شوٹکے، تم تو اباجی کے ساتھ لائل پور گئے تھے۔“ طارق نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ”پھر ان کے ساتھ یہ کیا ہو گیا۔ تم کہاں مر گئے تھے؟“

”چھوٹے چوہدری صاحب، مجھے کیا پتہ تھا ان کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آ جائے گا درنہ میں انہیں کبھی بھی اکیلا نہ چھوڑتا۔“ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ ”کاش میں چوہدری صاحب کے ساتھ ہی رہتا۔“

”تم انہیں چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟“ میں نے اس کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ دسید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں سب پتا چل چکا ہے، تم لوگ لائل پور تو گئے ہی نہیں تھے۔ رائے صاحب نے خود ہمیں بتایا ہے؟“

”ہم تو جڑانوالہ گئے تھے جناب!“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”لائل پور جانے کا تو ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا۔“

میں نے رد سے اس کے سر کو بجایا پھر درشت لہجے میں سوال کیا۔ ”جڑانوالہ کس

بھی درست نہیں رہا تھا، عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔

دوسری بیوی زلیخا پر دو سال قبل فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ وقت ضائع کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زلیخا کی تینوں بیٹیاں فضیلت، کلثوم اور رضیہ شادی شدہ تھیں اور اپنے باپ کی موت کی خبر پر آئی تھیں۔ ان میں سے چھوٹی لڑکی رضیہ کی شادی ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کی عمر بیس اکیس سال رہی ہوگی۔

میں نے طارق سے پوچھا۔ ”شوٹکے گجر کا کچھ پتا چلا ہے؟“  
جس اے ایس آئی کو میں نے لائل پور بھیجا تھا اس نے آکر بتایا تھا کہ چوہدری فرزند علی، رائے صاحب کے پاس نہیں گئے تھے بلکہ رائے بشیر احمد نے کہا تھا کہ چوہدری تو چند روز پہلے ہی اس سے مل کر گیا تھا اور اب شادی کے بعد ہی اسے دوبارہ جانا تھا۔ میں نے یہ ساری تفصیل طارق کو بھی بتا دی تھی۔

”مجھے تو انہوں نے یہی بتایا تھا جی کہ وہ لائل پور ہی جا رہے ہیں۔“ طارق نے کہا۔ ”اب شوٹکا بھی غائب ہے۔ وہی آ جاتا تو حقیقت کا کچھ پتا چلتا۔“

”تم نے صبح مجھے بتایا تھا کہ چوہدری صاحب نے رات واپس آنے کا کہا تھا؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ”جب چوہدری صاحب رات گھر نہیں پہنچے تو گھر والوں کو کوئی تشویش نہیں ہوئی؟“

”ہم نے اب ان کے بارے میں تشویش میں پڑنا چھوڑ ہی دیا تھا جی۔“ طارق نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ جب لائل پور یا خوشاب جاتے تھے تو اکثر انہیں رات بھی لگ جاتی تھی۔ پھر شوٹکا بھی ان کے ساتھ تھا اس لئے ہم مطمئن تھے لیکن....“

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بونا ارا میں تو ابھی ٹوبہ ٹیک سگھ سے واپس نہیں آیا ہو گا؟“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ”آپ کو کس نے بتایا، وہ ٹوبہ ٹیک سگھ گیا ہوا ہے؟“

”اس کے باپ نے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں صبح اس سے بھی ملا تھا۔ بونا اسے یہی بتا کر گیا تھا کہ وہ چوہدری صاحب کے کسی ضروری کام سے ٹوبہ ٹیک سگھ جا رہا ہے۔“

”اس کا باپ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں سے گیا ہے۔“ طارق نے بتایا۔ ”وہ بھی بوٹے کے لئے بہت فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ بوٹے نے اس سے ج

کام سے گئے تھے اور کس کے پاس گئے تھے؟

”وہ جی..... وہ جی۔“

”کیا وہ جی، وہ جی لگا رکھی ہے۔ مائے خان۔“ جبرو نے اس کی کمر پر ایک پر زور لات ماری۔ ”ہم کوئی تمہاری بے بے کے نوکر ہیں جو تیری راہ دیکھ رہے ہیں؟“

جبرو کی لات کھانے کے بعد وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جبرو پہلے گوجرہ کے ایک تھانے میں تھا۔ ہمارے تھانے میں وہ حال ہی میں آیا تھا۔ وہ صحت مند گبرو جوان تھا اور ہر قسم کی گالیاں اسے ازبر تھیں۔

طارق نے شوئے کی حمایت میں کہا۔ ”ملک صاحب، اندر بیٹھک میں بیٹھ کر پوچھ گچھ کر لیں۔“ میں نے محسوس کیا، اسے شوئے کی ”عزت افزائی“ پسند نہیں آئی تھی۔

اس کی بات معقول تھی۔ ہم بیٹھک میں آ گئے۔ میں اور طارق صوفوں پر بیٹھ گئے۔ جبرو نے شوئے کو کار سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کار چھوڑ کر اس کی گردن پر ایک ہاتھ جمایا پھر کہا۔ ”ملک صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا صحیح اور سیدھا جواب دو۔ میں نے تمہاری بڑی شوکر سنی ہے۔ ایک منٹ میں کوٹھپ دوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”چوہدری صاحب جڑانوالہ کس سے ملنے گئے تھے؟“

”کوئی بہت ضروری کام تھا جی۔“

”لوئے ضروری کام کے گھوڑے، بھارتیں ڈالتا ہے۔“ جبرو نے ایک زنانے دار چھپڑ اس کے گل پر رسید کیا پھر ایک تنگی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”جلدی بتا، ملک صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔“

”میں سب کے سامنے نہیں بتا سکتا جناب!“ کل کا شہ زور بد معاش آج ایک کمزور بکری کے مانند میا رہا تھا۔

وہ تو ایک رلوٹ تھا جو اپنے آقا کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ اس کا پشت پناہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساری دہشت بھی کانور ہو چکی تھی۔

”اسے تھانے لے چلیں ملک صاحب۔ سب کے سامنے بتاتے ہوئے اسے شرم آرہی ہے۔ میں بڑے ٹھیک ٹھاک طریقے سے اس کی شرم دور کر دوں گا۔“ جبرو نے کہا۔

اگرچہ چوہدری طارق محمود اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ ہم ان کے پالتو بد معاش کو تھانے لے جائیں مگر کھلم کھلا وہ ہماری مخالفت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا باپ قتل ہو چکا تھا اور قتل ہونے سے پہلے وہ گھر سے شوئے کے ساتھ نکلا تھا۔ وہ لاکل پور گئے تھے یا

جڑانوالہ یا کسی تیسری جگہ بہر حال شوئے کی ذات شک سے مبرا نہیں تھی اور یہ بات چھوٹے چوہدری نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس لئے اس نے قانونی معاملات میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

تھانے پہنچ کر میں نے شوئے کو جبرو اور سلطان کے حوالے کر دیا۔ ”یہ میری امانت ہے تم لوگوں کے پاس۔“ میں نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کل مجھے زندہ چاہئے۔ بس، اب تم جو جی چاہو اس کے ساتھ کرو، تم کو میری طرف سے اجازت ہے۔ اس کی ایسی ہاش کرو کہ جب میں صبح اس سے پوچھ گچھ کروں تو مجھے کسی سوال کے جواب کے لئے انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس کو قانون کا سارا سبق ایک ہی رات میں پڑھا ڈالو۔“

”لو کے سرا!“ دونوں نے بہ یک زبان کہا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔ ہم اس کی خوب اچھی طرح گت بنائیں گے۔ آپ جب صبح آئیں گے تو یہ ریکارڈ کی طرح بیچنے لگے گا۔“

”یہ پہلی بار ہمارا رات کا مہمان بن رہا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اس کے منجی بستر کا خاص خیال رکھنا۔“

”اچھا جناب۔ آپ مطمئن ہو کر جائیں۔“

میں شوئے کو چار کنہ مشق ہاتھوں کے حوالے کر کے گھر چلا گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے یاس نہیں کریں گے اور واقعی وہ میری توقع پر پورے اترے تھے۔

صبح جب میں تھانے پہنچا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ میرے حکم پر شوئے کو حوالات سے نکال کر فوراً پوچھ گچھ کے کمرے میں لایا گیا۔

اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ چوہدری فرزند علی کے بل بوتے پر پھنکارنے والا زہریلا سانپ ایک حقیر کیچوے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مجھ پر نظر پڑی تو میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ ”تھانے دار صاحب، ہم جڑانوالہ حکیم حیات بخش کے پاس گئے تھے۔“

میں نے تو صیغی نظروں سے سلطان اور جبرو کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کی ”محنت“ بہ زبان خود بول رہی تھی۔

”کیوں ملک صاحب، آپ مطمئن ہیں؟“ جبرو نے فخریہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ ”مال تیار ہے۔ آپ جو چاہیں، پوچھ لیں۔ یہ آپ کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے گا۔“

”اب تم لوگ بھی باہر چلے جاؤ۔“ میں نے دونوں سے کہا۔



”چوہدری صاحب مرضی کی مالک تھے جناب!“ وہ پہلو بدل کر بولا۔ ”حالاں کہ ہوئے  
نے انہیں بہت منع کیا تھا۔“

میں نے محسوس کیا کہ سیدھا بیٹھنے میں اسے دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بار بار پہلو  
بدل رہا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تم چوہدری فرزند علی کو چھوڑ کر کہیں  
چلے گئے تھے؟“

”میں اپنی بہن کے پاس ماناوالہ چلا گیا تھا جی!“ اس نے جواب دیا۔ ”میں چوہدری  
صاحب سے اجازت لے کر گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اکیلے ہی واپس چلے جائیں گے۔“  
”ہم ماناوالہ بندہ بھیج کر تمہاری بہن سے سب معلوم کر لیں گے۔“ میں نے اسے  
گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو کھال کھنچوانے کے لئے تیار رہنا۔“  
”انہوں نے مجھے بہت مارا ہے جناب!“ وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا ”آپ  
بار بار مار کا ذکر نہ کریں۔“

”اگر سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔“

وہ رونے لگا۔ ”میں سچ بول رہا ہوں جی۔ میرے ماں باپ کی توبہ جو زندگی میں کبھی  
جھوٹ بولوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”سنا ہے، چوہدری جس لڑکی سے شادی کرنے والا تھا اسے بوٹا بھی پسند  
کرتا تھا؟“

”جی ہاں جناب،“ بوٹے نے چوہدری صاحب کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ یاسمین کا خیال اپنے  
دل سے نکال دیں مگر وہ مانے ہی نہیں۔ انہوں نے جواباً یہ دلیل دی تھی۔

”بوٹے، میں چاہوں تو اس گاؤں کی کسی بھی لڑکی کے ساتھ زبردستی سب کچھ کر سکتا  
ہوں۔ تم میری قوت سے بخوبی واقف ہو مگر میں یاسمین کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں  
گا۔ میرا اس پر دل آگیا ہے، میں اس سے باقاعدہ شادی کروں گا۔“

بوٹے نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”چوہدری صاحب، میں آپ کا نمک خوار ہوں، آپ  
کے در کا کتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ آپ کے حکم پر سر دھڑکی بازی لگائی ہے۔ میں آپ کا  
پوری عمر غلام بن کر رہوں گا۔ آپ یاسمین کو بھول جائیں۔“

چوہدری نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیسے بھول جاؤں۔ یہ نہیں بھولتا۔“ اس  
نے انگشت شہادت سے مقام دل کو ٹھونکا۔ ”وہ یہاں بس گئی ہے۔ اب اسے کوئی نہیں نکال  
سکتا۔“

وہ چلے گئے تو میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا پھر شوٹکے گجر کے پاس آ کر سوال کر  
”تو تم لوگ لاکل پور نہیں گئے تھے؟“

”نہیں جی۔“

میں نے پوچھا۔ ”حکیم حیات بخش کے پاس کیا لینے گئے تھے۔“

”حکیم صاحب بہت پیچھے ہوئے طبیب ہیں جناب، مروے میں جان ڈال دیتے ہیں۔“

”اچھا“ میں نے تعجب انگیز نظروں سے اسے دیکھا پر پوچھا۔ ”تم میں سے کون مرہ  
تھا۔ چوہدری فرزند علی یا تم؟“

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے، اپنی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں  
تو اللہ کے فضل و کرم سے فٹ فاٹ ہوں جی۔ چوہدری صاحب سولہ سالہ یاسمین سے شادی  
جو کرنے والے تھے اس لئے ہم حکیم صاحب کے پاس گئے تھے۔“

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ مقتول چوہدری کے شلو کے کی جیب  
سے ایک پرچہ برآمد ہوا تھا جس پر کوئی نسخہ وغیرہ درج تھا۔ وہ پرچہ اس وقت بھی میری جیب  
ہی میں تھا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”تیس عدد صحت مند بچکے  
لیں۔ انہیں بارہ گھنٹوں کے لئے چائی کی لسی میں ڈال دیں۔ بچکے کی یہ عادت ہوتی ہے کہ  
وہ مسلسل مٹی کھاتے اور خارج کرتے رہتے ہیں۔ اپنی اس عادت کے مطابق وہ چائی کی لسی  
پیتے اور خارج کرتے رہیں گے۔ اس عمل کے دوران میں ان کے جسم میں موجود تمام مٹی  
خارج ہو جائے گی۔ نتیجے کے طور پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو  
بٹھیں گے۔ ان مردہ بچکوں کو بہت احتیاط کے ساتھ نیچوڑ کر کسی سایہ دار جگہ پر رکھ دیں۔  
جب وہ اچھی طرح خشک ہو جائیں تو پیس کر ان کا سفوف تیار کر لیں۔ اس سفوف کا سات  
پڑیا بنالیں اور روزانہ رات کو سوتے وقت سات روز تک ایک پڑیا نیم گرم دودھ کے ساتھ  
استعمال کریں۔ انشاء اللہ فائدہ ہو گا۔“

چوہدری فرزند علی کی جیب سے نکلنے والے پرچے کی حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی تھی۔  
اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ چوہدری کی عیاشیوں کو ممیز دینے میں حکیم حیات  
بخش کا بھی ہاتھ تھا۔

میں نے شوٹکے گجر سے پوچھا۔ ”تمہارا چوہدری جس لڑکی سے چوتھی شادی کرنے والا  
تھا اس کی عمر چوہدری کی سب سے جھوٹی بیٹی خالدہ پروین سے بھی ایک سال کم تھی۔ اسے  
ذرا بھی لاج نہیں آتی تھی بڑھے بارے یہ شادی کرنے کی؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے کہا ”مجھے پتا چلا ہے کہ بوٹا تمہارا جگری یار ہے؟“

”جی“ وہ میرے سوال سے گزرا گیا ”میرا مطلب ہے، وہ اپنا یار بتلی ہے۔“

”تمہیں اس سے دلی ہمدردی بھی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”اگر اس پر کوئی مصیبت آن پڑے تو تم اس کی مدد کو پہنچو گے؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”ظاہر ہے، دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔“

”چوہدری فرزند علی کے قتل میں بھی تم نے اس کا ساتھ دیا تھا؟“

”جی ہاں جناب....!“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، جلدی سے بولا ”میرا مطلب ہے جناب! بوٹے نے چوہدری صاحب کو قتل نہیں کیا۔ وہ اتنی جرات کیسے کر سکتا ہے۔“

اس کی زبان پھسل چکی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس قتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خاموشی سے اوپر ادھر ٹھٹھٹے لگا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس پر ایک نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔ جیسے ہی میں دیوار کے پاس پہنچتا، سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتا پھر فوراً پلٹ کر دوسری دیوار کی طرف چل پڑتا۔

کچھ دیر تک تو وہ مجھے پریشان نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبرز ہو گیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ اچانک پھٹ پڑا۔

”آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتے جناب! میں چوہدری صاحب کی قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

میں گھوم کر چلتے ہوئے اس کے پاس آیا پھر اپنے رولر سے اس کی ٹھوڈی کو اوپر اٹھاتے ہوئے نہایت ہی سفاک لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے، سلطان اور جبرو ابھی تھانے ہی میں ہوں گے۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر میں دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”خدا کے واسطے انہیں نہ بلائیں تھانے وار صاحب!“ وہ گلوگیر آواز میں فریاد کرنے لگا۔

”وہ بہت ظالم ہیں۔ انہوں نے بہت بری طرح مجھے مارا ہے۔“

”میرے خیال میں ابھی کسرباتی ہے۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ میں جانتا تھا کہ سلطان اور جبرو اس وقت تھانے میں نہیں ہوں گے۔ میں نے تو ایک چال چلی تھی جو کامیاب رہی تھی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں آ

”اس روز سے بوٹا بہت اداس اداس رہنے لگا۔ وہ مجھ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ رہا تھا۔ میں اس کے دل پر گزرنے والی قیامت سے بے خبر نہیں تھا مگر میں بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری صاحب سے ٹکر لینا بوٹے کے بس میں تھا اور نہ ہی میرے بس میں۔“

یا سمین کا بوڑھا باپ ایک غریب مزارع تھا۔ چوہدری کے دباؤ میں آ کر فتح محمد نے بوٹے کے، اپنے گھر میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ بوٹا بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اب اس نے حویلی آنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ زیادہ تر وہ ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔

”ڈیرے پر، کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ڈیرے کے ذکر پر میں چونک اٹھا تھا۔ ”کیا ڈیرے سے تمہاری مراد بوٹے کا گھر ہے؟“

”نہیں جناب! ڈیرا تو باغ میں ہے۔ کھیتوں کے اس پار جو آموں کا باغ ہے نا۔ وہیں ہے ڈیرا۔“

یہ میرے لئے ایک انکشاف تھا۔ جانے کیوں طارق نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے بوٹے کے گھر پر پہرا لگوا دیا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ بوٹا ڈیرے پر ہی ہو اور ٹوبہ ٹیک سنگھ والی کمائی اس نے محض دوسروں کو دھوکہ دینے کے لئے سنائی ہو۔ اس بات کے امکانات تھے کہ یا تو بوٹے نے چوہدری کا قتل کیا تھا یا کسی نہ کسی طرح اس کا اس قتل سے کوئی تعلق ضرور تھا۔ چوہدری اس کی محبوبہ کو اپنی بیوی بنانے جا رہا تھا اور اچانک قتل ہو گیا تھا۔ دوسری جانب بوٹا بھی منظر سے غائب تھا۔

میں نے شوٹکے کو مزید گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے بوٹا“

چوہدری کے سامنے بالکل ہی بے دست و پا تھا؟

”آپ کا کیا مطلب ہے جی؟“

میں نے اپنا مطلب واضح کیا۔ ”بوٹا بھی تو چوہدری فرزند علی کا پتہ صاف کر سکتا ہے۔“

اس نے ایک جھرجھری لی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے ہوئے مجھے نظر آئے۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں بھی لرزش تھی۔ ”مجھے کیا پتا جناب! میں کچھ نہیں جانتا۔“

پھر وہ مجھ سے نظریں چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے اپنے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا ”بوٹا تم سے اپنے دل کی ہر بات کہہ رہا ہے۔ تم نے مجھے یہی بتایا ہے

گیا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ بھی ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔

میں نے چھوٹے ہی رعب دار آواز میں کہا۔ ”زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں وہ اس سے پیار کرتے ہیں مگر لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم ضرور پھانسی چڑھو گے۔“

”قتل میں نے تو نہیں کیا جناب۔“

”تو پھر بوٹے نے کیا ہے؟“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے صرف ار سے تعاون کیا ہے، یاری بھائی ہے؟“

اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس نے مزید مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے اس کی بے بسی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اکثر بد معاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زرداروں کی شہ پر غنڈا گردی کرتے ہیں۔ جس کا کلا بھٹتا مضبوط ہوتا ہے وہ اتنا ہی بڑا بد معاش ہوتا ہے۔ شوٹکے کا کلا ٹوٹ چکا تھا، اس کا ڈھسے چانا لازمی بات تھی۔

میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہماری مزید ”مہمان نوازی“ سے بچنا چاہتے ہو تو سلطانی گواہ بن جاؤ۔ بوٹے کے بارے میں سب ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ میں کوشش کروں گا تمہیں عدالت سے کم سے کم سزا ہو ورنہ دوسری صورت میں تم گئے کام سے۔ میں تین سو دو کا پکا پرچہ کاٹ کر تمہیں بند کروں گا پھر پھانسی سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

اس نے بھرپور تعاون کے لئے آمادگی ظاہر کر دی۔

شوٹکے گجر رہے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ بوٹے نے رقیب روسیاہ کو اپنے راستے سے ہٹانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب شوٹکے نے اسے بتایا کہ وہ چوہدری کے ساتھ جڑا نوالہ جانے والا ہے تو بوٹے نے اس سے تعاون کی درخواست کی۔ بوٹے صرف یہ چاہتا تھا کہ واپسی میں شوٹکا چوہدری کے ساتھ نہ آئے بلکہ کوئی معقول بہانہ کر کے کہیں رک جائے۔ شوٹکے کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کی بہن مانا نوالہ میں رہتی تھی، اسے کوئی بہانہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی پھر وہ اپنے دوست کی دل سے مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور دوست نے جس قسم کا تعاون چاہا تھا اس میں شوٹکے کے لئے کوئی رسک بھی نہیں تھا۔ تاہم بوٹے نے اسے اپنے طریقہ واردات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

میں نے پوری بات سننے کے بعد حوالدار جمعہ خان کو بلا کر کہا کہ وہ شوٹکے کو لے جا کر

حوالات میں بند کر دے اور اس کے کھانے پینے کا کچھ انتظام کرے۔

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ مجھے بھوک تو لگ رہی تھی مگر اس سے بھی زیادہ ضروری کام ابھی باقی تھا۔ جمعہ خان، شوٹکے کو لے کر چلا گیا تو میں نے آموں کے باغ والے ڈیرے کا رخ کیا۔

میں تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک کانسیل بڑی بجلت میں تھانے میں داخل ہوا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے میرے پاس آیا پھر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ”ملک صاحب، ادھر کلا کے کھیت میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ کسی نے بوٹے ارا میں کو قتل کر کے وہاں پھینک دیا ہے۔“



میں تو چکرا کر رہ گیا تھا۔

بڑی مشکل سے ایک سرا ہاتھ لگا تھا۔ میرا خیال تھا، میں نے چوہدری فرزند علی کے قتل کا معاملہ کر لیا ہے۔ مگر بوٹے ارا میں کی موت نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ تفتیش کی گاڑی کو بریک لگ گئے تھے اور میں جیسے بند گلی میں کھڑا تھا۔

کانسیل کی اطلاع پر میں نے حوالدار جمعہ خان کو ساتھ لیا اور فوراً موقع پر پہنچ گیا۔ بوٹے کی لاش گنے کے کھیت کے عین وسط میں پڑی تھی۔ اس کی لاش کے ساتھ بھی کم و بیش چوہدری کی لاش جیسا حشر کیا گیا تھا۔ لاش کو ناف کے مقام سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کی کپٹی کے اوپر ایک نیلگوں ابھار واضح نظر آ رہا تھا۔ بوٹے کی لاش کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ دونوں قتل کسی ایک ہی شخص نے کئے تھے اور وہ نامعلوم شخص اپنے دل میں بوٹے اور چوہدری کے لئے بے پناہ نفرت رکھتا تھا۔

ممکن تھا ابھی کچھ روز تک بوٹے کی لاش دریافت نہ ہوتی اگر گنے کی کٹائی شروع نہ ہو چکی ہوتی۔ وقوعہ پر اچھے خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بوٹے کا بوڑھا باپ بھی وہاں موجود تھا اور ایک طرف بیٹھا اپنے بیٹے کی لاش پر آنسو بہا رہا تھا۔

میں نے ضروری قانونی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ایک شریف صورت معمر شخص سے دریافت کیا۔ ”بزرگو، لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی تھی؟“

ایک کھیت مزدور آگے بڑھ آیا۔ اس کے جسم پر ایک بوسیدہ تہ بند کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں درانی تھی۔ اس نے بتایا۔ ”تھانے دار صاحب، میں آج تڑکے (علی الصبح) ہی کلا کی واڈی (کٹائی) کے لئے آ گیا تھا۔ دوپہر تک میں نے اچھا خاصا کام نمٹا دیا تھا۔

اچانک ایک طرف سے مانوس سی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ کوئی اونچے سروں میں گا رہا تھا۔ ”محمد بوٹیا“ بوٹے واپٹ بوٹا۔ تے بوٹا رہے نہ کوئی جہان اندر“ (محمد بوٹا کو مخاطب کر کے کہا جا رہا تھا کہ اے بوٹے، تو ہر بوٹے کو جڑ سے اکھاڑ دے یہاں تک کہ دنیا میں کوئی بوٹا باقی نہ رہے۔ بوٹا بہ معنی درخت)

میں یاد کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ آدم قد گئے کے پودوں کے اندر سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ وہی ملنگ بابا تھا جس سے ایک مرتبہ پہلے بھی میری مڈھ بھیڑ ہو چکی تھی۔

مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔ میں نے خوالدار جمعہ خان سے کہا۔ ”جاؤ، اس ملنگ کو پکڑ کر لے آؤ۔“

جمعہ خان کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر اس نے عجیب سے انداز میں تقبہ لگایا پھر بہ آواز بلند کہنے لگا ”پہلے ایک..... پھر دو..... دو اور دو چاہ..... اللہ کی پڑے گی مار..... حق چار یار، حق چار یار۔“

اس سے پہلے کہ جمعہ خان ملنگ تک پہنچتا، وہ لہلہاتے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کی تلاشی کی بعد جمعہ خان واپس آگیا۔

”عجیب چھلاوہ ہے نامراد۔“ جمعہ خان نے فحالت آمیز لہجے میں کہا۔ ”کچھ بتا نہیں چلا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔“

”بیچ کے کہاں جائے گا۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”اس کی ملنگی بھی نکالنا ہی پڑے گی۔“

”توبہ کریں تھانے دار صاحب۔“ ایک شخص نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ”وہ بہت کرنی والا ہے۔ ایسے لوگوں سے نہیں الجھنا چاہئے۔“

”بس بس بابا، زیادہ کہپ نہ ڈال۔“ میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔ ”ایسے بہت سے کرنی والے میں نے دیکھے ہیں۔“

میں نے اس شخص کو دانستہ جھاڑ پلائی تھی ورنہ ملنگ بابا مجھے بھی بہت پر اسرار لگا تھا۔ اس کی باتیں بڑی معنی خیز تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا جیسے وہ مجھے کچھ اشارہ دے رہا ہو۔

ضروری قانونی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے بوٹے کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی پھر خوالدار جمعہ خان کو ہدایت کی کہ وہ دو سادہ لباس پولیس والوں کی ڈیوٹی لگا دے کہ وہ جلد از جلد اس پر اسرار ملنگ کو پکڑ کر تھانے لے آئیں۔

میں اپنے کام میں مگن تھا کہ مجھے اچانک انسانی جسم کلو کے اندر کچھ فاصلے پر پڑا دکھائی دیا۔“ وہ خوف زدہ نظروں سے بوٹے کی لاش کو دیکھنے لگا۔

”خیر دین، تم نے لاش کو ہاتھ نہیں لگایا؟“ میں نے پوچھا۔ اس شخص کا نام مجھے خیر دین معلوم ہوا تھا۔

”نہیں جی!“ اس نے کہا ”میں تو لاش دیکھتے ہی چیختا ہوا کھیت سے باہر نکل آیا تھا۔“ ”لگتا ہے ہمارے گاؤں پر بدروحوں نے قبضہ کر لیا ہے“ ایک طرف سے کسی کی آواز آئی ”ہمیں یہاں رہتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے مگر ایسے واقعات پہلے کبھی پیش نہیں آئے تھے۔“

”یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔“ ”ظالموں دے ظلم دے اخیر ہوندی تھاہ۔“ ایک شخص نے باندیدہ نظروں سے بوٹے کی لاش کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا جی۔ اوپر والے کی لاشی بے آواز ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ ان دونوں نے آفت بھی تو بہت مچا رکھی تھی۔“

”اوئے زبان سنبھال کے بات کر ہرن مینار دے پتر!“ ایک تومند شخص نے آگے بڑھ کر اس آدمی کو گریبان سے پکڑ لیا جس نے ابھی ابھی بوٹے کی لاش پر تبصرہ کیا تھا۔ ”اوئے تم چوہدری صاحب کو ظالم کہتے ہو۔“

”نہ لڑو پتر“ ایک بزرگ نے ان کے بیچ میں آتے ہوئے کہا۔ ”چھڈ دے اصغر نوں۔“ اس شخص کا نام اصغر تھا جسے چوہدری کے کیم تحیم پٹو نے ہرن مینار کا پتر کہہ کر مخاطب کیا تھا، غالباً اس کے دراز قد کی وجہ سے۔

چوہدری کے پیچھے نے اصغر کو ایک زور دار دھکا دیا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”بند کر دے یہ دنگا فساد ورنہ میں دونوں کو بند کر دوں گا۔“

جمعہ خان نے بٹے کئے شخص کو ایک جھانپڑا رسید کیا تو اس نے اصغر کا گریبان چھوڑ دیا۔ جمعہ خان نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”اوئے قانون کے سامنے بھی بد معاشی سے باز نہیں آتے ہو۔“

”صاحب جی، ہم چوہدری صاحب کے نمک خوار ہیں۔ یہ بد بخت انہیں ظالم....“ ”اوئے چپ کر کے کھڑا ہو جا۔ زیادہ بک بک نہ کر۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”ورنہ میںیں چھترول شروع کر دوں گا۔“

والہی میں ہمیں معلوم ہوا کہ چوہدری فرزند علی کی لاش اسپتال سے آچکی تھی اور آج ہی تدفین کا پروگرام تھا۔

حویلی کے پاس مقتول چوہدری کے بیٹے طارق محمود سے ملاقات ہو گئی۔ وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”ملک صاحب‘ مجھے پتا چلا چکا ہے‘ آپ نے شوٹنے کو مار مار کر اس کا لمبہ نکل دیا ہے۔“

مجھے اس کی تازہ ترین معلومات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میں پہلے پتا چکا ہوں کہ اس تھانے میں چوہدریوں کے کچھ وفادار بھی موجود تھے اور میں غریب ان کے خلاف سخت قسم کی قانونی کارروائی کرنے والا تھا۔ وہ سب میری نظروں میں آچکے تھے اور میں کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔

”اگر ہم مجرموں کا لمبہ نہ نکالیں تو ہمیں چین نہیں آتا۔“ میں نے رد کھے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے باپ کے قاتلوں کا پتا چل چکا ہے مگر۔۔۔“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اوصورا جھوڑ دیا۔ حالانکہ میرا تجزیہ اس کے برعکس تھا۔

”مگر کیا؟“ وہ مضطرب انداز میں بولا۔ ”کون ہے قاتل اباجی کا؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارا قانون اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ قانون قدرت کا نشانہ بن چکا ہے۔“ میں نے اس کے تاثرات جاننے کے لئے ایک چال چلی۔

وہ جلدی سے بولا ”آپ کا اشارہ بوٹے ارائیں کی طرف تو نہیں ہے؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے دانستہ تائید کی۔ میں اپنے خیالات سے اسے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ بوٹے ہی نے اباجی کو قتل کیا تھا؟“

”شوٹنے نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر قاتل ہماری پہنچ سے اتنی دور نکل چکا ہے کہ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔“

طارق نے اچھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”ملک صاحب‘ اگر اباجی کو بوٹے نے قتل کیا ہے تو پھر بوٹے کا قتل کس نے کیا ہے۔ میں نے خود بوٹے کی لاش دیکھی ہے۔ آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی میں حویلی آیا تھا۔ بوٹے کو بھی اباجی کی طرح بڑی بے دردی سے کاٹا گیا ہے۔“

میرا مقصد پورا ہو گیا۔ ”اس سلسلے میں ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“ میں

نے سنجیدہ نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے‘ قتل کی یہ دونوں وارداتیں کسی ایک ہی شخص نے کی ہیں اور اس شخص تک پہنچنے میں تم ہماری مدد کر سکتے ہو۔“ اب میں مطمئن تھا۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ بوٹے کی لاش دیکھنے گیا تھا یا نہیں۔ یہ بات میں اس سے براہ راست بھی پوچھ سکتا تھا مگر میں نے جو کچھ سوچ رکھا تھا‘ یہ سب اس کا حصہ تھا۔

اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میری بات اس کے پلے نہ پڑی ہو۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم کل تھانے آ جاؤ پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ پھر میں وہاں سے چلا آیا۔



ملک بابا تو ایسے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس کی تلاش پر مامور دونوں سادہ لباس کانشیلوں نے رپورٹ پیش کی تھی کہ وہ پورے علاقے کو چھان چکے ہیں مگر اس مخبوط الحواس بڑھے ملک کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

طارق محمود سے ملاقات بھی سود مند ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے باپ اور بوٹے ارائیں کے کسی ایسے مشترکہ دشمن کی نشان دہی کر دے گا جس پر ”محنت“ کر کے ہمارا کام بن جائے گا مگر اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔

اب لے دے کے صرف ایک شوٹکا گھر ہی رہ جاتا تھا۔ اسے ہم نے اتنا دھو دیا تھا کہ اس سے غلط بیانی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر بعض اوقات حالات ہماری توقع کے برعکس بھی پیش آ جاتے ہیں۔ میں اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ممکن ہے‘ شوٹنے ہی نے یہ دونوں قتل کئے ہوں۔

میں نے دوسرے روز شوٹنے کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔

پانچ روز تک رات دن شوٹنے کی بھرپور ٹھکانی ہوتی رہی۔ ہم نے مختلف قسم کے نفسیاتی حربے بھی استعمال کئے۔ اس دوران میں اس نے بہت سی چوریوں‘ ڈکیتوں اور دیگر جھوٹی موٹی وارداتوں کا اقبال کر لیا مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

چھٹے روز میں اس کیس سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے رات کو ٹھیک طرح سے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ابھی تک نہ تو قاتل کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ ہی آلہ قتل کی نوعیت کا کوئی تعین ہو سکا تھا۔ مجھے اپنی پوری پیشہ ورانہ زندگی میں اس قسم کے قتل سے واسطہ



انتخاب کیا پھر خادم حسین کو ضروری ہدایات دینے کے بعد چار سپاہیوں کی مختصر پولیس پارٹی لے کر چھانوں کے آرے کی جانب روانہ ہو گیا۔

گل زمان خان حوالات کے ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے ایک بھی طمانچہ کھائے بغیر بڑے فخر سے چوہدری فرزند علی اور بوٹے ارائیں کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ میں نے اتنی شرافت سے اور خوشی خوشی اقبال جرم کرنے والا پہلا قاتل دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پشیمانی یا پریشانی کے تاثرات دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی جگہ ایک مستقل حسرت نے ڈیرا بنا رکھا تھا۔ یہ حسرت تھی شوکے گجر کے اس کے ہاتھوں بچ جانے کی۔ اگر شوکا پولیس کسٹڈی میں نہ ہوتا تو گل زمان خان کب کا اس کا بھی قصہ تمام کر کے علاقہ غیر کی طرف روانہ ہو چکا ہوتا۔

تین افراد اس کے مجرم تھے۔ دو کو وہ اپنے انتقام کا نشانہ بنا چکا تھا، تیسرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہی وہ تینوں افراد تھے جنہوں نے دو سال قبل اس کے ہنسنے مسکراتے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔ چوہدری فرزند علی کے ایما پر اس کے ”بازوؤں“ نے گل زمان خان کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ اس کا معذور باپ اور بوڑھی ماں آگ کا ایندھن بن گئے تھے۔ انہیں بے بس کر کے باندھ دیا گیا تھا۔ گل زمان خان اس لئے زندہ بچ گیا تھا کہ وہ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔

گل زمان اس وقت صرف آٹھ سال کا تھا جب اس کا باپ خاندانی دشمنی کی بنا پر اپنا ملک چھوڑ کر شیخوپورہ کے اس گاؤں میں آسا تھا۔ لشکر خان کی ایک ٹانگ دشمنی کی نذر ہو گئی تھی اور وہ بیساکھی کے سہارے چلتا پھرتا تھا۔ وہ یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا گھر چلانے لگا۔

گل زمان کچھ بڑا ہوا تو اس نے بھی لشکر خان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ پھر جب اس نے بیسویں سال میں قدم رکھا تو کوئی اسے اچھا لگنے لگا۔ وہ چوہدری فرزند علی کی چھوٹی بیٹی خالدہ پروین کو چپکے چپکے دیکھنے لگا۔ وہ چوہدری کے قدر غضب سے ڈرتا بھی تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے تھے مگر دل نے کبھی کسی کی مانی ہے؟ دل اسے یقین دلاتا رہتا تھا کہ خالدہ ایک دن اس کی ہو جائے گی۔

یہ ایک طرفہ محبت جاری ہی تھی کہ چوہدری کو اس کی خبر ہو گئی۔ گل زمان سے غلطی یہ ہو گئی کہ اس نے کچھ دوستوں سے بھی اپنی چاہت کا ذکر کر دیا تھا۔ کسی دوست نام دشمن نے اس کی محبت کی کہانی کو چوہدری تک پہنچا دیا تھا۔ چوہدری یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔

”باہر میدان میں کھیل رہا ہو گا۔“ اس نے جواب دیا پھر پر تشویش لہجے میں پوچھا۔ ”سرکار خیر تو ہے نا۔ اپنے بالے کی آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی؟“

میں نے کیشن جوتا سے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”بالا یہ جوتا گھر سے باندھ کلا کھیلنے لے گیا تھا۔ مجھے اس جوتے کا دوسرا پاؤں چاہئے۔“

”ہم اتنا قیمتی جوتا کہاں پہن سکتے ہیں جناب!“ وہ جوتے کو ایک نظر دیکھتے ہی پہچان گیا تھا ”یہ تو بس اتفاق ہی سے ہمارے گھر آ گیا تھا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا فضل دینا؟“

”ملک صاحب، کیا بتاؤں جی۔ ہمارے ملک میں بے ایمانی اس قدر بڑھتی جا رہی ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ اتفاق سے یہ جوتا تمہارے گھر پہنچ گیا ہے؟“

”میں وہی بتا رہا ہوں جی!“ اس نے جواب دیا۔ ”پہلے تو بورے (لکڑی کا براہ) میں سے لکڑی کے ڈوکے (ٹکڑے) وغیرہ نکل آتے تھے اب تو جوتے برآمد ہونے لگے ہیں۔“ میرے استفسار پر اس نے تفصیل بیان کی کہ اس کے گھر میں بورے کی اچھی سی جلائی جاتی تھی جس کے لئے وہ آرا مشین سے بورے کی بوری لایا کرتا تھا اور۔۔۔۔۔ کیشن جوتے کا وہ پاؤں بورے کی بوری ہی میں سے نکلا تھا۔

آرا مشین کا ذکر سن کر میرے ذہن میں ہزاروں گھنٹاں ایک ساتھ بچنے لگیں۔ میری نگاہوں کی سامنے چوہدری فرزند علی اور بوٹا ارائیں کی بڑی صفائی سے کالی ہوئی لاشیں گھومنے لگیں۔ ان لاشوں کے ساتھ جو فن کاری کی گئی تھی وہ کسی آرا مشین پر ہی ممکن تھی جہاں دیویدیکل شہتیر بھی پلک جھپکتے میں دو نیم ہو جاتے تھے۔

سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں میرے ذہن میں سینکڑوں سوالات پیدا ہو چکے تھے جن کے جوابات آرا مشین پر ہی جا کر مل سکتے تھے۔ میں نے چاچے ججے سے پوچھا۔ ”تم کون سے آرا مشین سے بورا لاتے ہو؟“

اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ”چھانوں کے آرے سے جناب۔ وہ جو بڑی مسجد کے پاس ہی ہے۔“

اب میں وہاں رک کر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں فوراً تھانے پہنچا۔ سب انسپکٹر خادم حسین ڈیوٹی پر موجود تھا۔ میں نے ذرا جی دار قسم کے قابل اعتماد چار کانسٹیبلوں کا



پھر جو قیامت لشکر خان کے گھر ٹوٹی اسے پورے گاؤں نے دیکھا۔ یہ دو سال پہلے کا تھا۔

بوٹا ارائیں اور شوکا گجر ایک روز سر شام لشکر خان کے گھر میں جا گئے۔ بوٹے معذور لشکر کو دھکا دے کر ایک جانب گرایا پھر دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے خوار لمبے میں پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ حرام زادہ عاشق کا بچہ؟“

”تم کس کو پوچھتا ہے؟“ گل زمان کی والدہ صابری نے کہا۔ شوکے نے لشکر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”اس کتے کا بچہ اور کون؟“

لشکر خان اور صابری کو بیٹے کے عشق کا کچھ پتا نہیں تھا۔ انہوں نے سمجھا شاید زمان نے کوئی جھگڑا وغیرہ کر لیا ہے۔ لشکر خان نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ”م بتاؤ بات کیا ہے؟“

”اوائے لنگڑے سور“ ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے نہیں آئے۔ تمہارے کی لاش گرانے آئے ہیں۔“ بوٹے نے گرج کر کہا۔ ”اس کینے کی یہ مجال کہ چوہر صاحب کی عزت پر ہاتھ ڈالے۔“

پھر وہ دندناتے ہوئے پورے گھر کی تلاشی لینے لگے مگر انہیں گل زمان نہیں ملا۔ انہوں نے گھر کا مختصر سلمان الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ لشکر بے بسی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے اسے کہاں چھپایا ہے؟“ شوکے نے لشکر کے منہ پر ایک تھپڑ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

صابری دوڑ کر اپنے شوہر سے لپٹ گئی۔ ”نہ مارو اس کو۔ گل زمان ایدھر نہیں آئے۔ پھر کدھر ہے وہ؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”ام کو کچھ مالوم نہیں۔“ ”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ شوکے نے ایک دخیانہ قہقہہ لگاتے ہوئے صابری کو با سے پکڑ کر اندرونی کمرے کی جانب گھسیٹا۔

لشکر اس کے پیچھے لپکا ”چھوڑو اس کو خانہ خراب کا بچہ۔“ بوٹے نے پاؤں کی ایک زور دار ٹھوک اس کی بیساکھی پر رسید کی۔ بیساکھی دور جا گئی اور لشکر منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ اتنی دیر میں شوکا، صابری کو کمرے کے اندر لے جا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے بوٹا، لشکر کو بھی گھسیٹ کر اندر لے گیا پھر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

اس پردوس والوں کو اس واقعے کی یا تو خبر ہی نہیں ہوئی تھی یا جان بوجھ کر ان جان بن گئے تھے۔ کسی نے بھی آکر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

بوٹے اور شوکے نے مل کر لشکر خان کو ایک چوٹی ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ بے چارہ معذور شخص کہاں تک مزاحمت کر سکتا تھا۔ دو ڈشکوں کے ہاتھوں میں وہ بے بس تھا۔ ”ہم آخری بار پوچھ رہے ہیں، بتا دو گل زمان کہاں ہے؟“

”خدا قسم، ام نے جھوٹ نہیں بولا۔ ام کو کچھ مالوم نہیں۔ ام تو....“ ”یہ بڑھا ایسے نہیں مانے گا بوٹے۔“ شوکے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تو اپنا کھیل شروع کر۔“

بوٹے نے ہوس ناک نظروں سے صابری کو دیکھا پھر شوکے سے کہا۔ ”آ تو بھی میری مدد کر۔“

دونوں نے صابری کو ایک چارپائی پر باندھ دیا۔ صابری نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے مگر ان دو وحشیوں کے سامنے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس کا لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔

صابری کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شوکے نے صابری کے دہپے کو پھاڑ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا پھر ایک ایک ٹکڑا دونوں میاں بیوی کے منہ پر خوب اچھی طرح کس کر باندھ دیا۔

”اب ہم پوری رات تمہارے عاشق پتر کا انتظار کریں گے۔“ بوٹے نے لشکر کے سامنے جا کر کہا۔ ”صرف سوکھا انتظار ہی نہیں بلکہ موج میلا بھی کریں گے۔“ اس نے ایک آنکھ دبا کر شوکے کو اشارہ کیا۔ ”چل بھئی جوان، پہلی باری تیری ہے۔“

پھر وہ پوری رات باری باری صابری کو پامال کرتے رہے۔ لشکر خان کا منہ بند تھا مگر آنکھیں تو کھلی تھیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے اپنی عزت کے خزانے کو لٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے پاس بھی ایک عزت تو بچی تھی۔ سال و دولت تو وہ پہلے ہی اپنے ملک میں چھوڑ آیا تھا اور اب..... اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سچے دل سے موت کی دعا کرنے لگا۔

صبح اس کی دعا قبول ہو گئی۔ گل زمان کو آنا تھا نہ آیا۔ بوٹے اور شوکے نے اجالا ہونے سے پہلے پورے کمرے میں مٹی کا تیل چھڑکا، دونوں میاں بیوی پر خصوصاً تیل کی زیادہ مقدار ڈالی پھر کمرے سے نکلنے

سے پہلے انہوں نے دونوں کو آگ لگا دی۔ جب شعلے اچھی طرح بھڑک اٹھے تو وہ در باہر سے بند کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے چوہدری کو جا کر یہی رپورٹ تھی کہ وہ تینوں کا کام تمام کر کے آئے ہیں۔ اب اس خاندان کا کوئی فرد چوہدری صاحب بیٹی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہا۔ وہ چوہدری کے سامنے اپنی ناکار اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے باہمی رضامندی سے یہی فیصلہ کیا کہ بعد گل زمان کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے مگر تلاش بسیار کے بعد بھی جب وہ ان کے ہاتھ نہیں تو کچھ عرصے کے بعد وہ اسے بھول بھال گئے۔

مکان اپنے کینوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا۔ سب نے یہی سمجھا کہ تین افراد کنبہ نیست و نابود ہو چکا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ گل زمان خان انتقام کی آہ عجیب داستان رقم کرنے کے لئے زندہ رہ گیا تھا۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے شوئے ٹھکانے کے بعد معلوم ہوئی تھیں۔ گل زمان کی گرفتاری کے بعد تو شوئے نے ان جرائم کا اقرار کر لیا تھا جو ابھی تک سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔

گل زمان کو جب معلوم ہوا کہ چوہدری فرزند علی کے بندے اس کی تلاش میں اس گھر کی طرف گئے ہیں تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا، وہ یہ رات گاؤں سے باہر گزار لے تو اچھا ہے۔ وہ پوری رات گاؤں کے باہر گندم کے کھیتوں میں چھپا بیٹھا رہا۔ جب اس نے گھر جانے کا ارادہ کیا تو اچانک اس کی ملاقات ملنگ بابا سے ہو گئی۔ وہ بتا نہیں کہاں سے نمودار ہو گیا تھا۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح گل زمان بھی ملنگ بابا کو دلا اللہ سمجھتا تھا۔

”بھاگ جا.....“ ملنگ نے گل زمان سے کہا۔ ”اب کچھ باقی نہیں بچا“ سب جل کر راکھ ہو گیا۔ وہ تجھے بھی ختم کر دیں گے۔ اپنی جان بچا اور کہیں دور نکل جا۔ تجھے بھی مار ملے گا۔ بس انتظار کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بھر ملنگ نے اسے جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔ وہ ڈیڑھ سال تک مختلف شہروں میں گھومتا رہا۔ در در کی خاک چھانتا رہا۔ مانگ نے اس کے ماں باپ کے ساتھ پیش آنے والے ایسے کی تفصیل اسے بتا دی تھی اور کچھ خصوصی ہدایت بھی دی تھی۔ وہ اپنی دل میں انتقام کی آگ کو روشن کئے ملنگ کی ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ اس دوران میں اس نے اپنا حلیہ بھی تبدیل کر لیا تھا۔ اس نے واڑھی رکھ لی تھی اور سر کے بال بھی بڑھا لئے تھے۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے کے دوران میں وہ اس

قدر بدل چکا تھا کہ کوئی شناسا اسے ایک نظر دیکھ کر پہچان نہیں سکتا تھا۔ چھ ماہ قبل وہ اس علاقے میں دوبارہ نمودار ہوا۔ اس نے مسجد والی آرا مشین پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس آرا مشین کا مالک ایک پٹھان تھا۔ اسے نوکری حاصل کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ یہاں کام کرتے ہوئے اپنے دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہ سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بوئے ارا میں کو شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے باغ والے ڈیرے کی نگرانی شروع کر دی۔ اس نے اس عرصے میں ایک ریوالور بھی خرید لیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ ایک ایک کو گھیر کر گولی مارنے کا تھا مگر جب سے اس نے آرا مشین پر ملازمت کی تھی، اس کے ذہن میں اور ہی منصوبہ کپکنے لگا تھا۔

گل زمان نے جس رات بوئے پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا یہ وہی رات تھی جب بوٹا، لاری اڑے سے بوڑھے چوہدری فرزند علی کو شکار کر کے ڈیرے پر لایا تھا۔ گل زمان جب ڈیرے پر پہنچا تو اسے ایک کے بجائے دو شکار مل گئے۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ آرے کی گھوڑا گاڑی پر وہاں پہنچا تھا۔ یہ گاڑی لکڑیاں ڈھونے کے کام آتی تھی۔ گاڑی کو اس نے ڈیرے سے کافی فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیا تھا۔

ریوالور کے بل بوتے پر گل زمان نے بوئے کو بے بس کر دیا۔ چوہدری پہلے ہی بے ہوش پڑا تھا۔ جانے بوئے نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ گل زمان نے بوئے کی کپٹی پر ریوالور کی نال رکھ کر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ چوہدری کو اس نے کندھے پر ڈالا اور بوئے کو ہانکتے ہوئے گھوڑا گاڑی تک لے آیا۔

گھوڑا گاڑی کے نزدیک پہنچ کر بوئے نے چالاک دیکھانے کی کوشش کی مگر گل زمان اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے ریوالور کا دستہ بوئے کی کپٹی پر رسید کیا تو وہ تیوراً زمین بوس ہو گیا۔ گل زمان نے بڑی مہارت کے ساتھ دونوں کو گاڑی میں رکھی ہوئی لکڑیوں کے نیچے چھپا دیا اور آرا مشین کی جانب روانہ ہو گیا۔

آرا مشین کے مالک نے اسے وہیں پر رہائش کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ اس میں اس کا فائدہ بھی تھا۔ گل زمان رات کو دیر تک کام کرتا تھا۔ اس طرح مالک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا۔ آرا مشین ہال نما کمرے کے وسط میں نصب تھی۔ کمرے کے باہر احاطے میں شہتیروں اور چھوٹی بڑی لکڑیوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر گل زمان نے اپنے بے ہوش دشمنوں کا جائزہ لیا۔ انہیں ہلا جلا کر دیکھا، جھنجھوڑا بھی نمران میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے

میں ڈال دیا۔ ایک مرتبہ پھر وہ اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں کہیں جا رہا تھا۔

خون آلود کپڑوں اور برادے والی بوری کو اس نے سربرد کرنے کے بعد اپنے ”انتقام یانہ“ دشمنوں سے نجات حاصل کی اور واپس لوٹ آیا۔

یہ تمام تفصیلات گل زمان نے اقبال جرم کرنے کے بعد مجھے سنائی تھیں جس میں سے غیر ضروری باتیں حذف کر کے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہیں۔ جب وہ آرا مشین کے نیچے واقع کھانچے میں مصروف کار تھا، اسی دوران چوہدری فرزند علی کا دایاں جوتا وہاں موجود برادے میں کہیں دب دیا گیا تھا جو بعد میں مجھے کہمار کے گھر پہنچ گیا تھا۔

جوتے کا ایک پاؤں کسی کام کا نہیں ہوتا۔ مجھے نے وہ جوتا پھینکنے کی غرض سے اپنے بیٹے بالے کو دیا۔ بالے نے پھینکنے کے بجائے اسے اپنی تفریح کا حصہ بنا لیا تھا۔

گل زمان کے لئے میرے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا مگر ظاہر ہے، میں اسے جھوٹ تو نہیں سکتا تھا۔ وہ قاتل تھا، اس نے دو انسانوں کی جان لی تھی۔ اگرچہ وہ دونوں انسان انسانیت کے نام پر وجہ تھے مگر قانون کسی کو من مانی کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کا کیس کچھ اس نوعیت کا بنا دوں گا کہ اسے کم سے کم سزا ہو۔ مگر کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شوٹکے کا ریمانڈ مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا چالان تیار کر لیا۔ میرا ارادہ اسے دوسرے روز عدالت میں پیش کرنے کا تھا۔ مزید ریمانڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہی گل زمان کا چالان بھی تیار کر لیا۔ وہ اقبال جرم کر چکا تھا۔ اس کا ریمانڈ لینا بے مقصد تھا۔ میں جلد از جلد اپنی ذمہ داری سے عمدہ برآ ہو جانا چاہتا تھا۔

دوسرے روز ہم عدالت پہنچ گئے۔ میرے ساتھ اے ایس آئی امانت علی بھی تھا۔ شوٹکے کی ہتھکڑی کی زنجیر میرے ہاتھ میں تھی۔ گل زمان کی زنجیر امانت علی نے تھام رکھی تھی۔ ہم عدالت کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ وہ واقعہ پیش آ گیا۔

میں آگے تھا، اے ایس آئی امانت علی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر غاصا رش تھا۔ میں نے دیکھا، ایک حوالدار کسی مجرم کو ہتھکڑی لگائے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ پھر سب کچھ آنا فنا ہو گیا۔

اچانک گل زمان نے چپتے کے مانند جست لگائی اور سیدھا اپنے پہلو سے گزرتے ہوئے حوالدار کی رائفل پر جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحے وہ رائفل پر قبضہ جما چکا تھا۔

تھے۔ اس وقت تک رات کے دس بج چکے تھے۔ ”بل“ تیار تھا، گل زمان نے اپنے ”کام“ کا آغاز کیا۔

اس نے آرا مشین آن کر دی۔ اس پر جنون سوار تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر تھی ہوئی تھی۔ اسے انتقام کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انتقام.... انتقام۔ اسی انتقام میں چوہدری فرزند علی اور بوٹے اراکین کے بے حس و حرکت جسم اسے دو شہتیروں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے پہلے چوہدری فرزند علی کو اٹھا کر آرا مشین کے پلیٹ فارم پر رکھا پھر بہ آہستگی آگے بڑھتا ہوا دو متوازی حصوں میں تقسیم کر ڈالا۔ خون کے چھینٹے آرا مشین کو سرخ کر گئے۔ جس کھوپڑی نے گل زمان کے خاندان کو تباہ و برباد کرنے کا حکم نامہ جاری کیا تھا، دو نیم ہو کر بڑی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔

گل زمان کی آنکھوں کے سامنے تھی سرخ چادر سرخ تر ہو گئی۔ اب بوٹے کی باری تھی۔ یہ وہ درندہ تھا جس نے گل زمان کی بوڑھی والدہ کو بے آہد کیا تھا۔ گل زمان ماہر کاری مگر کی طرح اسے ناپ تول رہا تھا۔ بوٹے کی ناف کو عین آڑے کے بلیڈ کے سامنے لاتے ہوئے اس نے آگے بڑھا دیا۔ غلیظ خون کا ایک فوارہ بوٹے کے جسم سے پھوٹ نکلا۔ گل زمان کا لباس رنگین ہو گیا۔

کافی دیر تک وہ سکتے کی حالت میں کھڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو سب سے پہلے اس نے آرا مشین کو آف کیا۔ صورت حال اس پر واضح ہوئی تو وہ پریشان ہو گیا۔ ہر چیز پر خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ ابھی اس کا بہت سا کام باقی تھا۔ اس نے اپنے ہواس کو مجتمع کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

سب سے پہلے اس نے گیلیہ کپڑے سے آرا مشین کو اچھی طرح صاف کیا۔ آرا مشین کے نیچے ایک کھانچا سا بنا ہوتا ہے جس میں کٹنے والی لکڑی کا براہہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ آڑے کے پلیٹ فارم سے ہمہ کر نیچے آنے والا خون اس برادے میں جذب ہو چکا تھا۔ اس نے خون آلود برادے کو ایک خالی بورے میں بھرا۔ چوہدری فرزند علی اور بوٹے اراکین کے ”لوپس“ جسموں سے لہو رسا بند ہو چکا تھا۔ اس نے چاروں حصوں کو احتیاط کے ساتھ اٹھا کر ایک دوسری بوری میں ڈال کر بوری کا منہ بند کر دیا۔

ہال نما کمرے میں سے اپنی ”کارروائی“ کے آثار کو ختم کرتے کرتے رات کے دو بج گئے۔ سب سے آخر میں اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور خون آلود لباس کو برادے والی بوری

اے ایس آئی امانت علی اس کے ساتھ ہی کھینچا چلا گیا تھا۔ میں نے بڑی سرعتِ ساتھ پلٹ کر دیکھا، شوکا گجر بھی گھوم چکا تھا پھر اس سے قبل کہ ہم کچھ سمجھ پاتے، گلزار نے رانفل کی ٹال کو شوکنے کے سینے کی جانب کرتے ہوئے عین دل کے مقام پر فائر کر دیا۔ شوکا مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے برآمدے کی میڑھیوں پر گر کر ترپنے لگا۔ اس کا یہ تازہ تازہ خون اگل رہا تھا۔ تھوڑی دیر پھرنے کے بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

گل زمان نے رانفل پھینک دی اور مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا اطمینان تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ وہ مسرت جو انسان کو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

”تھانے دار صیب، یہ امارا شکار تھا..... امارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب آپ چاہے ام کو دربار پھانسی لگا دو۔ پروا نہیں اے۔“

اس کے بعد وہ گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

میرے سینے سے ایک گرمی سانس خارج ہوئی مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔

شوکنے کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ یہ ایک بے سود سی کوشش تھی۔ وہ اپنی سانس پوری کر چکا تھا۔ اسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔

گل زمان خان کو عرقید کی سزا ہو گئی۔ ایک دو بار میرا جیل جانا ہوا تو میں نے خاطر طور پر اس سے ملاقات بھی کی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک دبی دبی سی غمزہ مسکراہٹ نمودار ہو جاتی تھی۔

میں شیخوپورہ کے اس تھانے میں زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ ایک سال بعد ہی میرا تبادلہ پٹنہ بھشیاں کے ایک تھانے میں ہو گیا مگر گل زمان کو میں آج تک نہیں بھول سکا۔ آج بھی جب میں اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو دل میں دکھ کی ایک لہری سراپت کر جاتا ہے۔ گل زمان خان جیسے انتقامی ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ چوہدری فرزند علی جیسے ظالم اور بوٹے اور شوکنے جیسے درندہ صفت لوگ ہی ایک عام معصوم انسان کو حیوان بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔



## محروم محبت

خوبصورت عورت کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتی!

عورت کا بے پناہ حسن بعض اوقات اس کے لئے بہت بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ خاص طور پر وہ حسین عورت جو اپنے مرکز کو چھوڑ دے۔ جس کے سر پر کوئی چھت نہ ہو اور کسی مہربان سائبان کی مستلاشی ہو۔ ایسی بے یار و مددگار حسین و جمیل عورت اپنے حسن کی وجہ سے کبھی خود آزمائش میں مبتلا ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کو آزمائش میں مبتلا رکھتی ہے۔

عابدہ بھی ایسی ہی ایک عورت تھی!

میں نے جب پہلی مرتبہ عابدہ کو دیکھا، اس وقت وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ اس کے مردہ چہرے پر پائی جانے والی تازگی و شگفتگی کو دیکھ کر میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ زندگی کی رعنائی سے بھرپور ہوتے ہوئے وہ کس قدر پرکشش رہی ہوگی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ سال کے طویل ترین دن یعنی بائیس جون کی صبح تھی۔ اس روز میں حسب معمول ڈیوٹی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ علی الصبح نہر کے کنارے پر ایک عورت کی لاش ملی ہے۔ لاش کی اطلاع ایک کھمار نے دی تھی جو صبح سویرے مٹی ڈھونے نکلا تھا۔ میں نے فی الفور اے ایس آئی ظہور حسین کو ساتھ لیا اور جائے قوعہ پر پہنچ گیا۔

ان دنوں میری تعیناتی ضلع جھنگ کے ایک ”نبتا“ زیریں علاقے حویلی ہمار کے تھانے میں تھی۔ حویلی ہمار، تریموں سدھنائی رابطہ نہر کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک بڑی نہر ہے جو دریائے چناب و دریائے جہلم کے سنگم تریموں ہیڈ ورکس کو دریائے راوی پر تعمیر شدہ سدھنائی ہیڈ ورکس سے ملاتی ہے۔ یہ رابطہ نہر باری دو آبہ کے کچھ حصے اور رچنا دو آبہ کو برابر کرتی ہے۔

عابدہ نے پھول دار پر ٹنڈ لان کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں دو پٹی چپل تھی۔ اس کی گردن کی گرد لپٹے ہوئے سرخ دوپٹے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ مقتولہ کا نام مجھے

”جہیں ٹھیک پتہ چلا ہے۔“ میں نے اس بااخلاق شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”شرافت علی، لو دیکھ لو تم بھی۔“ پھر میں نے لاش کے چرے پر سے چادر ہٹا دی۔  
”اوہ!“ شرافت علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا ”یہ تو عابدہ پروین ہے۔“

”کون عابدہ پروین؟“ میں نے پوچھا۔  
شرافت علی چند لمبے خاموش نظروں سے عابدہ کا مردہ چہرہ دیکھتا رہا پھر شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ میری کرائے دار تھی۔ چند روز پہلے یہ اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“  
”کیا نام ہے اس کے خاوند کا؟“  
”جیل۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”جیل اس وقت کہاں ہے؟“  
”پتہ نہیں جناب، وہ بھی صبح سے غائب ہے۔“  
”شرافت علی، کیا تم ان میاں بیوی کو پہلے سے جانتے تھے؟“  
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ان سے واقف نہیں تھا۔“  
”پھر تم نے انجینی لوگوں کو کیسے اپنا مکان کرائے پر دے دیا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”جناب، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے انہیں پورا مکان کرائے پر نہیں دیا تھا بلکہ اپنے گھر کی بیٹھک انہیں رہنے کے لئے دے دی تھی۔“ ایک لمبے کو رک کر اس نے وضاحت کی ”ہم دونوں جی اکیلے ہی رہتے ہیں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں نے سوچا، گھر کا کچھ حصہ کرائے پر اٹھا دینا چاہئے۔ اس طرح گھر بیٹھے اضافی آمدنی بھی ہوتی رہے گی اور ہم دونوں میاں بیوی کا دل لگا رہے گا۔ اس سلسلے میں، میں نے کچھ لوگوں کو کہہ رکھا تھا کہ میں اپنے مکان کا ایک کرا کر اپنے پر دینا چاہتا ہوں۔ کوئی بارہ پندرہ روز قبل جیل اپنی بیوی عابدہ کے ساتھ میرے پاس آیا اور گھر کا کچھ حصہ کرائے پر لینے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ گفتگو سے خاصا مہذب اور لکھا پڑھا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ضروری شرائط طے کرنے کے بعد اپنی بیٹھک انہیں کرائے پر دے دی۔ بیٹھک کا ایک دروازہ باہر کی جانب بھی ہے۔ جیل اسی دروازے سے آتا جاتا تھا البتہ وہ دونوں باورچی خانہ اور باتھ روم استعمال کرنے کے لئے بیٹھک کا اندرونی دروازہ استعمال کرتے تھے۔“

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا ”شرافت علی، تمہارا گھر کس طرف ہے؟“  
”ادھر نزدیک ہی ہے جناب!“ اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔  
”ٹھیک ہے، باقی باتیں تمہارے گھر میں بیٹھ کر ہوں گی۔“

بعد میں دوران تفتیش میں معلوم ہوا تھا۔ مقتولہ کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس اور پچیس سال کے درمیان لگایا۔ چونکہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی اس لئے اس کی آنکھیں وحشت ناک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ لیکن اس منظر نے مقتولہ کی دلکشی اور خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔

موقع پر کافی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں اچھی خاصی عورتیں بھی تھیں جن کے ساتھ بچے بھی تھے۔ میں نے موقع پر موجود معتبر مردوں اور بردبار عورتوں کو باری باری مقتولہ کا چہرہ دکھا کر پوچھ گچھ کی لیکن کوئی بھی اسے شناخت نہ کر سکا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہاں کی رہنے والی نہیں تھی بلکہ کسی اور علاقے سے وہاں پہنچی تھی۔  
میں نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اے ایس آئی سے کہا ”ظہور حسین، تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر مقتولہ کا کوئی والی وارث نہ آیا تو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیں گے۔“

”یہ تو کرنا ہی پڑے گا ملک صاحب!“ اے ایس آئی نے پر خیال انداز میں کہا ”اول تو یہی لگتا ہی کہ مقتولہ یہاں کی نہیں ہے اس لئے کسی وارث کے یہاں پہنچنے کی امید کم ہی ہے اور اگر کوئی آ بھی گیا تو اس صورت میں بھی لاش کا پوسٹ مارٹم تو کروانا ہی ہو گا۔“  
میں نے کہا ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ سیدھا سیدھا قتل کا معاملہ ہے۔“

ایک ادھیڑ عمر شخص جو قریب کھڑا ہماری گفتگو سن رہا تھا، افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! خواخواہ لاش کی بے حرمتی نہ کروائیں۔ اس کراہ ماری کی موت اسی طرح لکھی ہوئی تھی۔“

میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا ”چاچا، تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ بے چاری کوئی کراہ ماری (بد نصیب) تھی؟“

وہ بوکھلا گیا ”جناب، دیکھیں نا۔ اس طرح کی موت تو....“  
اے ایس آئی نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور پوچھا ”چاچا، تم جانتے ہو اس عورت کو؟“

”نہیں جناب، میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“  
اس سے پہلے کہ اے ایس آئی کوئی اور سوال پوچھتا، ایک پختہ عمر شخص لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہمارے پاس آیا اور کہا ”جناب میرا نام شرافت علی ہے۔ کیا میں مرنے والی کا منہ دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں کسی عورت کی لاش ملی ہے؟“

”سوبسم اللہ جناب۔“

اس کے بعد میں نے عابدہ پردین کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ضلع اسپتال بھجوا دیا اور اے ایس آئی کے ساتھ شرافت علی کے گھر پہنچ گیا۔

شرافت علی کا مکان پانچ مرلہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ پیچھے دو بڑے کمرے تھے جن کے سامنے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک برآمدہ تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ بیٹھک اور برآمدے کے درمیان وسیع صحن تھا جس میں امرود اور شہتوت کے پودے لگے ہوئے تھے۔ صحن ہی میں ایک جانب بلورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ بھی بنا ہوا تھا۔

بیٹھک کے بیرونی دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ صحن کی جانب کھلنے والے دروازے کو اندر سے کندی چڑھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی مرضی ہی سے کہیں گئے تھے۔

شرافت علی ہمیں گھر کے اندر لے گیا اور صحن میں بٹھایا۔ اس نے خاص طور پر میرے لئے اندر کمرے میں سے ایک کرسی نکال لی تھی۔ اے ایس آئی صحن میں بھیجی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”ہاں بھئی شرافت علی!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اب ذرا جلدی سے بتاؤ کہ تمہارے کرائے دار کب یہاں آئے تھے؟“

کچھ حساب لگانے کے بعد اس نے جواب دیا ”پندرہ دن پہلے جناب۔“

”آج بائیس تاریخ ہے۔“ میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے وہ سات یا آٹھ تاریخ کو یہاں پہنچے تھے؟“

”اللہ آپ کا بھلا کرے، وہ آٹھ تاریخ کو آئے تھے۔“ شرافت علی نے کہا۔

”انہوں نے یہ تو بتایا ہو گا کہ کہاں سے آئے ہیں؟“

”نہیں بتایا جناب!“

”اور تم نے پوچھا بھی نہیں؟“

شرافت علی نے جواب دیا ”میں نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ البتہ میری بیوی کو عابدہ نے بتایا تھا کہ انہوں نے حال ہی میں گھر والوں سے چھپ کر شادی کی تھی اور وہ اس وقت تک الگ رہنا چاہتے تھے جب تک ان کے لواحقین کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“

میرا معاملہ عشق وغیرہ کا تھا۔ یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ جمیل نابی وہ شخص لڑکی کو مکر سے بھگا کر لایا تھا۔ اب انہوں نے واقعی شادی بھی کر لی تھی یا یونہی میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے، اس کا پتہ لگانا بہت ضروری تھا۔

میں نے شرافت علی سے پوچھا ”جمیل کام کیا کرتا تھا؟“

”میری بیوی کو عابدہ نے بتایا تھا کہ جمیل ایک ہائی اسکول میں سائنس ٹیچر تھا۔“ شرافت علی نے جواب دیا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات وہ یونہی گھوم پھر کر گزارنا چاہتے تھے۔ اس دوران میں ان کے حالات نارمل ہو جاتے اور وہ واپس اپنے علاقے میں چلے جاتے۔“

میں نے سوچا، جو اسکول ٹیچر ایک لڑکی کو بھگا لایا تھا وہ بھلا بچوں کو کیا تعلیم دیتا ہو گا۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بجائے شرافت علی سے استفسار کیا۔

”شرافت علی، کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے شادی کر لی تھی۔“

”ہاں... میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔“ وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ جمیل، عابدہ کو گھر سے بھگا کر لایا ہو گا مگر انہوں نے شادی وغیرہ نہیں کی ہو گی۔ ممکن ہے جمیل کا ایسا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ عابدہ نے نکاح کے لئے اصرار کیا ہو اور دونوں میں اس بات پر تلخ کلامی ہو گئی ہو جس کے نتیجے میں جمیل نے عابدہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا ہو اور خود کہیں فرار ہو گیا ہو۔

ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ جمیل میری نظروں میں مشکوک ٹھہر چکا تھا۔ اس نے ایک معلم ہونے کے باوجود جو حرکت کی تھی وہ کسی بھی طور پسندیدہ نہیں کہلاتی تھی۔ میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھ کر شرافت علی سے پوچھا۔

”شرافت علی، کیا جمیل اور عابدہ آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے؟“

”مجھے تو پتہ نہیں جناب!“ اس نے جواب دیا پھر کہا ”ٹھہرس، میں اپنی گھر والی سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ عورتیں ان معاملات پر گہری نظریں رکھتی ہیں۔“

وہ اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ صحن میں آگیا۔ اس کی بیوی کا نام شریفان بی بی تھا۔ اس نے ٹاسے کی چادر کا لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔

میں شرافت علی اور شریفان بی بی کے جوڑ پر دل ہی دل میں مسکرا دیا پھر وہی سوال شریفان بی بی سے بھی کیا۔

اس نے گھونگھٹ کے پیچھے سے جواب دیا ”تھانے دار صاحب، اندر کا حال تو سونہ  
رب ہی جانتا ہے پر میں نے انہیں کبھی تو تو میں میں کرتے نہیں سنا۔“

”اس کا مطلب ہے، ان دونوں میں بہت اتفاق تھا؟“

اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے جواب دیا ”بڑی گورمھی محبت لگتی تھی ان میں۔“

میں نے پوچھا ”شریقات بی بی، عورتوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اور خاص طور پر  
اگر معاملہ کسی عورت ہی کا ہو تو اس کے تمام حواس پوری طرح بیدار ہو جاتے ہیں۔ تمہارا  
کیا خیال ہے، کیا ان دونوں نے واقعی شادی کر لی تھی؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولی ”لوں کی باتیں تو رب ہی جانتا ہے جناب، پر مجھے ان پر شک  
نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل میاں بیوی ہی لگتے تھے۔“

میں نے شرافت علی سے پوچھا ”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی شرافت علی۔“ اس  
نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے کہا ”وہ دونوں کوئی پندرہ دن سے یہاں رہ رہے  
تھے لیکن عابدہ کی لاش کو کسی شخص نے شناخت نہیں کیا؟“

”اس کی ایک خاص وجہ ہے جناب!“ شرافت علی نے جواب دیا ”عابدہ گھر سے باہر  
نہیں نکلتی تھی۔ بس جمیل ہی دن میں کہیں آتا جاتا تھا اور وہ بھی بہت کم کم۔ زیادہ وقت وہ  
دونوں بیٹھک ہی میں گزارتے تھے۔“

اب تقریباً دوپہر ہو چکی تھی لیکن جمیل کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ یہ بات  
میرے شک کو یقین میں بدل رہی تھی۔ میں نے شرافت علی سے پوچھا ”کیا جمیل پہلے بھی  
اتنی دیر گھر سے باہر رہا ہے؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے جواب دیا ”اور آج تو بتا کر بھی نہیں گیا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ ”شرافت علی، کیا گزشتہ پندرہ دنوں میں  
کوئی ان سے ملنے بھی آیا تھا؟ کوئی مہمان وغیرہ؟“

”مہمان کا کیا سوال جناب عالی!“ شرافت علی نے جواب دیا ”یہاں تو وہ دونوں پر دہی  
تھے اور پھر وہ تو چھپ چھپا کر یہاں پہنچے تھے۔“

دو چار رسمی باتوں کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ شرافت علی کے گھر سے نکلنے وقت  
میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ جمیل جیسے ہی واپس آئے، وہ فوراً ہمیں تھانے میں اطلاع  
دے۔ تاہم اس بات کا امکان کم ہی تھا۔ اگر جمیل عابدہ کے قتل میں کسی بھی طرح ملوث تھا  
تو اس کی واپسی کے بارے میں سوچنا حماقت کے زمرے میں آتا تھا۔ اگر میں صحیح خطوط پر

سوچ رہا تھا تو جمیل اس وقت تک حویلی بہادر سے بہت دور جا چکا ہو گا۔ تاہم میں نے  
شرافت علی کو بتائے بغیر احتیاط کے پیش نظر، ایک سادہ لباس کا ٹیبل کو شرافت علی کے گھر  
کے پاس ہی متعین کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ جیسے ہی کوئی شخص اس گھر کی بیٹھک کا  
دروازہ کھولنے کی کوشش کرے، وہ اسے گرفتار کر کے تھانے لے آئے۔

شام تک جب جمیل کی واپسی کی کوئی اطلاع نہیں ملی تو میں نے علاقے کے تین چار  
مستجر افراد کو ساری صورت حال بتانے کے بعد شرافت علی کی بیٹھک کے بیرونی دروازے کا  
تالا توڑ دیا۔ اس وقت تک یہ خبر پورے علاقے میں پھیل چکی تھی کہ صبح نہر کے کنارے  
سے جس عورت کی لاش ملی تھی، وہ شرافت علی کی بیٹھک میں کرائے دار کی حیثیت سے رہ  
رہی تھی۔

بیٹھک نام کی ہی بیٹھک تھی ورنہ وہ ایک عام سا کرا تھا۔ مغربی دیوار کے ساتھ ایک  
پٹنگ نما چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر بستر بھی موجود تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار پر  
کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہاں ایک زنانہ اور ایک مردانہ جوڑا لٹکا ہوا نظر آ  
رہا تھا۔ پٹنگ نما چارپائی کے نیچے سے ایک سوٹ کیس برآمد ہوا۔ شرافت علی نے بتایا کہ وہ  
دونوں جب یہاں پہنچے تھے تو ان کے پاس یہی ایک سوٹ کیس تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ  
خاصی بے سرو سامانی میں گھروں سے نکلے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہی اس سوٹ کیس میں  
سے کوئی قیمتی چیز برآمد ہو۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ سوٹ کیس میں زنانہ اور مردانہ استعمال کے چند کپڑوں  
کے علاوہ دیگر چھوٹی موٹی اشیاء تھیں مثلاً شیونگ کا سامان، ایک عدد رنگین پراندہ، میک اپ کا  
کچھ سامان، سرخی، لالی اور پاؤڈر وغیرہ، ایک خوشبودار تیل کی بوتل۔ سوٹ کیس کے ڈھکنے کی  
جیب میں ایک عدد کنگھا، دو عدد ریشمی رومال اور ایک راشنک پیڈ برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ  
ایک عدد فونٹین پن بھی ملا۔ راشنک پیڈ کورا تھا۔

میں نے سوٹ کیس کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اسے بند کر دیا اور چارپائی کے نیچے  
نظر دوڑائی۔ بالکل دیوار کے ساتھ مجھے جوتوں والا ایک ڈبا نظر آیا۔ میرے حکم پر ایک  
کانشیل نے وہ ڈبا باہر نکالا۔ وہ دس نمبر سائز کے جوتے کا ڈبا تھا۔ میں نے اسے کھول کر  
دیکھا۔ وہ خالی تھا، اندر صرف پیکنگ والا گڈی کاغذ رکھا تھا۔ میں نے گڈی کاغذ کو باہر نکالا تو  
اس میں سے یہ شدہ ایک کاغذ نیچے گر پڑا۔

میں نے اس سے شدہ کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ وہ جوتے کی رسید تھی۔ وہ جوتا کسی ”



آفتاب بوٹ ہاؤس“ سے خریدا گیا تھا۔ رسید پر دکان کا پتہ بھی درج تھا جو پرانا خانپوال کے مین بازار کا تھا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے شرافت علی سے پوچھا ”جوتے کا یہ ڈبا تمہارا ہے شرافت علی؟“

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”جناب“ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ذرا میرے پاؤں تو دیکھیں۔ اتنا بڑا جوتا میں کیسے پہن سکتا ہوں۔ یہ ڈبا جمیل کا ہے۔“

میں نے فوراً شرافت علی کے پاؤں کا جائزہ لیا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کا پاؤں سات نمبر یا زیادہ سے زیادہ آٹھ نمبر کا تھا۔ دس نمبر کا جوتا اس کے کسی مصرف کا نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے جوتے کی رسید کو دیکھ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور اٹھتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے شرافت علی، تھانہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر جمیل واپس آجائے یا کوئی اور غیر معمولی بات محسوس کرو تو فوراً ہمیں اطلاع کر دینا۔“

وہ سر جھکا کر بولا ”جو حکم جناب۔“

میں نے معززین علاقہ کے سامنے مذکورہ سلمان کی ایک فہرست تیار کی جس کی ایک کاپی شرافت علی کو دی اور سلمان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے بعد میں واپس تھانے چلا آیا۔ سلمان کو مال خانے میں جمع کر کے میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اگلی صبح میں نے اس واردات کی رپورٹ علاقے کے ایس پی کو بھجوا دی۔ اس کے بعد جو دفتری کارروائی ہوئی وہ آپ کے لئے غیر دلچسپ ہو گی اس لئے میں اس کا ذکر حذف کر کے اپنی تفتیش کا احوال آپ کو سناتا ہوں۔

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اس کے ساتھ کیمیکل اینڈامینٹر کی رپورٹ بھی منسلک تھی۔ ان رپورٹوں کے مطابق مقتولہ عابدہ پروین کی موت اکیس اور بائیس جون کی درمیانی شب دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وجہ موت سانس کی آمد و شد کا منقطع ہونا تھی۔ مقتولہ کی گردن پر گلا گھونٹنے کے واضح آثار پائے گئے تھے۔ نیز مقتولہ کے طبی تجزیے سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ وہ ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔

اس انکشاف کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر واقعی جمیل نے عابدہ پروین سے ابھی تک نکاح نہیں کیا تھا تو ممکن تھا ان کے درمیان اسی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا ہو اور جمیل اس سے چمکارا حاصل کر کے کہیں روپوش ہو گیا ہو۔ اس تھیوری میں ایک کمزور پہلو

یہ تھا کہ جمیل آخر نکاح سے گریزاں کیوں ہو گا۔ اگر وہ سرے سے عابدہ سے شادی کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا تو اسے بھگا کر کیوں لایا؟ اس سوال کا جواب تفتیش کے دوران میں ہی مل سکتا تھا۔

دوسرے روز میں نے ضلع ہیڈ کوارٹر جھنگ سے اجازت لی اور اے ایس آئی ظہور حسین کے ہمراہ خانپوال روانہ ہو گیا۔

ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر خانپوال کو ہم نے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا پھر متعلقہ تھانے میں بھی اطلاع کی۔ مذکورہ تھانے کے انچارج نے ہمیں ہر قسم کی پوچھ گچھ کی اجازت دے دی اور بھرپور تعاون کا یقین بھی دلایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں اور ظہور حسین پرانا خانپوال کے مین بازار میں ”آفتاب بوٹ ہاؤس“ کے سامنے کھڑے تھے۔

آفتاب بوٹ ہاؤس خاصی جی سجائی دکان تھی۔ ہمیں دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک سلازمن آگے بڑھا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں بولا۔

”آئیے جناب، بیٹھے۔ میں آپ کو آپ کی پسند کے جوتے دکھاتا ہوں۔ کس قسم کا جوتا خریدیں گے آپ۔ گرمابی، کمیشن، چپل۔۔۔“

”اس دکان کا مالک کون ہے؟“ میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا ”ہم اس سے ملنے آئے ہیں۔“

سلازمن نے ایک لمحے حیرت سے مجھے دیکھا پھر کلاؤنٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”آفتاب صاحب ادھر بیٹھے ہیں۔“

ہم کلاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

اس وقت ہم سادہ لباس میں تھے اس لئے قدم قدم پر تعارف کی ضرورت پڑتی تھی ورنہ تو پولیس کی وردی اپنا تعارف خود ہوتی ہے۔

کلاؤنٹر پر براہمان شخص کی عمر لگ بھی چالیس سال تھی۔ وہ خاصا ہٹا کٹا اور صحت مند انسان تھا۔ وہ غالباً ہمیں سلازمن سے بات کرتے دیکھ چکا تھا اس لئے چھوٹے ہی بولا۔ ”ہاں جناب، آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے تعارف کرواتے ہوئے کہا ”میں ضلع جھنگ کے ایک تھانے کا انچارج ہوں۔۔۔ اور یہ میرے ساتھ اے ایس آئی ظہور حسین ہے۔“

وہ کلاؤنٹر کے پیچھے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”کیا نام بتایا ہے آپ نے جناب؟“ شاید وہ ذرا اونچا سنتا تھا لیکن نہیں، وہ تو ہمیں سلازمن سے بات کرتے دیکھ کر سمجھ گیا

تھا کہ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر یہی بات ہو سکتی تھی کہ اسے میرے تھانے دار ہونے کا یقین نہ آیا ہو۔

میں نے اس کی تسلی کے لئے اپنا بیج نکال کر اسے دکھایا تو وہ اٹھن شین ہو گیا ”ملک صاحب“ میرے لئے کیا حکم ہے؟“

میرے بجائے اے ایس آئی نے جواب دیا ”ہم ایک قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ سے پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں۔“

”تق.... قتل۔“ وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا ”کون قتل ہو گیا ہے اور آپ کس قسم کی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے اس کے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے ”ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا ”کیا ہم کہیں آرام سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

وہ فوراً کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آ گیا پھر دکان کے پچھلے حصے کی جانب چلے ہوئے بولا ”آپ آجائیں جناب“ ہم ادھر بیٹھتے ہیں۔“ پھر اس نے ایک سینئر سیلزمین کو ہدایت دی کہ وہ کاؤنٹر کے معاملات کو سنبھالے۔

دکان کا عقبی حصہ دراصل جوتوں کے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن اس گودام کے ایک حصے کو نشست گاہ کی شکل دے دی گئی تھی۔ وہاں پر ایک صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں نے جیب سے مذکورہ رسید نکال کر دکان کے مالک آفتاب احمد کو دکھاتے ہوئے پوچھا ”یہ آپ ہی کی دکان کی جاری کردہ رسید ہے؟“

”جی ہاں بالکل۔“ اس نے رسید ہاتھ میں لیتے ہی تصدیق کر دی۔

میں نے پوچھا ”آپ بتا سکتے ہیں کہ اس جوتے کا خریدار کون تھا؟“

میں نے دانستہ جمیل کا نام نہیں لیا تھا۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ رسید پر تمیں مئی کی تاریخ درج تھی۔

آفتاب احمد رسید کو ہاتھ میں تھامے تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا ”تمیں تاریخ.... دس نمبر کا جوتا....“ اچانک اس کے چہرے پر کامیابی کی چمک نمودار ہوئی۔

”ہاں“ مجھے یاد آ گیا۔ ”وہ جلدی سے بولا ”یہ جوتا ماسٹر جمیل نے خریدا تھا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے سوال کر دیا ”خیریت تو ہے ملک صاحب۔ ماسٹر صاحب....“

وہ جملہ ادھر اچھوڑ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا ”میں نے کہا ”ماسٹر جمیل جہاں کہیں بھی ہو گا اس وقت تک خیریت سے ہی ہو گا جب تک ہمارے ہتھے نہیں چڑھ جاتا۔“

”آپ کسی قتل کا ذکر کر رہے تھے؟“ اس نے پوچھا ”کون قتل ہو گیا ہے؟“

میں نے کہا ”آپ عابدہ پروین نامی کسی عورت کو جانتے ہیں؟“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ”نہیں جناب“ میں کسی عابدہ پروین سے واقف نہیں ہوں۔“

میں نے پوچھا ”ماسٹر جمیل کا گھر تو آپ کو معلوم ہوگا؟“

اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ ”گھر کا تو پتہ نہیں لیکن وہ لاہور موڑ کے قریب ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”باقی معلومات ہم اسکول ہی سے حاصل کر لیں گے۔“

آفتاب احمد نے لجاجت آمیز انداز میں کہا ”ملک صاحب“ آپ کچھ کھائے پیئے بغیر میری دکان سے جا رہے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

وہ تھوڑی دیر پہلے بھی ہماری خدمت کے لئے کئی بار پر تول چکا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ میں نے کہا ”آفتاب صاحب“ آپ کا تعاون ہی سب سے بڑی خدمت ہے اور ویسے بھی میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔“

ہم پوچھتے پوچھتے تھوڑی دیر بعد مذکورہ اسکول میں پہنچ گئے۔ وہ اسکول عین لاہور موڑ کے نزدیک واقع تھا۔ موسم گرما کی چھٹیوں کی وجہ سے اسکول تو بند تھا لیکن قریب ہی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا گھر تھا۔ ہم نے ہیڈ ماسٹر مطلوب حسین کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

رسمی تعارف کے بعد مطلوب حسین ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ مطلوب حسین شائستہ مزاج کا مالک اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی۔

”ملک صاحب“ کیسے زحمت فرمائی میرے غریب خانے پر آنے کی؟“ مطلوب حسین نے ہماری آمد کی وجہ دریافت کی۔

میں نے کہا ”مطلوب صاحب“ آپ کے اسکول میں ایک ماسٹر صاحب پڑھاتے ہیں ”جمیل صاحب؟“

”جمیل بہار۔“ مطلوب حسین نے فوراً کہا ”وہ سائنس کے مضامین پڑھاتے ہیں۔“

”ہم ماسٹر جمیل کے بارے میں تھوڑی پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں۔“

”کیسی پوچھ گچھ جناب؟“ ہیڈ ماسٹر سنجیدہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا ”مطلوب صاحب“ آپ جہاں دیدہ آدمی دکھائی دیتے ہیں اور آپ کی مردم شناسی میں بھی مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ ذرا یہ بتائیں کہ ماسٹر جمیل ہمارا کردار کے معاملے میں کیسے ہیں؟“

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”میں نے ہمیشہ جمیل ہمارا کو شفاف کردار کا مالک پایا ہے۔ میرے آپ کے سوال کا مقصد ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں؟“

میں نے کہا ”مطلوب صاحب“ ہمارے تھانے کی حدود میں ایک عورت کی لاش ملی ہے۔ ہماری تفتیش کے مطابق وہ عورت ماسٹر جمیل کی بیوی کی حیثیت سے وہاں پہنچی تھی۔ جمیل اس دن سے غائب ہے جس دن اس عورت کی لاش ملی تھی۔ ان کا سالانہ ہمارے تھانے کے مال خانے میں رکھا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ مذکورہ مقتولہ کا نام عابدہ پروین ہے۔ کیا آپ اس نام کی کسی عورت سے واقف ہیں؟“

ہیڈ ماسٹر مطلوب حسین مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے کوئی ان ہونی بات کہہ دی ہو۔ بالا خروہ الجھے ہوئے لمبے میں گویا ہوا۔

”ملک صاحب“ میں آپ کی کسی بھی بات کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔“

”میں نے کوئی پیچیدہ بات تو نہیں کہی ہیڈ ماسٹر صاحب!“

وہ بولا ”دیکھیں جناب“ پہلی بات تو یہ ہے کہ جمیل ہمارا میری آخری معلومات کے مطابق غیر شادی شدہ ہے۔ پھر میں کسی عابدہ پروین کو بھی نہیں جانتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ خانیوال سے میلوں دور آپ کے علاقے حویلی ہمدان میں کیا کرنے گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پورے ضلع جھنگ میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں رہتا۔“

میں نے کہا ”حویلی ہمدان میں وہ دونوں کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ مالک مکان کی بیوی کو عابدہ پروین نے خود بتایا تھا کہ انہوں نے گھروالوں سے چھپ کر شادی کی ہے۔“

”نا قابل یقین۔“ مطلوب حسین نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”جمیل ہمارا سے ایسی حرکت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔“

میں نے کہا ”مطلوب صاحب“ آپ جمیل ہمارا کے گھر تک ہماری راہنمائی کریں گے؟“

”جمیل ہمارا یہاں نہیں رہتا جناب!“

اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا، میں نے کہا ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

مطلوب حسین نے بتایا ”دراصل جمیل ہمارا میاں چنوں کا رہنے والا ہے۔“

”میاں چنوں میں کہاں؟“

”تلب۔“

میں نے پوچھا ”ہیڈ ماسٹر صاحب“ تلب خاصا وسیع علاقہ ہے۔ تلب میں اس کی رہائش

کہاں پر ہے؟“

اس نے بتایا ”تلب میں ماسٹر جمیل ہمارا چک اٹھاسی۔ آرا کا رہنے والا ہے۔“ میں نے

اپنے ذہن میں یہ پتہ نقش کر لیا۔

میں نے پوچھا ”چک اٹھاسی۔ آرا تو یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ وہ روزانہ اسکول

کس طرح آتا ہو گا؟“

”اس نے یہاں پرانا خانیوال کے ایک محلے میں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا کوارٹر

اسکول سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ مینے میں ایک مرتبہ اپنے چک ہو کر آتا ہے۔“

”وہ اس وقت عارضی رہائش گاہ پر مل سکے گا؟“

”میں نے عرض کیا نا، وہ چھیٹیوں میں اپنے گاؤں چلا جاتا ہے۔“ ہیڈ ماسٹر نے بتایا ”مجھے

اچھی طرح یاد ہے، وہ یکم جون کو ہی روانہ ہو گیا تھا۔“

”ہم فرض کر لیتے ہیں کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔“ میں نے بات کو مختصر کرتے

ہوئے کہا ”اس کے باوجود بھی ہم جمیل ہمارا کی عارضی رہائش گاہ ضرور دیکھیں گے اور اس

کے آس پڑوس سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔“

”ہاں ہاں، ضرور۔“ وہ جلدی سے بولا ”میں اپنے چھوٹے بیٹے کو آپ کے ساتھ بھیجتا

ہوں۔“

میں نے پوچھا ”جمیل ہمارا کی عارضی رہائش گاہ کے آس پاس کوئی عابدہ پروین ہو گی؟“

”اس بارے میں میری معلومات صفر کے برابر ہیں۔“

”شکریہ ہیڈ ماسٹر صاحب!“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر پوچھا ”کیا ماسٹر جمیل صاحب شاعری

بھی کرتے ہیں؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ مطلوب حسین نے میرے خیال کی تصدیق کر دی ”ہمارا

اس کا تخلص ہے۔ اچھی خاصے شعر کہہ لیتا ہے۔“

”ضرور سنیں گے اس کے شعر بھی۔“ میں نے دو معنی انداز میں کہا ”ذرا ملاقات تو ہو

جائے۔“

”خالہ کون ہے دروازے پر؟“

اس سے پہلے کہ عابدہ کی بہن خالہ کوئی جواب دیتی، پوچھنے والا کمر جھکائے خود ہی وہاں چلا آیا۔ اپنے سامنے اجنبی چروں کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ اس نے کرخٹ لہجے میں دریافت کیا ”کیا بات ہے بھئی، کس سے ملنا ہے؟“

وہ لگ بھگ ساٹھ پینسٹھ سال کا خمیدہ کمر بوڑھا شخص تھا۔ اس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ سر پر سبز رنگ کی ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور اس چشمے کے پیچھے سے اس کی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”آپ غالباً عابدہ پروین کے باپ ہیں؟“

”ہم نہ لیں اس حرام زادی کا۔“ عابدہ کا نام سن کر وہ ایک دم بھڑک اٹھا پھر اسے فوراً ہی خیال آگیا ”قدرے نرم لہجے میں پوچھا“ آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟“

میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا ”میں آپ کی بیٹی عابدہ پروین کے بارے میں ایک بری خبر لایا ہوں۔“

وہ بددماغ بڑھا تیوری چڑھا کر بولا ”اچھا جی، تھانے دار صاحب، کیا بری خبر لائے ہیں آپ۔ کیا مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں؟“

مجھے اس کے انداز پر بہت غصہ آیا، میں نے سخت لہجے میں کہا ”اگر ضروری ہوا تو گرفتار بھی کر کے لے جائیں گے۔ پہلے ذرا اپنا تعارف تو کروائیں۔“

اس نے سینہ پھلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میرا نام مولوی نور شاہ ہے۔ میں محلے کی مسجد کا پیش امام ہوں۔“

”واہ! سبحان اللہ۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”مجھے آپ کے اخلاق نے بہت متاثر کیا ہے۔“

”فضول باتیں چھوڑیں اور بتائیں کیا خبر لائے ہیں؟“ اس کے لہجے سے برہمی ہو رہی تھی۔

میں نے کہا ”پیش امام صاحب، لڑکی کا معاملہ ہے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔“

دروازے کی اوٹ سے چوڑیوں کی کھنک ابھری پھر خالہ کی آواز آئی ”ابا جی، ان کو اندر بلا لیں۔“

تھوڑی دیر بعد دروازہ کے بعد بوڑھا نور شاہ ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس

ہیڈ ماسٹر کا چھوٹا بیٹا ہمیں ماسٹر جمیل کا گھر دکھا کر واپس چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جس کے بیرونی دروازے پر ایک تھلا جھول رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا، کمین مکان میں نہیں ہے۔ میں نے اس کے کوارٹر کو ذہن نشین کر لیا اور محلے میں گھوم پھر کر ماسٹر جمیل کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ ہماری پوچھ گچھ کے نتیجے نے ہیڈ ماسٹر مطلوب حسین کے خیالات کی توثیق کر دی۔ ماسٹر جمیل کی وہاں اچھی خاصی عزت تھی۔ اکا دکا لوگوں سے عابدہ پروین کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ ایک عابدہ پروین ماسٹر جمیل کی پڑوسن نکل آئی۔ میں نے سب سے پہلے وہیں ٹرائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک بات کو ذہن میں رکھیں کہ میں تمام واقعات سلسلے وار ترتیب سے بیان کر رہا ہوں ورنہ بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ ضلع خانیوال میں ہمارا قیام تقریباً پانچ روز کا تھا۔ یہ بات تو مجھے وہاں پہنچنے ہی معلوم ہو گئی تھی کہ کسی بھی تھانے میں عابدہ پروین نامی کسی عورت کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی تھی۔

ہماری دستک کے جواب میں دروازہ ایک عورت نے کھولا تھا۔ اپنے سامنے اجنبی مردوں کو دیکھ کر وہ فوراً دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ پھر وہیں سے پوچھا۔

”آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

اس عورت کی ایک جھلک نے میرے ذہن میں کئی قیمتی روشنی کر دیئے تھے۔ اے ایس آئی دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ وہ اس عورت کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا ”ہو نہ ہو یہ عابدہ پروین کی کوئی قریبی رشتہ دار ہے۔ اس عورت کے نین نقش خاصی حد تک عابدہ پروین سے ملتے جلتے تھے۔ یعنی ہم نے بالکل ٹھیک دروازے پر دستک دی تھی۔“

میں نے کہا ”عابدہ پروین یہیں رہتی ہے؟“

”آپ کون ہیں؟“

میں نے اپنا تعارف کرایا ”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں ضلع جھنگ کے ایک تھانے سے آیا ہوں۔“

”ہائے میں مرگئی۔ کیا ہو گیا میری بہن کو؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اپنے مطلوبہ دروازے پر کھڑا تھا۔ اسی دوران میں اندر سے نحیف مردانہ آواز میں پوچھا گیا۔ اس آواز میں نقاہت کے ساتھ ساتھ بے زاری کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

نے پوچھا ”اب بتائیں کیا معاملہ ہے؟“

میں نے کہا ”عابدہ پروین کو گھر سے بھاگے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ وہ پھر ہتھ سے اکھڑ گیا ”آپ سے کس نے کہہ دیا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے؟“

وہ بوڑھا آدمی تھا مگر بہت ڈیرھا بول رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز نے کھولا کر رکھ دیا۔ میں نے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔

”شاہ صاحب، آپ کیسے پیش امام ہیں کہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آپ کی امامت میں نماز پڑھتے ہوں گے ان کا تو خدا ہی حافظ ہے۔“

وہ غصے سے بولا ”آپ مجھے دین سکھانے کی کوشش نہ کریں۔“  
میں نے کہا ”ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم میں سے اچھا ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کون سے اخلاق کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟“

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا ”دراصل، میں جذبات میں آ گیا تھا۔“  
”آپ جذبات میں نہیں بلکہ غصے میں آ گئے تھے۔“ میں نے اپنے لہجے میں سختی برقرار رکھتے ہوئے کہا ”غصہ حرام قرار دیا گیا ہے اور جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔“

اس نے آنکھیں پھیلا کر حیرت سے میری طرف دیکھا پھر پوچھا ”ملک صاحب، کیا آپ واقعی تھانے دار ہیں؟“

”آپ کو یقین نہیں ہے کیا؟“

”نہیں۔“ وہ دائیں بائیں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ”بے یقینی کی وجہ؟“

”پولیس والے ایسی باتیں تو نہیں کرتے۔“

میں نے کہا ”جس طرح پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں اسی طرح سارے پولیس والے بھی ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ میں پہلے مسلمان اور بعد میں تھانے دار ہوں۔“

وہ میرے جواب سے قائل نظر آنے لگا۔ میں نے اسے راہ راست پر آتے دیکھ کر پوچھا ”عابدہ پروین کو گھر چھوڑے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

اس نے پھر جواب دینے میں تامل کیا۔ اسی اثنا میں خالہ پروین کمرے میں داخل ہوئی

اور تیز آواز میں بولی۔

”میں دروازے کے پیچھے سے آپ کی تمام گفتگو سن چکی ہوں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اباجی سے آپ کو جو پوچھنا ہے وہ بعد میں پوچھتے رہیں۔ پہلے یہ بتائیں کہ میری بہن کو کیا ہوا ہے؟“

خالہ کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے کم و بیش تیس سال لگایا۔ وہ عابدہ کی طرح خوب صورت تو نہیں تھی البتہ اسے قبول صورت کہا جاسکتا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر غم کی گہری بدلی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے مختصر الفاظ میں عابدہ کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔ خالہ نے فوراً رونا شروع کر دیا ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا، کوئی گریز ضرور ہو جائے گی۔ میرے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوا تھا۔ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔“

مولوی نور شاہ غصے سے اپنی بیٹی کو گھورنے لگا ”خالہ، تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔ گھر کی باتیں سب کے سامنے نہیں کرنا چاہئیں۔“

وہ آنسو خشک کرتے ہوئے بولی ”میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آج میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔ آپ کی سختیوں نے اس گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔“

”تم بکواس بند کرو اور دوسرے کمرے میں جاؤ۔“ وہ غصے سے دباڑا پھر میری جانب مڑتے ہوئے بولا ”ملک صاحب، یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم اپنی الجھن کو خود ہی سلجھا لیں گے۔“

میں نے کہا ”مولوی صاحب، اب یہ صرف آپ کے گھر کا معاملہ نہیں رہا۔ قابل دخل اندازی پولیس کیس بن چکا ہے۔ آپ کی بیٹی میرے تھانے کی حدود میں قتل ہوئی ہے۔ آپ قانونی کارروائی کے راستے میں روک نہ بنیں اور میرے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں۔“

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ مولوی نور شاہ نے کہا ”آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ اس معاملے کو زیادہ کریدیں گے تو ہماری رسوائی ہوگی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اب یہ معاملہ دب نہیں سکتا مولانا۔ آپ اپنے رشتے داروں اور محلے والوں کو عابدہ کی گمشدگی کی بارے میں کیا بتائیں گے؟“

”میں نے یہ بات مشور کر دی ہے کہ وہ اپنے ماموں کے پاس کبیر والا گئی ہوئی ہے۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

میں نے اسے نفرت آمیز نظروں سے دیکھا پھر کہا ”آپ ماشاء اللہ خاصے دین دار آدمی ہیں۔ آپ کو یہ بات تو معلوم ہی ہوگی کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ آپ کس کس کا منہ بند کریں گے؟“

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا ”عزت دار آدمی کو عزت بچانے کے لئے کبھی کبھی جھوٹ کا سارا بھی لینا پڑتا ہے تھانے دار صاحب۔“

”مولوی صاحب، عزت جھوٹ سے نہیں بچ سکتی ہے۔ جھوٹ بول کر وقتی طور پر تو کسی برائی پر پردہ ڈال سکتے ہیں لیکن خود کو بدنامی سے نہیں بچا سکتے۔ بعد میں جب جھوٹ کا پول کھلتا ہے تو انسان کی دنیا میں بھی رسوائی ہوتی ہی اور وہ اپنی عاقبت بھی خراب کرتا ہے۔“

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مولوی نور شاہ ایک دم غڑھال نظر آنے لگا پھر وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چمپا کر بولا ”یا اللہ میرے گناہ معاف کرنا۔ تو جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ میں ان معاملات میں خود کو بری قرار دیتا ہوں۔ میری بیٹیوں نے مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ یا اللہ مجھے اٹھالے۔ اب مجھ سے اور ذلت برداشت نہیں ہوتی۔“ پھر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

میرے ذہن میں ابھی تک خالدہ پروین کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ”مجھے پہلے ہی پتہ تھا، کوئی گڑبڑ ضرور ہو جائے گی۔ میرے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوا تھا۔ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔“ خالدہ نے اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ آپ کی تختیوں نے اس گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔

اس سے ایک بات واضح ہو جاتی تھی کہ خالدہ اپنی بہن کے پروگرام سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عابدہ کیا کرنے جا رہی تھی.... اور ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ خود اس کی ساتھ بھی پیش آچکا تھا۔ جہاں تک گھر کے جہنم بنانے کا تعلق تھا تو وہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ مولوی نور شاہ جیسے لوگ بعض اوقات نیکی اور شریعت کے نام پر ظلم کی حدود سے بھی گزر جاتے ہیں۔

میں نے کہا ”مولوی صاحب، لگتا ہے آپ کو عزت راس نہیں آ رہی۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کو گرفتار کر سکتا ہوں لیکن میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔ عابدہ نے جن حالات میں گھر چھوڑا تھا اس کی تفصیلات مجھے بتائیں تاکہ میں اس کے قاتل کو فو اگرقتار کر سکوں۔“

”کاش مجھے اس بد بخت کے عزائم کی خبر ہو جاتی۔“ مولوی نور شاہ نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا ”اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ عابدہ بھی خالدہ کی طرح میرا منہ کالا کرے گی تو میں راتوں رات اس کے ٹکڑے کر کے صحن میں دبا دیتا۔“

”بس کریں اباجی۔“ خالدہ نے چیخ کر کہا ”میرا منہ نہ کھلوائیں ورنہ جس عزت کا آپ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں، وہ خاک میں مل جائے گی۔“

”وہ تو تم دونوں نے خاک میں ملا ہی دی ہے۔ اب کون سی کسریاں ہیں۔“ مولوی نور شاہ نے غضب ناک نظروں سے بیٹی کو گھورا۔

خالدہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”میں نے جو کچھ کیا تھا، وہ اپنے حالات سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ آپ کی حد سے بڑھی ہوئی تختیوں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ دیے تو آپ آخرت کے عذاب سے بہت ڈرتے ہیں لیکن آپ نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے میری زندگی واقعی عذاب بنا دی تھی۔ اس لئے مجھے وہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔“

”اور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا۔“ مولوی نور شاہ نے حقارت آمیز نظروں سے خالدہ کی جانب دیکھا ”چھوٹی کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔“

خالدہ کے چہرے پر کرب کی نمائندہ لکیریں نمودار ہوئیں۔ ”میری تو قسمت ہی خراب تھی اس لئے وہ دھوکے باز نذا حسین آسانی سے بچ نکلا لیکن.... پھوری اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے گا۔“

میں نے حیرت سے خالدہ کو دیکھا۔ وہ میرے لئے معلومات کا ذخیرہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے فوراً سوال کیا۔ ”یہ پھوری اور نذا حسین کون ہیں؟“

”کوئی نہیں ہیں.... کوئی نہیں ہیں۔“ بوڑھا نور شاہ فوراً بول اٹھا ”کسی کی برائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اپنی مرغی ٹھیک ہو تو پرانے گھر اڑا ہی کیوں دے۔“

خالدہ کے چہرے پر ایک موہوم سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک ایسا چہرہ تھا جو تنبیہ اور سختیوں کے سبب مسکراتا بھول گیا تھا۔ اس نے نہایت ہی تھکے لہجے میں کہا۔ ”میں تھانے دار صاحب سے کوئی بھی بات نہیں چھپاؤں گی۔ میری پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ عابدہ کا قاتل جلد از جلد پھانسی لگ جائے۔“

میں نے پوچھا ”تمہارے خیال میں عابدہ کو کس نے قتل کیا ہے؟“

”پھوری کے سوا اور کون ہو سکتا ہے!“

”پھوری.... یہ کون ہے بھئی؟“

مولوی نور شاہ نے بتایا ”میری چھوٹی سالی صفیہ فاطمہ کا بیٹا ہے۔ اس کا نام تو غفور ہے لیکن مشہور پھوری ہی ہے۔ بڑا لچا لنگا لڑکا ہے۔“

میں نے کہا ”مگر عابدہ تو ماسٹر جمیل بہار کی ساتھ فرار ہوئی تھی؟“

”میں کسی پر الزام لگانا گناہ سمجھتا ہوں۔“ مولوی نور شاہ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”میں نہیں جانتا کہ وہ کس کے ساتھ گھر سے بھاگی ہے۔ ابھی آپ ہی نے بتایا ہے اور خالدہ کی باتوں سے بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ وہ اس فرار سے واقف تھی۔ میرا اللہ مجھے معاف کرے۔ جمیل بہار تو بہت ہی شریف شخص تھا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ اس نے ایسی حرکت کی ہوگی۔“

خالدہ تریخ کر بولی ”آپ جسے شریف کہہ رہے ہیں، کیا اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنے پر تیار ہو جاتے؟“

”ہرگز نہیں۔“ مولوی نور شاہ نے قطعیت سے کہا۔ ”شریف ہونا اور بات ہے لیکن میں ایسے کسی بھی شخص کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا جو داڑھی منڈواتا ہو اور پانچ وقت کا نمازی نہ ہو۔“

”چاہے ایسے رشتے کے انتظار میں بیٹیاں گھر میں بیٹھی بوڑھی ہو جائیں؟“ خالدہ کے لہجے سے زہر کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

مولوی نور شاہ نے کہا ”مجھے مر کر خدا کو جواب دینا ہے۔ مجھے بیٹیوں کو گھر پر بٹھائے رکھنا گوارا ہے لیکن میں جب بھی ان کی شادی کروں گا تو کسی دین دار شخص ہی سے کروں گا۔“

میں نے کہا ”خدا کا خوف کریں مولوی صاحب۔ بالغ بیٹی کو گھر میں بٹھائے رکھنا عذاب الہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔“

”یہ صرف دوسروں کو خوف خدا دلاتے ہیں۔“

”چپ کر گستاخ!“ مولوی صاحب طلق کے بل جھٹے ”تیرے جیسی منہ کالک بیٹیوں کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہیں نہیں ہے۔“

مجھے بڑھے مولوی پر بے انتہا غصہ آیا لیکن میں نے خود پر قابو رکھا۔ میں خواہ مخواہ دین کے معاملات میں الجھ کر بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

مولوی نور شاہ جیسے لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں۔ وقتی طور پر دوسروں کے دلائل سے قائل تو ہو جاتے ہیں لیکن کرتے وہی ہیں جو ان کے ذہن میں سما چکا ہوتا ہے۔

میری یہاں آمد کا مقصد نور شاہ کی اصلاح نہیں تھا اس لئے میں فوراً اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

میں نے خالدہ سے پوچھا ”تم نے بتایا ہے کہ عابدہ کو پھوری کے سوا اور کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ پھوری کی عابدہ سے کیا دشمنی تھی؟“

”دشمنی تھی، بڑی گہری دشمنی جناب!“ خالدہ نے بتایا ”عابدہ نے ایک موقع پر اسے بری طرح بے عزت کر دیا تھا۔“

”کیوں؟“

”وہ عابدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ خالدہ نے کہا ”لنگور نے شاید کبھی آئینے میں اپنی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔“

”وہ عابدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ”پھر کیا ہوا تھا؟“

خالدہ نے کہا ”ہونا کیا تھا؟ یہ شادی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“

”کیا مطلب؟“

خالدہ سے پہلے نور شاہ بول اٹھا ”پھوری عابدہ کا رضاعی بھائی ہے جناب۔ پیدائش کے وقت پھوری کی والدہ صفیہ فاطمہ کا انتقال ہو گیا تھا چنانچہ میری بیوی رقیہ فاطمہ نے پھوری کو چند روز اپنا دودھ پلایا تھا۔“

میں نے کہا ”کیا یہ بات پھوری کو معلوم نہیں تھی کہ عابدہ اس کی رضاعی بہن ہے۔ اس کی شادی عابدہ کے ساتھ نہیں ہو سکتی؟“

”اس کو یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔“ خالدہ نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا ”یہ بات تو مجھے بھی اس وقت معلوم ہوئی تھی جب پھوری نے عابدہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس موقع پر ابا جی نے بتایا تھا کہ پھوری نے میری ماں کا دودھ پیا ہوا ہے۔“

”کمال ہے۔“ میں نے کہا ”اتنی بڑی بات سے تم بے خبر رہیں؟“

”ایک میں ہی کیا سب بے خبر تھے۔“ خالدہ نے کہا ”وہ تو جب ابا جی نے انکشاف کیا تو کسی کو یقین ہی نہیں آیا۔ سب سے زیادہ بے یقینی کا شکار غفور عرف پھوری تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مولوی نور شاہ نے رشتے سے انکار کرنے کے لئے یہ سارا چکر چلایا تھا۔“

میں نے خالدہ سے پوچھا ”تمہاری ماں نے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا؟“

میرے منہ سے اپنی ماں کا نام سن کر وہ افسردہ ہو گئی پھر غم ناک لہجے میں بولی ”کاش



ہماری ماں زندہ ہوتی تو ہمیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتے۔“ پھر ذرا توقف کے بعد اس نے بتایا۔  
 ”عابدہ ایک سال کی تھی جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ میری عمر لگ بھگ چھ سال ہوئی  
 اس وقت۔ پھوری کی والدہ تو اسے جہنم دیتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس بات کو کئی  
 سال گزر گئے ہیں۔“

میں نے خالدہ کے باپ سے پوچھا ”مولوی صاحب“ آپ نے بھی کبھی اپنی بیٹیوں کو  
 نہیں بتایا کہ پھوری ان کا رضاعی بھائی ہے؟“  
 وہ ڈھٹائی سے بولا ”کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اور جب ضرورت پیش آئی تو میں  
 نے سب کو بتا دیا۔“

”نور شاہ صاحب!“ میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا ”یہ کیوں نہ  
 سمجھا جائے کہ آپ نے محض پھوری کو جواب دینے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا تھا؟“  
 ”وہ طعون شیطان بھی یہی سمجھتا ہے۔“ اس نے برا سامنہ بنایا ”لیکن مجھے اپنی قبر میں  
 جانا ہے۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“  
 ”کیا آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں؟“  
 ”کون سا دعویٰ؟“

”یہی کہ.... غفور عرف پھوری نے آپ کی بیوی کا دودھ پیا تھا؟“  
 وہ برہمی سے بولا ”دائی بشیراں اس کی گولہی دے سکتی ہے۔ پھوری کی پیدائش دائی  
 بشیراں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔“

”دائی بشیراں سے بھی ہم تصدیق کریں گے۔“ میں نے اسے گھورا۔  
 وہ بولا ”آپ جہاں جہاں مرضی تصدیق کریں، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔“ ایک لمحے  
 کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”ویسے میں آپ کو ایک بات بتا دوں اور وہ یہ کہ اگر پھوری  
 عابدہ کا رضاعی بھائی نہیں بھی ہوتا تو میں ہرگز اسے اپنی بیٹی نہ دیتا۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ پھوری کو بے وجہ آپ پر شک نہیں ہے؟“

خالدہ نے کہا ”تھانے دار صاحب“ پھوری انتہائی اوباش قسم کا نوجوان ہے۔ وہ کسی بھی  
 طرح عابدہ کے قاتل نہیں تھا۔ وہ تو بس ہاتھ دھو کر عابدہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ رضاعی بھائی  
 والے معاملے کو وہ اباجی کا پروپیگنڈا کرتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے عابدہ کا راستہ روکنے کی  
 کوشش بھی کی تھی لیکن عابدہ نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ ایک موقع پر پھوری نے  
 جب عابدہ کی کلائی تھامنا چاہی تو عابدہ نے اس کے منہ پر ایک زنائے دار تھپڑ رسید کر دیا

تھا۔ عابدہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ کئی لوگوں کی موجودگی میں پھوری کے منہ پر تھوک  
 بھی دیا تھا۔

جواباً پھوری نے سہکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا ”میں اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا  
 عابدہ۔ دیکھ لیتا“ ایک دن تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔“

عابدہ نے تیز آواز میں کہا ”بے عزتی ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔ میں نے  
 تو تمہارے جیسا بے غیرت انسان آج تک نہیں دیکھا جسے اپنی بسن کی عزت کا بھی کوئی خیال  
 نہ ہو۔“

”اوندہ بن!“ پھوری نے ایک جانب تھوکتے ہوئے کہا ”یہ لفظ میرے لئے گلاب بن گیا  
 ہے۔ میری کوئی بسن نہیں ہے۔ یہ سب تمہاری باپ کی سازش ہے۔ ویسے بھی بسن وہی  
 ہوتی ہے جو اپنی ماں کے پیٹ سے جنم لے، باقی سب رشتے فضول ہیں۔“

”تمہارے کہنے سے اسلام کا اصول غلط نہیں ہو جائے گا۔“ عابدہ نے پرجوش لہجے میں  
 کہا ”ہمارا دین ہمیں بتاتا ہے کہ رضاعی بسن بھائیوں کی آپس میں شادی نہیں ہو سکتی اور....  
 اگر ایسا نہیں بھی ہوتا یعنی تم میرے لئے ناعرم ہوتے جب بھی میں تم سے شادی کا تصور  
 بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی منحوس  
 شکل نہ دکھانا۔“

”یہ تم نہیں بول رہی ہو عابدہ۔“ پھوری نے سنسنی خیز لہجے میں کہا ”بلکہ تمہارے دل  
 دماغ پر ماسٹر جمیل چھایا ہوا ہے۔“

عابدہ نے دہاڑ کر کہا ”اپنی ٹپاک زبان بند رکھو۔“  
 ”تم تو سمجھ رہی ہو گی کہ مجھے کوئی خبر ہی نہیں ہے۔“ پھوری نے انکشاف کرنے  
 والے انداز میں کہا ”لیکن میں تمہاری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔“

”کواس بند کرو اور اپنا راستہ ٹاپو۔“ عابدہ نے تنبیہی لہجے میں کہا ”اگر تم نے آئندہ  
 مجھ پر کچھ اچھالنے کی کوشش کی تو اپنے انجام کو نہ بھولنا۔“

”مجھے انجام کی دھمکی نہ دو عابدہ، میں کسی دھمکی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ آخر تم میرا کیا  
 بگاڑ لو گی؟“

عابدہ نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا ”جب کچھ بگڑ جائے گا اس وقت پتہ چلے گا طرم  
 خان۔“

”تم کون سا تیر مار لو گی؟“

جی، آپ بڑے دین دار بننے ہیں لیکن آپ کے عمل سے دین داری ظاہر نہیں ہوتی۔ خدا پیش میں آنے والے مغرور لوگوں کو ناپسند فرماتا ہے۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کرتا اور انہیں خواستواہ مارنے پیٹنے کو دوڑتا ہے، وہ خدا کے قہر کا مستحق ٹھہرتا ہے۔“

”آپ مارنے کی بات کر رہے ہیں۔“ نور شاہ نے تیز آواز میں کہا ”میرا تو بس نہیں چٹا کہ ان کو قتل ہی کر دوں“

”مولوی صاحب!“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”خدا نے والدین کو کب اجازت دی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کسی غلطی پر انہیں قتل کر دیں؟“

”غلطی!“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا ”میری نظر میں یہ گناہ کبیرہ ہے کہ کوئی لڑکی گھر سے بھاگ جائے۔ پہلے یہ بڑی گھر سے بھاگی اور ذلیل و رسوا ہو کر واپس آئی، اب چھوٹی بھی اس کے نقش قدم پر چلتی ہوئی موت کی منہ میں چلی گئی۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خالدہ اس بارے میں سب کچھ جانتی تھی لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا حتیٰ کہ عابدہ کے خط کا بھی ذکر نہیں کیا۔“

قارئین! آپ خالدہ کے گھر سے بھاگنے کے ذکر سے بار بار الجھ رہے ہوں گے۔ آپ کی الجھن کے پیش نظر میں مختصراً اس بارے میں عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ اس واقعے کا موجودہ کیس سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

کچھ سال قبل خالدہ فدا حسین نامی ایک شخص کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ وہ خانوالا سے سیدھے لاہور پہنچے تھے۔ خالدہ کے گھر سے بھاگنے کی سب سے بڑی وجہ مولوی نور شاہ کا نامناسب رویہ ہی تھی۔ اس کی عمر تیزی سے بڑھ رہی تھی لیکن نور شاہ کو اسکی شادی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا کوئی رشتہ نہیں آتا تھا بلکہ جو بھی رشتہ آتا تھا، مولوی نور شاہ اس میں کوئی نہ کوئی نقص تلاش کر لیتا تھا۔ اسے جس معیار کا دین دار لڑکا درکار تھا، وہ چراغ لئے ڈھونڈے نہیں ملتا تھا۔ اپنے باپ کے اس غیر حقیقت پسندانہ رویے نے خالدہ کے اندر بغاوت کے جذبات کو جنم دیا۔

اسی محلے میں ایک شخص فدا حسین رہتا تھا۔ جانے کس طرح خالدہ سے اس کی علیک سلیک ہو گئی۔ خالدہ اسے اپنے گھریلو مصائب سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اس اللہ کے بندے نے خالدہ کے مسائل کا حل یہ پیش کیا کہ اسے گھر سے بھاگنے کا ہشورہ دیا۔ خالدہ کے ذہن میں باغی سوچوں کی یلغار تھی۔ اس نے اس فعل کے مضمرات کو پس پشت ڈال کر فدا حسین

”وقت آنے پر بتاؤں گی۔“ عابدہ نے گھر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پھوری نے پیچھے سے کہا ”اگر تم بھی خالدہ کے نقش قدم پر چلنے کے بارے میں سوچ رہی ہو تو یاد رکھو، میں تمہیں اس مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے پل پل کی خبر رہتی ہے۔“

”میری جوتی کو پرواہ ہے۔“

”پروا تو تمہیں کرنا پڑے گی عابدہ۔“ پھوری کے لہجے سے سنگینی نپک رہی تھی۔ ”م صرف اور صرف میری بیوی بنو گی ورنہ....“

”ورنہ تم کیا کر لو گے؟“

وہ زہر آلود مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا ”میں بھی وقت آنے پر ہی بتاؤں گا۔“

خالدہ کی طویل وضاحت ختم ہوئی تو میں نے استفسار کیا ”تمہارا خیال ہے کہ پھوری نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عابدہ کو قتل کر دیا۔“

”خیال نہیں، بلکہ مجھے یقین ہے۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اس یقین کی وجہ؟“

”ٹھہرس، میں ابھی آتی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ کسی اندرونی کمرے کی جانب چلی گئی۔

منٹ بعد وہ واپس آئی اور ایک تہ شدہ کانفڈ میری طرف بڑھا دیا۔

”یہ ہے میرے یقین کا ثبوت!“

میں نے وہ کانفڈ کھول کر پڑھا۔ وہ ایک خط تھا جو عابدہ نے اپنی بڑی بہن خالدہ کے نام بھیجا تھا۔ خالدہ نے کہا ”چند روز قبل عابدہ کا یہ خط مجھے ڈاک کے ذریعے موصول ہوا ہے۔ اس نے یہ خط مجھے شور کوٹ سے لکھا تھا۔ آپ اسے پڑھ لیں۔ میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔“

بوڑھے نور شاہ کو اچانک جوش آگیا ”احسان فراموش!“

اس نے خالدہ کو غصیلی نظروں سے گھورا ”میرے ہی گھر میں یہ کچھری پکتی رہی اور مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ میں تم دونوں کے لئے اپنے آرام کی پرواہ نہیں کرتا ہوں۔ تمہیں دنا کا ہر آرام دے رکھا ہے اور تم میری عزت کو یوں نیلام کرتی پھر رہی ہو۔“ پھر وہ اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا۔

میں نے نور شاہ کے دست دراز کو روکا اور اسے واپس اپنی جگہ پر بٹھا دیا پھر کہا ”شاہ

کے ساتھ گھر سے فرار ہونے کا فیصلہ کر ڈالا اور پھر اپنے فیصلے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ لاہور میں وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ پولیس کے ہتھتہ چڑھ گئے۔ حسین خاصا بودا ثابت ہوا اور اس نے سارا الزام خالدہ کے سر ڈال دیا۔ اس کا کہنا تھا خالدہ اسے ورغلا کر لائی ہے۔ خالدہ اس اچانک آنے والی مصیبت سے بوکھلا گئی لیکن اس فدا حسین پر الزام تراشی سے پرہیز کیا اور مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی خاموشی پولیس نے فدا حسین کی سچائی سمجھا اور دونوں کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔ اس زمانے میں قانون اتنا سخت نہیں ہوتا تھا۔ بس مفروضہ جوڑے کو پکڑ کر حوالات بند کر دیا جاتا تھا اور ان کے ورثا کو اطلاع بھیج دی جاتی تھی کہ وہ انہیں آکر چھڑالیں۔ کل تو پولیس ایسے جوڑوں کو پکڑتے ہی حدود آرڈیننس کے تحت چالان کر دیتی ہے اور بھی خاصی سخت ہے۔

قصہ مختصر، خالدہ بھی واپس آ گئی۔ سب لوگوں نے مولوی نور شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ حسین سے خالدہ کی شادی کر دے۔ خالدہ، فدا حسین کی بے وفائی اور بزدلی کے باوجود اس سے شادی کو تیار تھی لیکن نور شاہ مارنے مرنے پر قن گئی۔ وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ میں فدا حسین جیسے فاسق و فاجر اور گناہگار شخص کو اپنی بیٹی کا ہاتھ کس طرح دوں؟ میں جیتے جی ایسا نہیں ہونے دوں گا!

خالدہ نے تو محض اس لئے فدا حسین سے شادی کی آمادگی ظاہر کر دی تھی کہ وہ دامن پر لگے ہوئے بدنامی کے داغ کو دھونا چاہتی تھی لیکن باپ نے اسے اس کا موقع بھی دیا۔ اگر فدا حسین کے ساتھ اس کی شادی ہو جاتی تو اس کے جرم کی سنگین کم ہو سکتی تھی بصورت دیگر اب حال یہ تھا کہ اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں آ رہا تھا۔ اگر بھولے بھٹکے کوئی بھی جاتا تھا تو مولوی نور شاہ اسے فوراً مسترد کر دیتا تھا۔

اس صورت حال میں عابدہ کو ایک فی صد بھی امید نہیں تھی کہ اس کا باپ مباشرت سے اس کی شادی کے لئے تیار ہو جائے گا چنانچہ اس نے بھی وہی کیا جو اس کی سمجھ آ یا۔ خالدہ اس کی رازدار تھی۔ وہ مباشرت جیل پر بھی بھروسہ کرتی تھی۔ اسے صد فی صد یقین تھا کہ وہ فدا حسین کی طرح بزدل ثابت نہیں ہو گا مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ اس قسمت میں یونہی دردناک موت سے دوچار ہونا رقم تھا۔

مولوی نور شاہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا اور بار بار کھا جانے والی نظروں سے خالدہ گھور رہا تھا۔ خالدہ جو پہلے خوف زدہ دکھائی دیتی تھی، اب اس کا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔

نے اپنی نظریں خط کے مضمون پر جمادیں۔ عابدہ نے لکھا تھا۔ ”بانی، میں نے اتنا بڑا قدم تو اٹھالیا ہے لیکن ہر وقت ایک عجیب سا دھڑکا لگا رہتا ہے۔“

جیل پر تو مجھے پورا اعتماد ہے لیکن مجھے ایک وہم سا ہو گیا ہے۔“ آگے اس نے اپنے وہم کی وضاحت کی تھی ”آپ جانتی ہیں، ہم نے لاہور جانے کا پروگرام بنایا تھا لیکن خانیوال اسٹیشن پر ہی ہمیں اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ میں نے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی میں سوار ہوتے وقت پھوری کی جھلک دیکھ لی تھی۔ میں نے جیل کو اس بارے میں بتایا لیکن اس نے اسے میرا وہم قرار دیا مگر میں بضد رہی۔ مجبوراً جیل کو میری بات ماننا پڑی اور گاڑی کی روانگی سے چند لمحے پہلے ہم نیچے اتر آئے۔“

”گاڑی روانہ ہو گئی۔ جیل نے متلاشی نظروں سے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا لیکن پھوری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ گاڑی ہی میں رہ گیا ہے۔ لاہور جانے والی کوئی دوسری گاڑی آنے میں خاصا وقت تھا۔ ہم پلیٹ فارم پر رک کر کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جھنگ جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ جیل نے کھڑکی سے ٹکٹ خریدے اور ہم اس گاڑی میں سوار ہو گئے۔ لاہور جانا اب اس لئے بھی خطرناک تھا کہ پھوری بھی اسی جانب گیا تھا۔ مجھے اس کی دھمکی اچھی طرح یاد تھی۔“

”گاڑی پیر محل کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو میں نے ایک ایسا نظارہ دیکھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے پھوری کو ہاتھ روم سے نکل کر دوسری بوگی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ میں نے فوراً جیل کو بتایا۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ جیل نے کہا ”اپنے ذہن میں سے ہر قسم کے خدشات نکال دو۔ اس طرح تو تم پاگل ہو جاؤ گی۔“

میں نے کہا ”تم یقین کرو جیل، وہ پھوری ہی تھا۔“ ”پچھان میں جا کر دیکھتا ہوں۔“ جیل نے میری تسلی کی خاطر کہا اور دوسری بوگی میں جھانک آیا ”مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔“ میں نے لجابت آمیز لہجے میں کہا ”تم ایک بار میری بات مان لو۔ ہم یہیں اتر جاتے ہیں۔ ٹرین میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔“ ”پھر کس میں سفر کریں گے؟“

میں نے کہا ”میرا خیال ہے، ہمیں بس میں سفر کرنا چاہئے۔ بس کے تمام مسافر نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ کوئی گریبڑ ہوتی تو ہمیں فوراً پتہ چل جائے گا۔“

پڑوسی تھا اس لئے میل ملاقات میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔“  
مولوی نور شاہ نے آتش بار نگاہوں سے خالدہ کو دیکھا مگر وہ ان نگاہوں کی پرواہ کئے بغیر  
بولتی رہی ”جیل اور عابدہ میں یہ بات پہلے ہی طے ہو گئی تھی کہ وہ یکم جون کو اپنے گاؤں  
چلا جائے گا تاکہ کسی کا دھیان اس کی طرف نہ جائے۔ تین جون کو ایک مخصوص وقت پر  
انہوں نے اسکول کے پاس ملنے کا پروگرام طے کیا تھا۔“  
”یا اللہ! تو گواہ رہنا۔“ مولوی نور شاہ نے پرسوز لہجے میں کہا ”میں اس گناہ میں شریک  
نہیں ہوں۔“

میں نے نور شاہ کو نظر انداز کرتے ہوئے خالدہ سے پوچھا۔ ”اس کے بعد بھی تمہیں  
کوئی خط ملا ہے؟“

”نہیں جناب، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔“  
میں نے سوچتے ہوئے کہا ”اس کا مطلب ہے، وہ شور کوٹ میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکے  
تھے۔ میری معلومات کے مطابق وہ دونوں آٹھ جون کو حویلی بہادر پہنچے تھے۔ اگر وہ شور کوٹ  
سے جنگ کے لئے بھی روانہ ہوئے تھے تو حویلی بہادر میں اتر جانا غیر معمولی بات ہے۔  
(واضح رہے کہ حویلی بہادر ”جھنگ شور کوٹ“ روڈ پر تریوں ہیڈ ورکس کے نزدیک ہی واقع  
ہے) راستے میں اتر جانے کا ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے کہ پھوری ان کے تعاقب میں  
بدستور محو سفر تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ خالدہ نے کہا ”اور وہی غیث میری بہن کا قاتل ہے۔“  
میں نے کہا ”جیل بھی لاپتہ ہے۔ میں کل ہی اس کی تلاش میں تلمبہ جاؤں گا۔ وہ مل  
جائے تو صورت حال واضح ہوگی۔“ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ”غفور عرف  
پھوری تو اسی محلے کا رہنے والا ہے۔ کیا وہ بھی غائب ہے؟“

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ میرے ہر سوال کا جواب صرف خالدہ  
ہی دے رہی تھی۔ مولوی نور شاہ غصے سے چیخ و تاب کھانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا  
تھا۔ وقفے وقفے سے وہ خود کلامیہ انداز میں خدا کو یہ یقین دلاتا جاتا تھا کہ وہ سراسر بے قصور  
ہے۔

خالدہ نے جواب دیا ”وہ خنزیر اسی روز سے غائب ہے۔ یعنی تین جون سے۔ پہلے تو میں  
نے اس کی غیر حاضری کو قابل توجہ نہیں سمجھا کیونکہ وہ جس قماش کا آدمی ہے ایسے لوگ  
آوارہ گردی میں مصروف رہتے ہیں۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں لیکن جب سے عابدہ کا خط مجھے ملا

”تمہاری بات تو معقول ہے۔“ جیل نے تائیدی لہجے میں کہا۔

”پھر ہم گاڑی کے چلتے سے پہلے ہی پیر محل ریلوے اسٹیشن پر اتر گئے۔ وہاں سے  
سیدھے بسوں کے اڈے پر پہنچے اور شور کوٹ جانے والی پہلی بس میں سوار ہو گئے۔“  
میں نے جیل سے پوچھا۔ ”ہم تو جھنگ جا رہے تھے۔ پھر شور کوٹ والی بس میں  
بیٹھ گئے؟“

جیل نے کہا ”اگر تمہارے شک میں ایک فی صد بھی حقیقت کا عنصر شامل ہے تو  
ہمیں راستہ بدل کر سفر کرنا چاہئے حالانکہ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف تمہارا وہم ہے۔ پھر  
ہمارے تعاقب میں نہیں ہے۔ ویسے ہم شور کوٹ سے بذریعہ بس جھنگ بھی جاسکتے ہیں  
بعد کی بعد میں سوچیں گے۔“

”میں مطمئن ہو گئی۔ میرے اطمینان کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جب بس  
ہوئی تو اس کے مسافروں میں پھوری شامل نہیں تھا۔“  
”میری پیاری بہن! میں تمہیں یہ تفصیلی خط شور کوٹ ہی سے لکھ رہی ہوں۔  
قسمت میں کیا لکھا ہے، یہ تو میں نہیں جانتی البتہ ایک خوف مسلسل میرے ساتھ  
ہے۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ پھوری کی وحشت ناک آنکھیں سائے کی طرح  
تعاقب کر رہی ہیں۔ میرے حق میں دعا کرتا۔ تمہاری بہن.... عابدہ پروین....“  
خط پر تاریخ بھی درج تھی جو پانچ جون کی تھی۔ میں نے خط کو تہ کر کے جیب میں  
اور خالدہ سے پوچھا۔

”عابدہ اور جیل کس تاریخ کو یہاں سے روانہ ہوئے تھے؟“  
اس نے جواب دیا ”تین جون کو۔“

مجھے ہیڈ ماسٹر کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ ماسٹر جیل بہار یکم جون کو اپنے گاؤں  
گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ دوبارہ خانیوال آیا تھا۔ میں نے اس امکان کو ذہن  
رکھتے ہوئے کہا۔

”خالدہ، مجھے پتہ چلا ہے کہ جیل یکم جون کو تلمبہ چلا گیا تھا۔ کیا وہ تین جون کو  
آیا تھا کیونکہ عابدہ پروین کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خانیوال اسٹیشن سے فرار  
تھے؟“

وہ بولی ”جب عابدہ ہی نہیں رہی تو میں کوئی بات چھپا کر کیا کروں گی۔“ کچھ دیر  
کر کے وہ الفاظ کا انتخاب کرتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی ”جیل چونکہ

تھی، اس کا خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔  
میں نے مولوی نور شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے عابدہ پروین کی گمشدگی کی رپورٹ کیوں نہیں درج کروائی تھی؟“  
وہ عجیب سے لہجے میں بولا ”میں نے تو اس کے جانے کے بعد بھی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔“ اس نے خالہ کی جانب اشارہ کیا۔

”کیوں؟ آخر کیوں؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔  
وہ بولا ”میں نے زندگی بھر محنت کر کے عزت بنائی ہے۔ تھانے پکھری کے چکر کاٹ کر میں اسے برباد نہیں کر سکتا۔“

”بہت خوب جواز ہے!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”مولانا، آپ کو تو دعویٰ ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کو بہت چاہتے ہیں۔ ان کے آرام و آسائش کے لئے آپ نے اپنا آرام و سکون بچ دیا ہے۔ کیا یہی آپ کی محبت ہے؟“

وہ خالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”آپ پوچھیں اس سے، آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ میں نے ان کی کون سی ضرورت پوری نہیں کی!“

میں نے غصے سے کہا ”ٹھہریں“ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ نے ان کی کون سی ضرورت پوری نہیں کی۔ ابھی انہوں نے اچھی طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماں کی آنکھ ان سے چھن گئی۔ آپ کو چاہئے تھا کہ پر راز شفقت کے ساتھ انہیں ماں کی محبت بھی دیتے لیکن آپ نے کیا کیا؟ آپ کی بے جا سختیوں نے ان کا معصوم بچپن چھین لیا، آپ کے رویے نے ان کی انا کو مجروح کر دیا، ان کی عزت نفس کو قدم قدم پر کچلا گیا۔ اگر اس گھر میں انہیں سکون کی فضا میسر ہوتی تو وہ گھر سے باہر قدم نکالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ خالہ سے ایک بھول ہو گئی تھی۔ آپ کو چاہئے تھا کہ اسے معاف کر دیتے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے کہ عابدہ موت کے منہ میں جانے سے بچ جاتی۔ کیا آپ نے انہیں کبھی محبت کی نظر سے بھی دیکھا ہے؟“

”میں نے ان سے جتنی محبت کی ہے، وہ میرا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا ”خدا تو ہر چیز بہتر ہی جانتا ہے مگر آپ کیا جانتے ہیں؟“

”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ انہوں نے میری محبت کے جواب میں مجھے شرمندگی کے

ہے اور اس نے پھوری کے تعاقب کا ذکر کیا ہے۔۔۔۔ اس وقت سے میں بہت پریشان ہوں۔“

میں نے پوچھا ”تمہیں یہ خط کب ملا تھا؟“  
اس نے جواب دیا ”دس تاریخ کو۔۔۔۔ دس جون کو۔“  
”اس خط کا لفظ کہاں ہے؟“

”وہ میں نے فوراً ہی پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔“ اس نے بتایا ”مجھے ڈر تھا کہ اگر اباجی کی نظر پڑ گئی تو راز فاش ہو جائے گا۔“

میں نے لفظ کے بارے میں اس لئے پوچھا تھا کہ ممکن تھا یہ خالہ ہی کی کوئی چال ہو۔ اس نے خود ہی خط لکھ مارا ہو اور ہماری تفتیش کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتی ہو لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

میں نے کہا ”خط کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی افزائش کے عالم میں سز کرتے ہوئے حویلی بہادر پہنچے تھے۔ ان حالات میں انہیں نکاح کرنے کا موقع نہ ملا ہو، لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا تھانے دار صاحب؟“ خالہ کے چہرے پر تشویش کا ایک سایہ سالہا گیا۔

”لیکن یہ کہ۔۔۔۔۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”عابدہ کے طبی تجزیے سے پتہ چلا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم تھے۔“

”یا میرے اللہ، مجھے موت دے دے۔“ مولوی نور شاہ دردناک آواز میں کراہا ”میرا اس گناہ میں شریک نہیں ہوں۔“

خالہ نے کہا ”تھانے دار صاحب، آپ نے بتایا ہے کہ وہ دونوں تقریباً پندرہ روز تک آپ کے علاقے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہے تھے۔ ممکن ہے اس دوران میں انہوں نے باقاعدہ شادی کر لی ہو۔“

”میرے ذہن میں بھی یہ امکان ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ان کے سامان میں سے نہ تو کوئی نکاح نامہ برآمد ہوا ہے اور نہ ہی مالک مکان نے ایسی کب بات کی تصدیق کی ہے بلکہ عابدہ نے مالک مکان کی بیوی کو بتایا تھا کہ انہوں نے گھر والوں سے چھپ کر شادی کی ہے اور حالات نارمل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

خالہ نے کچھ نہیں کہا، بے بسی سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میں اس کے اندر اٹھنے والی ندامت کے بلند و بالا طوفان کو محسوس کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں وہ کہہ بھی کیا سکتی

سوا کچھ نہیں دیا۔“

”آپ اسے محبت کہتے ہیں۔“ میں نے تجھے ہوئے لمحے میں کہا ”آپ کی جوان بہن بیٹی کو گھر سے گئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور آپ کے کان پر جوں تک نہ رنکی۔ بڑے اطمینان سے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہیں۔ آپ کا تو سینہ شکن ہر جانا چاہئے تھا میں آپ کو جانتا ہوں کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔“

ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میرے سرکاری کوارٹر کے نزدیک ہی ایک بلی نے بچے دیئے ہوئے تھے۔ ایک روز اتفاق سے ایک بچہ نانگے کے پئے کے پئے آکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس وقت بلی موقع پر موجود نہیں تھی۔ ایک موقع پرست کہ اس مردہ بچے کو منہ میں دبا کر چلتا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد بلی اپنے گمشدہ بچے کی تلاش میں زمین کا چپا چپا سوگھنے لگی۔ بالآخر وہ اس مقام پر آکر رک گئی جہاں اس کے بچے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ بلی کئی راتوں تک اس مقام کو سوگھتی اور بین کرتی رہی تھی۔ اس کی آواز میں جو درد تھا، وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایک معمول جانور اپنے سینے میں اولاد کے لئے کتنے شدید جذبات رکھتا ہے اور آپ اشرف المخلوقات ہر کر بھی اتنی بے حسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور.... یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ نے ان کو بہت محبت دی ہے؟“

میری جذبات انگیز تقریر کے جواب میں اس نے بس اتنا کہا ”میں نے ان دونوں پر فائدہ پڑھ لی ہے۔ ایسی اولاد سے تو انسان بے اولاد ہی اچھا ہے۔“

اس کی عمر کا لحاظ مانع تھا ورنہ میں اسے اٹھا کر تھانے میں بند کر دیتا۔ ایسے کٹر اور جنونی قسم کے متکبر لوگ خلق خدا کے لئے باعث آزار ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا سب گناہ کا نظر آتے ہیں۔ وہ مذہب اور شریعت کی آڑ میں لوگوں کی دل آزاری کرتے ہیں اور ان کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ وہ حقوق اللہ کی بجائے آوری میں حقوق العباد کو یک سر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ نہ دین کے رہتے ہیں اور نہ دنیا کے۔ دل کا گداز ختم ہو جائے تو انسان اور پتھر میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔

میں نے ناگواری سے نور شاہ کو دیکھا پھر کہا ”ہم نے عابدہ کو لاوارث سمجھ کر حویلی بہار کے قبرستان میں دفن کر دیا ہے۔ ہم نے احتیاطاً اسے امانتاً زمین کے حوالے کیا تھا۔ آپ چاہیں تو اس کی میت کو یہاں لا سکتے ہیں۔“

اس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ میں نے خالدہ سے پوچھا ”اس سورے پھوری

بدمعاش کا گھر کس طرف ہے؟“

”دوسری گلی میں چوتھا مکان ہے۔“ خالدہ نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے اے ایس آئی ظہور حسین سے کہا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

خالدہ نے کہا ”مجھے امید نہیں کہ وہ آپ کو گھر پر مل جائے۔ میں نے کافی عرصے سے اسے دیکھا نہیں ہے۔“

”وہ نہ ملا تو اس کے گھر والوں سے پوچھ گچھ کر لیں گے۔“ اے ایس آئی نے کہا پھر مولوی نور شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا ”بابا جی، یہ نہ سمجھتا ہم پھر نہیں آئیں گے۔ ہم تفتیش کے لئے کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔ ابھی ہم کچھ دن ادھر خانوال میں ہی رہیں گے۔ اپنا کام ختم کر کے ہی جائیں گے۔ مولوی صاحب! ہمارے جانے کے بعد اپنا غصہ خالدہ پر نہیں نکالنا۔ اگر مجھے اس سلسلے میں ذرا سی بھی شکایت ملی تو میں واقعی آپ کو گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی اور بے زاری سے مجھے گھورتا رہا۔ اس کے انداز میں شکست پائی جاتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس قسم کے لوگ آسانی سے ہار نہیں مانتے۔ ہم مقتولہ عابدہ پر دین کے گھر سے باہر نکل آئے۔



پھوری کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ خالدہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی چھوٹی خالہ صفیہ فاطمہ پھوری کو زندگی دے کر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ بعد ازاں پھوری کے باپ نے فضیلت بی بی نامی ایک عورت سے دوسری شادی کر لی تھی۔ فضیلت بی بی.... سے حبیب احمد کی چار اولادیں تھیں۔

مضبوط دروازے پر پہنچ کر اے ایس آئی نے دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھول دیا اور ہم پر نظر پڑتے ہی سوال کیا۔

”جی فرماؤ۔ کس سے ملنا ہے؟“

میں نے پوچھا ”غفور عرف پھوری کا گھر یہی ہے؟“

اس شخص نے برا سا منہ بنایا اور جواب دیا ”میں پھوری کا باپ ہوں۔ آپ کو کیا کام ہے اس سے؟“

”کام بہت ہی اہم ہے۔“ میں نے کہا ”وہ ہے کہاں، ذرا باہر تو نکالیں اسے۔“

کہا۔ ”لیکن قتل.... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اس حد تک بھی جاسکتا ہے۔ تھانے دار صاحب! آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”یہ مذاق نہیں ہے حبیب احمد۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تمہارا بیٹا عابدہ کا تعاقب کرتے ہوئے ہمارے علاقے میں پہنچا تھا۔ عابدہ قتل ہو چکی ہے اور پھوری غائب ہے۔“

اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے لجاجت آمیز لہجے میں کہا ”جناب“ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ آپ اندر بیٹھ کر بات کریں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

ہم اس کی فرمائش پر گھر کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا ”حبیب احمد“ میں نے سنا ہے، پھوری، عابدہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا؟“

”او جناب، وہ تو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ پھوری نے عابدہ کی ماں کا دودھ پیا ہوا ہے؟“

وہ جلدی سے بولا ”یہ سب نور شاہ کا چلایا ہوا چکر ہے۔“

”تو کیا پھوری، عابدہ کا رضاعی بھائی نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ پر خیال لہجے میں بولا ”ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے دائی بھیراں کی گواہی پر یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ چونکہ اس کی بیوی نے پھوری کو اپنا دودھ پلایا تھا اس لئے وہ رضاعی بہن بھائی ہو گئے ہیں۔“

”یعنی یہ صرف پروپیگنڈا ہے۔“ میں نے سوال کیا ”اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ جب پھوری پیدا ہوا تو میں گھر پر نہیں تھا۔“ حبیب احمد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ”ان دنوں میں کسی ضروری کام سے سرائے سیدھو گیا ہوا تھا.... اور جہاں تک مولوی نور شاہ کے پروپیگنڈے کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے، اس نے جو بھی کیا، ٹھیک ہی کیا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”اللہ جھوٹ نے بلوائے تھانے دار صاحب، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پھوری بری صحبتوں میں پڑ کر بہت بگڑ چکا ہے۔ کوئی بھی شریف آدمی اسے رشتہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی سوچا تھا کہ اگر اس کی شادی کر دی جائے تو

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ وہ آنکھیں سکڑ کر بولا ”آپ یہاں کے رہنے والے تو نہیں لگتے۔“

میں نے کہا ”تمہارا اندازہ درست ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں، تمہارے بیٹے کی خاطر۔“

بیٹے کے ذکر پر، اس کے چہرے پر ایک نامعلوم سی بے زاری پھیل جاتی تھی۔ اس نے کہا ”آپ کس سلسلے میں پھوری سے ملنا چاہتے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟“

”سلسلہ بھی بتا دیں گے۔ ذرا وہ ہاتھ تو چڑھ جائے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا اس نے پھر کوئی گڑبڑ کر دی ہے؟“

میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا ”ہم اسے ایک قتل کی سلسلے میں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ مولوی نور شاہ کی چھوٹی بیٹی عابدہ پروین کو ہمارے علاقے میں قتل کر کے بھاگا ہوا ہے۔“ آخری جملہ میں نے دانستہ بولا تھا۔ اس سے میرا ایک خاص مقصد وابستہ تھا۔

”مولوی نور شاہ کی بیٹی۔“ اس کا لہجہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”مگر وہ تو ایک ماہ سے کبیر والا گئی ہوئی ہے، اپنے ماموں کے پاس۔ نور شاہ نے تو مجھے یہی بتایا تھا۔“

”نور شاہ نے سب کو یہی بتایا ہوا ہے چاچا۔“ اے ایس آئی نے کہا۔

”مگر وہ جھنگ کس طرح پہنچ گئی؟“

میں نے کہا ”جس طرح خالدہ لاہور پہنچ گئی تھی۔“

”اوہ!“ اس نے ایک طویل سانس خارج کی ”آپ اندر آئیں۔“

میں نے کہا ”اندر آنے کی ضرورت نہیں ہے حبیب احمد! ہمیں پھوری کے بارے میں بتاؤ۔ ہم اسے بے تابی سے تلاش کر رہے ہیں۔“

”وہ کئی دن سے غائب ہے۔“ حبیب احمد نے بتایا۔

”کئی دن سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”میرا مطلب ہے، ایک ماہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔“

میں نے پوچھا ”اس نے بتایا تو ہو گا، کہاں جا رہا ہے؟“

”وہ کبھی بتا کر نہیں جانتا۔“ حبیب احمد نے جواب دیا۔ ”میں اس بد بخت کی حرکتوں سے بہت تالاں ہوں۔ آئے دن اس کی شکایتیں ملتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی سے جھگڑا کبھی کسی سے تنازع۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں اس کے کرتوتوں سے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے

”کیا مطلب؟“ حبیب احمد نے آنکھیں پھیلانیں۔  
اے ایس آئی نے جھٹتے ہوئے لہجے میں کہا ”چاچا“ لگتا ہے، تیرے ڈشبرے پترنے  
اے بھی کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔“  
”یعنی دہرا قتل!“ حبیب احمد نے سرا سید نظروں سے مجھے دیکھا۔  
”یہ تو پھوری ہی بتائے گا۔“

”آپ کو ماسٹر جمیل کی لاش بھی مل گئی ہے؟“  
میں نے کہا ”کل ہم ماسٹر جمیل کی تلاش میں تلب جائیں گے۔ اور اس کا کوئی سراغ  
نہ ملا تو اس صورت میں تمہارے بیٹے کی پوزیشن اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔“  
اے ایس آئی ظہور حسین نے کہا ”یہ تو پھوری ہی بتائے گا کہ اس نے ماسٹر جمیل کو  
قتل کر کے کہاں دبایا ہے۔“

حبیب احمد اب انتہا درجہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے کڑو توں سے واقف  
تھا لیکن اسے توقع نہیں تھی کہ پھوری قتل جیسے اقدام پر اتر آئے گا اور وہ بھی دہرا قتل۔  
اسکا پریشان ہونا بے جا نہیں تھا۔

میں نے پوچھا ”حبیب احمد، کیا تمہیں اندازہ ہے کہ پھوری کہاں جا سکتا ہے؟“  
”میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا ہے کہ وہ مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ پتا نہیں کس کس سے  
اس نے دوستیاں پال رکھی ہیں۔“ حبیب احمد نے جواب دیا۔  
”اس کے دوستوں کی بارے میں تو کچھ جانتے ہو گے؟“

”کوئی نہیں جانتا، بس وہی جانتا ہے۔“ حبیب احمد نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا  
”وہ بہت دور دور تک جاتا رہتا ہے۔ فاضل شاہ، احمد پور سیال، مہاراجا گڑھ اور اٹھراں  
ہزاری۔ پتا نہیں کہاں کہاں خواری کرتا پھرتا ہے۔ کبھی تو وہ دو دو ماہ تک گھر نہیں آتا۔“  
حبیب احمد نے جن جگہوں کے نام گنوائے تھے، انہیں سن کر میں چونک اٹھا۔ ان میں  
سے بیشتر علاقے جھنگ ضلع میں تھے۔ خاص طور پر اٹھراں ہزاری تو حویلی بمبار سے زیادہ دور  
نہیں تھا۔ یہ علاقہ دریا کی دوسری جانب جھنگ کے مغربی حصے میں واقع تھا۔

میں نے حبیب احمد سے کچھ اور سوالات بھی کئے مگر تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ وہ  
اپنے ناخلف بیٹے پھوری کی خفیہ سرگرمیوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ ایک فوری خیال کے  
تحت میں نے حبیب احمد سے پوچھا۔

”حبیب احمد! تمہارے پاس پھوری کی کوئی تصویر وغیرہ تو ہوگی؟“

ممکن ہے، وہ سدھر جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پھوری کی بس ایک  
ہی رٹ ہے کہ وہ ہر صورت میں عابدہ ہی سے شادی کرے گا۔“

”اور اگر عابدہ کی شادی اس سے نہ ہوئی تو وہ کسی اور سے بھی اس کی شادی نہیں  
ہونے دے گا۔“ میں نے کہا ”مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اس قسم کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا؟“  
”دھمکیوں کی بات اور ہے جناب لیکن وہ قتل نہیں کر سکتا۔“ حبیب احمد نے پورے  
وثوق سے کہا ”کیا آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے؟“

میں نے کہا ”مجھے ایسے شواہد ملے ہیں کہ پھوری عابدہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ باقی باتیں  
میں اسی سے اگلوں گا۔“

حبیب احمد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا ”عابدہ کس کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی؟“  
اب اس بات کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے مختصراً حبیب احمد کو بتا  
دیا۔ وہ افسوس ناک انداز میں سر ہلانے لگا پھر دھیمی آواز میں بولا۔  
”ماسٹر جمیل تو بڑا بلیا بندہ نظر آتا تھا۔“

میں نے اس کے خیالات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا پھوری پہلے بھی کبھی  
اتنے دنوں کے لئے غائب ہوا ہے؟“

”جی ہاں، اس کا یہی دتیرہ ہے۔“ حبیب احمد نے دکھی لہجے میں جواب دیا ”اس لڑکے  
نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایک دو بار حوالات کی ہوا بھی کھا آیا  
ہے۔“

”کس سلسلے میں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے بتایا ”لڑائی جھگڑے اور بلوے میں۔“

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے، بندہ عادی مجرم ہے!“

”چھوٹے موٹی گڑبڑ تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔“ حبیب احمد نے کہا ”قتل والی بات پر مجھے  
ابھی تک یقین نہیں آیا تھا نے دار صاحب۔“

”اس پر بھی یقین آ جائے گا حبیب احمد۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا ”جب  
وہ خود اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقرار کرے گا تو تمہیں بھی یقین آ جائے گا۔“

حبیب احمد نے پوچھا ”ماسٹر جمیل کو تو آپ نے اغوا کے جرم میں ضرور گرفتار کر لیا ہو  
گا؟“

”وہ بھی منظر سے غائب ہے۔“ میں نے کہا۔



”تصویر۔“ اس نے خیال انگیز انداز میں کہا ”آپ ٹھہریں، میں اپنی گھر والی سے پوچھتا ہوں۔ شاید تصویروں والے ڈبے میں پھوری کی بھی کوئی تصویر موجود ہو۔“

وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ حبیب احمد نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد فضیلت نامی ایک عورت سے دوسری شادی کر لی تھی۔ کچھ دیر بعد حبیب احمد واپس بیشک میں آیا اور ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر میری جانب بڑھا دی۔

وہ ایک کلوز اپ تھا۔ پھوری اپنی شکل و صورت ہی سے کوئی چھٹا ہوا بد معاش دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ تصویر بلیک اینڈ وائٹ تھی تاہم مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ سرخ آنکھوں والا ایک سیاہ رو شخص تھا۔ اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے گھنگریالے بال تھے کانوں میں برکیاں (چھوٹی بالیاں) تھیں اور گردن میں اس نے ایک مفر نما کپڑا ڈال رکھا تھا۔ وہ بنا بنایا کسی پنجابی فلم کا ولن نظر آتا تھا۔

میں نے پھوری کی مذکورہ تصویر اپنی جیب میں رکھ لی اور اٹھتے ہوئے کہا ”حبیب احمد، جب تک اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، ہم خانیوال میں ہی رہیں گے۔ اس دوران میں اگر تمہیں پھوری کے بارے میں کسی قسم کی سن سکن ملے تو فوراً تھانے میں اطلاع دینا۔ ہمارا قیام علاقے کے تھانے میں ہی ہے۔“

”جی“ میں ایسا ہی کروں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”مگر مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ کسی قتل کی واردات میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”جب یہ کیس مکمل طور پر حل ہو جائے گا تو صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ میں ہر قیمت پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے رہوں گا۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ ہنچکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔“

”ایسی کون سی بات ہے؟“

حبیب احمد نے کہا ”آپ نے بتایا ہے کہ ماسٹر جمیل بہار ابھی تک لاپتا ہے؟“

”ہاں، ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”وہ بہت جلدی ہماری گرفت میں ہو گا۔ اس کا جرم بھی کم سنگین نہیں ہے۔ انہو کوئی معمولی جرم نہیں ہے حبیب احمد۔“

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔“ حبیب احمد نے خیال افروز انداز میں کہا ”ماسٹر جمیل ہی نے عابدہ کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے!“

”کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”جن امکانات کا تم نے ذکر

کیا ہے، وہ پہلے سے میرے ذہن میں موجود ہیں۔ تم فکر نہ کرو، اگر تمہارا بیٹا کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہے تو اس کے ساتھ کوئی ظلم زیادتی نہیں ہوگی۔“

پھر ہم حبیب احمد کے گھر سے باہر نکل آئے۔ تھانے کی جانب جاتے ہوئے اے ایس آئی ظہور حسین نے کہا ”ملک صاحب، ایک بات ہے اور وہ یہ کہ حبیب احمد کی بات میں مجھے کافی وزن محسوس ہوا ہے۔“

”کون سی بات میں ظہور حسین؟“

”وہ جو اس نے ماسٹر جمیل کے بارے میں کہی ہے۔“

میں نے پوچھا ”یعنی تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ ماسٹر جمیل ہی عابدہ کی موت کا ذمے دار ہے؟“

”میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ ظہور حسین نے کہا ”البتہ یہ بات میرے دل کو گھمسا رہی ہے۔“

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ”ایسا ہونا ناممکنات میں سے تو نہیں ہے لیکن اس کے لئے کوئی مضبوط جواز ابھی سامنے نہیں آیا۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”خالدہ کے بیان کے مطابق وہ دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا پسند کرتے تھے پھر بغیر مضبوط جواز کے یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ جمیل بہار نے اپنی محبوبہ کی جان لے لی ہو گی۔ علاوہ ازیں، عابدہ کے خط سے پھوری کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، انہیں بھی کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال وہ ان دونوں کے تعاقب میں تو تھا اور ظاہر ہے کہ کسی ٹیک مقصد کے لئے تو ان کا پیچھا نہیں کر رہا تھا اور سب سے بڑی بات..... وہ ابھی تک منظر سے غائب ہے۔“

میں نے توقف کر کے ظہور حسین کے چہرے کا جائزہ لیا، وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہا تھا۔ میں نے کہا ”اسی تناظر میں اگر تجزیہ کیا جائے تو ماسٹر جمیل کی بہ نسبت غفور حنف پھوری کی جانب زیادہ دھیان جاتا ہے۔“

”لیکن ماسٹر جمیل کی ذات بھی شک سے پاک نہیں ہے۔“

”میں تمہاری بات سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے پراعتقاد لہجے میں کہا ”اور میں نے اس مسئلے میں ایک جامع منصوبہ بھی اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ رات کو آرام سے اس پر بات کریں گے۔“

ہم باہر نکل کر تھانے پہنچ گئے۔ میزبان تھانے دار نے بڑی خوش دلی سے ہمارا

”میں علی الصبح تلبہ روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے بتایا ”وہاں چک اٹھاسی۔ آرمیں ماسٹر جیل بار کا گھر ہے۔“ مقتولہ عابدہ پروین اسی ماسٹر کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔“

”اگرچہ ہمارے پاس اس فرار نما اغوا کی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی تھی لیکن یہ واقعہ میرے تھانے کی حدود میں پیش آیا ہے اس لئے میں کل ہی سے ماسٹر جیل کی تلاش میں بھی سرگرم ہو جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”اگر مقتولہ کا باپ پہلے ہی روز آپ کے پاس رپورٹ درج کروا دیتا تو ممکن ہے وہ جان سے نہ جاتی۔“

”اس غیبت بڑھے کو سمجھانا ناممکن ہے۔“ حق نواز نے برا سامنہ بنایا ”اس کی بے جا غیبتیں اور ناروا سلوک نے بچیوں کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ عابدہ سے پہلے اس کی بڑی بہن خالدہ بھی یہ ”کارنامہ“ انجام دے چکی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ملک صاحب، اگر ورثا ہی کوئی دلچسپی ظاہر نہ کریں تو پولیس کہاں تک ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ان کے مسائل حل کرتی پھرے۔“

”آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔“ میں نے کہا ”میں نے آج مولوی نور شاہ سے ایک طویل ملاقات کی ہے۔ وہ خاصا نامعقول اور عاقبت نااندیش شخص ہے۔ مذہب کی آڑ میں اس نے اپنے گھر کو ظلمت کدہ بنا رکھا ہے۔“

”کاش ایسے خود پسند اور متکبر والدین کے لئے کسی سخت ترین سزا کی گنجائش ہوتی جو اپنی اولاد کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے۔ ان کی انا اور شخصیت کو کچل کر انہیں دنیا والوں کے لئے ایک تمنا بنا دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایسے افراد کے لئے خدا کا درد ناک عذاب ہے۔“

”نہ میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی منہ کالا۔“ حق نواز جنجوعہ نے میرے خیال کی تردید کرتے ہوئے پھر پوچھا ”آپ کا اے ایس آئی تو کل واپس چلا جائے گا۔ آپ کو اپنے ساتھ تلبہ لے جانے کے لئے کچھ عملے کی ضرورت ہو تو بتائیں؟“

”اس کا فیصلہ میں صبح ہی کروں گا۔“ میں نے کہا اور آرام کرنے کے لئے اس طرف چلا گیا جہاں ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔

”پوری رات اس کیس کی گم شدہ کڑیوں کو ملاتے ہوئے آنکھوں میں کٹ گئی۔“



”سری صبح میں نے اے ایس آئی ظہور حسین کو واپس حویلی بہادر روانہ کر دیا۔ میں

استقبال کیا اور ہماری دن بھر کی کارروائی کے بارے میں استفسار کیا۔ متعلقہ تھانے دار کاہ حق نواز جنجوعہ تھا۔

میں نے کہا ”جنجوعہ صاحب! کام کی بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ کیس تقریباً حل ہو ہی گیا ہے۔ اس زنجیر کی صرف دو کڑیاں کم ہیں۔ ان کو ہتھکڑیاں لگا جائیں تو اس کیس کی زنجیر مکمل ہو جائے گی۔“

”ہمیں حکم کریں ملک صاحب۔“ حق نواز جنجوعہ نے جوشیلے انداز میں کہا ”ان دونوں کڑیوں کو ابھی گرفتار کر کے آپ کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔“

میں نے متحمل لہجے میں بتایا ”یہ فی الحال ممکن نہیں ہے۔ ایک کڑی کی تلاش میں صبح میں تلبہ جاؤں گا، ممکن ہے ہاتھ لگ جائے۔“

”اور دوسری کڑی؟“

میں نے جواب دیا ”اس کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”کون ہے وہ سورا؟“

”غفور عرف پھوری بدمعاش۔“ میں نے بتایا پھر پوچھا ”اس کا ریکارڈ کیا ہے؟“

تھانے دار حق نواز جنجوعہ نے کہا ”دوسرے درجے کا بدمعاش ہے۔ چوری چکاری دھونس دھاندلی اور بلوے وغیرہ کے جرائم میں ملوث رہتا ہے۔ ایک دو مرتبہ میں نے خود اپنے گمرانی میں اس کی پشت پر تر بھی لگوائے ہیں۔ وہ ہفتہ دس دن حوالات میں بھی رہا ہے۔ ویسے وہ اکثر کئی کئی دنوں کے لئے علاقے سے غائب رہتا ہے۔“

”وہ اب بھی تقریباً ایک ماہ سے غائب ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس مرتبہ ایک چیز کی حیثیت سے مجھے اس کی تلاش ہے۔“

حق نواز جنجوعہ نے تعاون آمیز لہجے میں کہا ”آپ فکر ہی نہیں کریں ملک صاحب۔ آس پاس کے علاقوں میں اس کی تلاش کے لئے اپنے آدمی دوڑاتا ہوں۔“ ایک لمحے کو وہ گرجا کر اس نے کہا ”اس کے بارے میں ایک رپورٹ یہ بھی ہے کہ وہ اکثر ضلع جھنگ بھی رہتا ہے۔“

میں نے کہا ”اپنے علاقے میں اسے چھاپنے کے لئے میں نے ایک منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ میں صبح ہی اپنے اے ایس آئی کو جھنگ روانہ کر دوں گا، کچھ ضروری ہدایات ساتھ۔“

حق نواز جنجوعہ نے پوچھا ”آپ کا اپنا کل کا کیا پروگرام ہے؟“

نے پھوری کی تصویر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم فوراً کسی فونوگرافر سے اس کی چند کاپیاں بنوا لو اور تھانے پہنچتے ہی ہوشیار قمر پولیس اہلکاروں کا انتخاب کرو پھر انہیں پھوری کے بارے میں خصوصی ہدایات دے دو۔“  
اتھراں ہزاری، بھروانا، شور کوٹ، مہاراجا گڑھ، احمد پور سیال اور بستی اسلام میں پھیلا دو۔“  
ظہور حسین نے کہا ”ملک صاحب، پھوری کے باپ حبیب احمد نے یہ بھی بتایا تھا کہ فاضل شاہ بھی جاتا رہتا ہے۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا ”فاضل شاہ کا علاقہ ضلع خانیوال میں ہی ہے اور ضلع میں پھوری کی تلاش کا بیڑا حق نواز جنجوعہ نے اٹھالیا ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ ظہور حسین مطمئن ہو کر حویلی بہادر روانہ ہو گیا۔

میں نے تھانے دار حق نواز جنجوعہ کی فرمائش پر اس کے تھانے کے ایک حوالدار ساتھ لیا اور ماسٹر جمیل بہار کے گھر کی جانب چل پڑا۔ حوالدار منظور الہی سرکاری وردی پر تھا، جبکہ میں حسب معمول سادہ لباس میں تھا۔

خانیوال سے ہم بذریعہ ٹرین پہلے میاں چنوں پہنچے پھر وہاں سے بس میں بیٹھ کر تھانے پہنچے اور بالآخر تلمبہ سے ایک تانگا پکڑ کر ہم اپنے مطلوبہ گاؤں چک اٹھاسی۔ آرہنچ گئے۔ تلمبہ کا تھانہ انچارج جو کہ ایک سب انسپکٹر تھا، مجھے بخوبی جانتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل وہ میاں چنوں کے ایک تھانے میں تعینات رہا تھا اور ایک دو مرتبہ مذکورہ سب انسپکٹر رائے احمد کھل سے ملاقات بھی ہوئی تھی تاہم اس وقت تک وہ تھانے دار نہیں بنا تھا۔ ہماری کا مختصر احوال سننے کے بعد اس نے اپنے تھانے کے دو کانٹیل بھی ہمارے ساتھ لگا دیے ہم چاروں افراد ایک ساتھ چک اٹھاسی۔ آرہنچے تھے۔ مذکورہ دونوں کانٹیل بھی وردی پر تھے۔

ماسٹر جمیل بہار کا گھر چک اٹھاسی۔ آر کے جنوبی سرے پر واقع تھا۔ وہاں بہت مکانات بنے ہوئے تھے، زیادہ تر پلاٹ خالی تھے۔ اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ماسٹر جمیل کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ مرلہ اراضی پر تعمیر کیا گیا۔ اسے ایک سو بیس گز سمجھ لیں۔

ہماری دستک کے جواب میں دروازہ سولہ سترہ سالہ ایک لڑکے نے کھولا۔ اپنے ماسٹر پولیس والوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس کو کچھ بولنے سے پہلے ہی سوال کر ڈالا ”ماسٹر جمیل بہار کا گھر یہی ہے؟“

”آہو جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون ہے پٹر نصیر؟“ گھر کے اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ شخص خود بھی دروازے پر چلا آیا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا ”کی کل ہے جناب!“ اس نے لرزیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے کہا ”میں ماسٹر جمیل سے ملنے آیا ہوں۔ اسے باہر بلائیں۔“

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں جناب۔“ اس شخص نے آنکھیں سکڑ کر مجھے جائزہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا۔

اس کی عمر تقریباً پچاس سال رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔ ”چاچا، تمہارے پہچاننے کا کیا سوال ہے۔ آج ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔“

اس نے پولیس والوں کی وردیوں کو بغور دیکھا پھر تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا ”خیریت تو ہے نا جناب۔ آج سے پہلے کبھی پولیس ہمارے دروازے پر نہیں آئی۔ آپ جمیل سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟“

میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا ”جمیل سے ایک بہت ضروری کام ہے مجھے۔“ پھر پوچھا ”آپ کون ہیں؟“

”میں جمیل کا باپ ہوں۔“ اس نے بتایا ”میرا نام کبیر علی ہے۔“

”کبیر علی۔“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”جمیل کو فوراً باہر بلا لو۔ معاملہ خاصا سنگین ہے۔“

وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا ”آپ اندر آ جائیں۔ جمیل تو اس وقت گھر میں نہیں ہے۔“

”وہ گھر میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ اندر آ آئیں۔“ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

ہم اس کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ صحن میں چارپائیاں بکھی ہوئی تھیں۔ حوالدار منظور الہی اور دونوں کانٹیل چارپائیوں پر بیٹھ گئے، میرے لئے کبیر علی کے اشارے پر ہم ایک کرسی اٹھا لیا۔

اتنی دیر میں جمیل کی والدہ جنت بی بی بھی کمرے سے نکل کر وہاں آگئی اور آتے ہی اس نے کبیر علی سے پوچھا ”کیا ہو گیا ہے۔ پولیس والے جمیل کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟“

میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں مختصراً حالات سے آگاہ کر دوں۔ میری بات ختم ہوئی ہی

کھلا تھا۔ میرے پاس کچے ثبوت بھی موجود ہیں۔ عابدہ قتل ہو چکی ہے اور تمہارا بیٹا جمیل غائب ہے۔ اگر تم ان معاملات کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو جوج تادورنہ میں بعد میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔

وہ ہراساں نظر آنے لگا "تمہارے دار صاحب" جوج تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ میرا جمیل ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔

"ہائے دے میرا رہا۔" جنت بی بی نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ضرور کسی نے آپ کو ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔ میرا پتر تو سیدھا سعیدہ کے پاس گیا تھا۔" میں نے کہا "ہم ابھی یہاں سے سیدھے چک چورالوے جائیں گے اور ہر قسم کی تصدیق کریں گے۔"

"آپ جس طرح چاہیں، تصدیق کریں تمہارے دار صاحب۔" کبیر علی نے آذرودہ لہجے میں کہا "مجھے یقین ہے کہ میرا پتر بے گناہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے بیان کے مطابق جمیل اپنی بہن کے پاس گیا ہوا ہے۔ تمہارے بیٹے نصیر احمد نے بتایا ہے کہ وہ تین جون کو گھر سے گیا تھا۔ اسی تاریخ یعنی تین جون کو ماسٹر جمیل عابدہ پروین کے ساتھ خانوالا اسٹیشن سے جھٹک جانے والی ٹرین میں سوار ہوا تھا۔ تمہاری بات پر کس طرح یقین کر لوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"تمہاری سمجھ میں اس وقت آئے گا کبیر علی، جب جمیل جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ رہا ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے بولا "میرا جمیل کسی لڑکی کو اغوا نہیں کر سکتا۔ وہ ایسی تازیا حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اگلے سال تو اس کی شادی ہونے والی ہے۔ یامین میں کوئی کمی نہیں ہے۔ جمیل کسی نامحرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "کبیر علی، معاملہ صرف اغوا تک محدود نہیں ہے۔ وہ لڑکی قتل بھی ہو چکی ہے۔ جمیل احمد کی روپوشی سے اس امکان کو تقویت ملتی ہے کہ جمیل ہی عابدہ کا قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔"

جمیل کی ماں جنت بی بی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ "جمیل نے تو کبھی ایک کیزی نہیں ماری، وہ کسی زندہ انسان کو کس طرح قتل کر سکتا ہے۔"

تھی کہ جنت بی بی نے تیز آواز میں کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جمیل ایسا لڑکا نہیں ہے۔ کبیر علی نے کہا "تمہارے دار صاحب" جمیل کی تو مشکلی ہو چکی ہے۔ اگلے سال اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

میرے لئے یہ ایک انکشاف تھا۔ میں نے کہا "سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ جمیل کہاں؟"

جنت بی بی نے کہا۔ "وہ اپنی بہن کے پنڈ گیا ہوا ہے۔"

"کب سے؟"

جمیل بہار کے چھوٹے بھائی نصیر احمد نے بتایا "بھائی جان پچھلے مہینے کی تین تاریخ سے ملنے گئے تھے۔"

میں نے پوچھا "کبیر علی، تمہاری مذکورہ بیٹی کہاں رہتی ہے؟"

"سعیدہ چک چورالوے میں بیٹھی ہوئی ہے۔" کبیر علی نے جواب دیا "جمیل چھٹیوں اکثر اس سے ملنے جاتا رہتا ہے۔"

چک چورالوے خانوالا ضلع کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ میں نے پوچھا "کبیر علی، جمیل کو گئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ کیا وہ پہلے بھی اتنے دنوں کے لئے بہن سے جاتا رہا ہے؟"

"مشکلی کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی وہاں جانے لگا ہے۔" جنت بی بی نے بتایا۔

"اچھا، ایسی کیا بات ہے؟"

کبیر علی نے وضاحت کی "وہ دراصل اس کی مشکلی ہم نے سعیدہ کی ننان (نند) ہے نا۔۔۔"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا جھوڑ دیا، میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اچھا، تو وہ معاملہ ہونے والا ہے؟"

"یاسمین بڑی اچھی بچی ہے۔" جنت بی بی نے بتایا۔

میں نے کہا "جمیل نے واپس آنے کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"شاید وہ گرمیوں کی تمام چھٹیاں وہیں گزارے۔"

"کبیر علی!" میں نے جمیل بہار کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا

نے اس بات کی اچھی طرح تصدیق کر لی ہے کہ جمیل نے تین جون کو خانوالا سے

پڑوسی نور شاہ کی چھوٹی بیٹی عابدہ پروین کو اغوا کیا تھا اور گھومتے پھرتے میرے علاقے

”یہ تو اس کی گرفتاری کے بعد ہی راز کھلے گا۔“ میں نے کہا پھر کبیر علی کو تھپرتے ہوئے کہا ”میں آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں، اگر تمہیں کچھ مظلوم ہے تو اسے دو۔ میں تمہارے دار ہوں، ذرا دوسری قسم کا۔ مجرموں اور قاتلوں کے ساتھ میں نرمی کا نہیں کرتا۔“

وہ گلوگیر آواز میں بولا ”میرا رب جانتا ہے کہ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ بولا۔ سوہنا رب ہی میرے پتر کی حفاظت کرے گا۔“

میں نے پوچھا ”کبیر علی، میں نے سنا ہے، جمیل شاعری وغیرہ بھی کرتا ہے؟“ اس غیر متعلقہ سوال پر پہلے تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بتایا ”جی ہاں، وہ وغیرہ لکھتا رہتا ہے۔“

”جو لوگ شاعری کرتے ہیں یا شعری ذوق رکھتے ہیں، ان کے دل میں بڑا گداز ہوتا ہے۔ ایسے افراد عشق و محبت کے معاملے میں بھی خالص تیز ہوتے ہیں، جمیل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کبیر علی؟“

کبیر علی کے بجائے جنت بی بی بول اٹھی ”میرے پتر نے ایسی گھٹیا حرکت کبھی نہ کی۔“

میں نے سخت لہجے میں کہا ”بی بی، عشق و محبت.... کوئی گھٹیا کام نہیں ہے اگر ذہن اور سلیقے سے کیا جائے۔“

کبیر علی نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا پھر مجھے بتایا ”ملک صاحب، جنت بی بی آپ بات کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ واقعی جمیل کے بارے میں ایسی کوئی بات سننے میں بھی آئی۔ آپ پورے پنڈ سے اس کے کروار کی گواہی لے سکتے ہیں۔“

”گواہی کی ضرورت پڑی تو گواہی بھی لے لیں گے کبیر علی۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”سب سے پہلے تو ہم چک چورانوے جائیں گے۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ جنت بی بی جلدی سے بولی ”ٹھہریں، میں اپنا ہتھکڑی آتی ہوں۔“

کبیر علی نے ڈانٹ کر اسے روک دیا ”کوئی ضرورت نہیں تمہیں کہیں آنے کی۔“ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ”ملک صاحب، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ ساتھ چلنا چاہتا ہوں؟“

اس میں کوئی حرج نہیں تھا اس لئے میں نے اجازت دے دی۔

جنت بی بی خود کھای کے انداز میں بڑبڑانے لگی ”ہم نہیں، کس نے پولیس کو جمیل کے پیچھے لگا دیا ہے۔ میرا پتر تو ہیرا ہے۔ اس کی شرافت کی تو مثالیں دی جاتی ہیں۔ وہ اتنا ہمدرد ہے کہ ایک لمبی کے بچے کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس طرح تڑپ اٹھتا ہے جیسے مصیبت خود اس کی جان پر بیت رہی ہو۔“

میں نے کہا ”بی بی، تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تمہارا پتر ایسا ہی ثابت ہوا ہے۔“ کبیر علی اور جنت بی بی نے بیک وقت سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، جنت بی بی نے استفسار کیا ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں تمہارے دار صاحب؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا جمیل انتہائی رحم دل، پر خلوص اور ہمدرد انسان ہے۔ دوسروں کی مصیبت میں کود پڑنے اور ہمہ وقت ان کی مدد کرنے کا اسے خصوصی شوق ہے۔“

”میں سمجھا نہیں، تمہارے دار صاحب۔“ کبیر علی کے چہرے سے حیرت آمیز پریشانی مترشح تھی۔

جنت بی بی نے کہا ”پلے تو میرے بھی کچھ نہیں پڑا!“

”بات دراصل یہ ہے کہ....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ”جمیل نے جس لڑکی کو گھر سے بھگایا تھا.... اور جو اب فرش زمین اونٹھ کر سو چکی ہے، وہ لڑکی بڑی دھکی اور محبت زدہ تھی۔ وہ اپنے گھر کے جنم میں کروٹ کروٹ جھلس رہی تھی۔ اس کی داستان اتنی دردناک اور اثر انگیز تھی کہ سخت دل فحش کو بھی اس سے ہمدردی نہ سہی، رحم تو ضرور آتا.... اور وہ لڑکی اکثر و بیشتر جمیل کو اپنے مصائب و مسائل سے آگاہ کرتی رہتی تھی پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جمیل کو پسند بھی کرتی تھی، اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر یہ سب کچھ گھر سے بھاگے بغیر ممکن نہیں تھا۔ جمیل جو کسی لمبی کے بچے کو بھی تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا، اس انسان کی بچی کے دکھ کو اپنے سینے میں اتارتا رہا تھا اور ایک وقت ایسا آیا کہ اس کے دل میں اس مظلوم لڑکی کے لئے ایک نرم گوشہ وا ہو گیا اور وہ ”نول....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میری باتوں کو تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کبیر علی نے ٹکست خوردہ لہجے میں کہا ”ممكن ہے، ایسا کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ جمیل اپنی بہن کے پاس چک چورانوے ہی میں ہو۔“ یہ

ایک باپ کے دلی جذبات تھے۔  
میں نے کہا ”اگر ایسا ہے تو پھر یہ معجزہ ہو گا ورنہ حالات و شواہد تو اس کے بالکل برعکس اشارہ کر رہے ہیں۔“  
”یا اللہ! یہ معجزہ ہو جائے۔“ جنت بی بی نے اپنے آپٹل کو دعائیہ انداز میں بلند کرنے ہوئے التجا کی۔

ماؤں کو اپنی اولاد کے بارے میں معجزے رونما ہونے کی کچھ زیادہ ہی توقع ہوتی ہے۔ ہم تھانہ تلبد پیچنے تو سورج مغربی افق کی جانب اپنا سفر تقریباً ختم کر چکا تھا۔ ہمارے عزائم سن کر تھانہ انچارج رائے نذیر احمد کھل نے کہا ”ملک صاحب، میرا تو مشورہ ہے کہ آج رات آپ آرام کریں۔ چک چورالوے جانے کے لئے کل صبح کا وقت زیادہ مناسب رہے گا۔“

میرے استفسار پر نذیر احمد کھل نے وضاحت کی کہ چک چورالوے پہنچتے پہنچتے آدھی رات تو ہو ہی جائے گی۔ مجھے اس کا مشورہ خاصا معقول لگا۔

دراصل اس زمانے میں تلبد سے چک چورالوے جانے کے لئے پہلے بس کے ذریعے میاں چنوں جانا پڑتا تھا۔ میاں چنوں سے چک چورالوے تک بھی کوئی پختہ سڑک نہیں تھی اور سواری کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ آج کل کا مجھے پتا نہیں کیا صورت حال ہے۔ جمیل کا باپ کبیر علی واپس اپنے گاؤں چلا گیا، اس عہد کے ساتھ کہ وہ صبح پہلے ہی نانگے سے تھانے پہنچ جائے گا۔ میں نے وہ رات تھانے دار رائے نذیر احمد کھل کی میزبانی میں بسر کی۔

دوسرے روز ہم بعد از دوپہر چک چورالوے پہنچ گئے۔ دونوں کانشیل اپنے تھانے میں ہی رہ گئے تھے۔ میرے ساتھ صرف حوالدار منظور الہی اور جمیل کا باپ کبیر علی تھا۔ کبیر علی کی بیٹی سعیدہ اپنے چچا زاد محمد افضل سے بیاہی گئی تھی۔ محمد افضل کی چھوٹی بہن یاسمین کی منگنی ماسٹر جمیل ہمارے ہو چکی تھی۔

کبیر علی کے چھوٹے بھائی جمال دین نے بڑی گرجوشی سے ہمارا استقبال کیا لیکن حوالدار منظور الہی کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ چونکے کی وجہ اس کے جسم پر بھی پولیس کی وردی تھی۔ ہم اندر جا کر بیٹھ بیٹھے تو کبیر علی نے ہمارا تعارف کرایا اور مختصر حالات کی نزاکت سے اپنے بھائی کو آگاہ کیا پھر کہا ”جمال دین، تھانے دار صاحب کو بتاؤ کہ جمیل کب سے تمہارے پاس آیا ہوا ہے۔“

جمال دین کے چہرے پر تفکرات کی گہری پرچھائیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ہزاروں اندیشے موجود تھے۔  
کبیر علی نے ذرا سخت لہجے میں کہا ”کیا بات ہے جمال دین، تم خاصے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ کہاں ہے جمیل، ذرا اسے یہاں تو بلاؤ۔“  
جمال دین کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میں ساری بات سمجھ چکا تھا۔ یقیناً کوئی بہت بڑی گڑبڑ موجود تھی۔ میں نے براہ راست جمال دین سے استفسار کیا۔  
”جمال دین، کیا تین جون کو جمیل یہاں آیا تھا؟“  
وہ تھوک نلگتے ہوئے بولا ”ہاں، آیا تو تھا۔“  
”پھر کیا ہوا تھا؟“

”وہ خاصا جلدی میں تھا۔“ جمال دین نے بتایا ”کہہ رہا تھا کہ چند روز بعد دوبارہ آئے گا۔ اسے کچھ ضروری کام نمٹانے کے لئے دوبارہ خانیوال جانا ہے۔“  
”وہ کتنے دن یہاں رکا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

جمال دین نے جواب دیا ”وہ اسی روز واپس چلا گیا تھا۔“  
”جمال دین، تم نے بتایا ہے کہ وہ خاصا جلدی میں تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا ”آخر ایسا کون سا ضروری کام تھا کہ وہ دو تین گھنٹوں کے لئے یہاں آیا تھا؟“

”وہ بتا رہا تھا کہ سعیدہ سے اسے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔“  
”تم جانتے ہو، وہ ضروری بات کیا تھی؟“  
جمال دین نے نفی میں جواب دیا ”میں نے کہا ”میں سعیدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
جمال دین نے پہلے تو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن جب میں نے اسے کیس کی سنگینی سے آگاہ کیا تو وہ بے چون و چرا راضی ہو گیا۔  
”میں پردہ کرواتا ہوں۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا ”آپ ذرا انتظار کریں۔“ پھر وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

میں نے کبیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کبیر علی، تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ دو ماہ تک اپنی بہن کے پاس رہے گا۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“  
”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ”جمیل نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں یہیں گزارنے آتا تھا۔“

”لیکن اس مرتبہ وہ یہاں دو ماہ نہیں بلکہ محض دو گھنٹے ہی ٹھہرا تھا۔“ میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا ”اسے کچھ ضروری کام نمٹانے کے لئے دوبارہ خانیوال جانا تھا۔ کیوں اب کچھ آیا سمجھ میں؟“

اس کے چہرے پر سروسوں پھول رہی تھی۔ نہایت ہی کمزور آواز میں منمنایا ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”آجائے گا سمجھ میں تمہاری۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور منہ ہی منہ میں دعائیہ کلمات دہرانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جمال دین مجھے گھر کے اندر لے گیا اور سعیدہ سے ملوا دیا۔ وہ جھپیں ستائیس سال کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ اندرون خانہ تمام افراد کو جمیل کے ”کارنامے“ کا علم ہو چکا تھا اور ان افراد میں جمیل کی منگیت تیس سالہ یاسمین بھی شامل تھی۔ سعیدہ سے دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں صرف ایک ہی کام کی بت معلوم ہوئی۔ وہ اپنی بہن کے پاس کچھ رقم لینے آیا تھا۔ دراصل وہ رقم جمیل ہی کی تھی جو اس نے تھوڑی تھوڑی جمع کر کے رکھی تھی اور سعیدہ کو حفاظت کے پیش نظر دے رکھی تھی۔ سعیدہ کا خیال تھا کہ وہ رقم جمیل کی شادی کے وقت بہت کارآمد ثابت ہوگی۔

میں نے سعیدہ سے پوچھا ”جمیل نے یہ تو بتایا ہو گا کہ اسے اچانک رقم کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

سعیدہ نے جواب دیا ”مجھے خود حیرت ہوئی تھی اور میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہاں خانیوال میں ایک گھر بہت سستا بک رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ فوراً خرید لے۔ شادی کے بعد وہ شہر میں رہنا چاہتا تھا۔“

”وہ کتنی رقم لے کر گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”پانچ ہزار!“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

اس زمانے میں پانچ ہزار روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ سونا پچاس ساٹھ روپے تولہ بہ آسانی مل جاتا تھا۔ آج کل کے پانچ لاکھ روپے سمجھ لیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جمیل کے ساتھ ایک حسین و جمیل عورت کے علاوہ اچھی خاصی رقم بھی تھی۔ اس کے سامان میں سے رقم نام کی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ رقم اس کے لباس

میں موجود تھی یا اس نے کسی دوسری جگہ اسے محفوظ کر دیا تھا۔ جمیل کو جلد از جلد تلاش کرنا اب اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا ”سعیدہ، ایک اسکول ٹیچر نے اتنی بڑی رقم کیسے جمع کر لی تھی؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ جمیل کے تو صرف تین ہزار روپے ہی تھے۔“ سعیدہ نے بتایا

”دو ہزار روپے اس نے مجھ سے ادھار لئے تھے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ تھوڑی تھوڑی کر کے یہ رقم مجھے واپس لوٹا دے گا۔“

سعیدہ کے پاس سے اٹھنے کے بعد میں نے جمال دین سے کہا ”میں دو باتیں آپ کی بیٹی یاسمین سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

”جناب، اس کی حالت بہت خراب ہے۔“ جمال دین نے خوشامد لہجے میں کہا ”اس نے جب سے جمیل کے بارے میں سنا ہے، اس پر غم کی شدت سے غشی طاری ہو گئی ہے۔ میں نے ابھی ابھی چھوٹے بیٹے کو ڈاکٹر کی جانب دوڑایا ہے۔“

یہ خبر ہی ایسی تھی کہ پورے گھر میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ یاسمین کا بری طرح متاثر ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ ویسے مجھے امید بھی نہیں تھی کہ اس سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو سکے گی۔ جمیل نے ظاہر ہے، یاسمین کو اپنے عزائم سے آگاہ نہیں کیا ہو گا۔

اسی دوران میں ایک ڈپنر ٹائپ ڈاکٹر یاسمین کو دیکھنے آ گیا۔ اس نے چیک اپ کے بعد ایک مسکن انجکشن یاسمین کو لگایا اور مکمل آرام کے مشورے کے ساتھ کچھ ادویہ دے کر رخصت ہو گیا۔

میرا وہاں مزید قیام وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے جمیل کی بہن سعیدہ سے کہا ”تمہارے پاس یقیناً جمیل کی کوئی تصویر تو ہوگی۔ مجھے اس کی ایک واضح تصویر چاہئے۔“

سعیدہ نے چند تصاویر لا کر مجھے دکھائیں۔ ان میں سے ایک تصویر میں نے اپنے پاس رکھ لی پھر وہاں سے آنے سے پہلے میں نے جمال دین اور کبیر علی کو تاکید کر دی۔

”اگر جمیل واپس آ جائے یا اس کے بارے میں آپ لوگوں کو کسی قسم کی کوئی اطلاع ملے تو فوراً اپنے قریبی تھانے میں جا کر بتائیں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سخت لہجے میں کہا ”جمیل کو تو میں جلد از جلد تلاش کر ہی لوں گا لیکن اگر کسی موقع پر مجھے پتا چلا کہ آپ میں سے کسی نے حقائق کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے تو جمیل کے ساتھ

ساتھ آپ بھی قانون کے رگڑے میں آجائیں گے۔“

کبیر علی نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جمال دین یہ نسبت پر اعتماد نظر آتا تو بولا ”ملک صاحب“ میں نے ہمیشہ قانون کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں ہے کہ جیل نے ایسا انتہائی قدم اٹھایا ہو گا“ تاہم میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھ سے جو بے پراۓ وہ ضرور کروں گا۔“

”شباباش!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”مجھے تمہاری نازک پوزیشن کا پورا احساس ہے جیل ایک سال بعد تمہارا دایلو بننے والا تھا لیکن حقائق کو جھٹھلایا تو نہیں جاسکتا۔“ کبیر علی نے رات وہیں رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں حوالدار منظور الہی کے ساتھ والہی پرائیوٹ خانوال آگیا۔ میں تھانے دار رائے نذیر احمد کھل کو یہ تاکید کرنا نہیں بھولا تھا کہ ”آس پاس کے علاقوں میں ماسٹر جیل بہار اور غفور عرف پھوری کی تلاش کا خصوصی بندوبست کر لے۔“

مزید دو روز تک جب دونوں مطلوبہ افراد کا کوئی سراغ نہ ملا تو میں تھانے دار کا شکر ادا کر کے واپس اپنے علاقے حویلی بہادر میں آگیا۔ تھانے دار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی اسے ماسٹر جیل بہار یا پھوری کی کوئی خبر خبر ملی، وہ انہیں گرفتار کر کے مجھے مطلع کر دے گا۔ میں پانچ روز کے بعد اپنے تھانے واپس آگیا تھا۔



جولائی کا پورا مہینہ ماسٹر جیل اور پھوری کی تلاش میں گزر گیا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ میں نے جیل کی تصویر کی مختلف کاپیاں بھی چھاپے مار ٹیوں کو فراہم کر دی تھیں۔ تمام ممکنہ علاقوں میں بڑے تواتر سے چھاپے مارے گئے لیکن لگتا تھا کہ انہیں یا تو زمیں کھا گئی ہے یا پھر آسمان نکل گیا ہے۔

تلبہ اور خانوال سے بھی کوئی حوصلہ افزا رپورٹ موصول نہیں ہوئی تھی۔ اگست کے مہینے میں میری سرگرمیاں پہلے کی بہ نسبت ست پڑنے لگیں۔ میں نے علاقہ الہی پانچ کو تمام صورت حال سے تفصیلاً ”آگاہ کر دیا تھا اور اس نے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ وسیع پیمانے پر دونوں مطلوبہ افراد کو ڈھونڈنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔

ستمبر شروع ہوا تو میں دیگر معاملات میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ اس کیس سے میری توجہ بالکل ہی ہٹ گئی۔ میں نے اس کیس کی فائل کو بہ حفاظت داخل دفتر کر دیا تھا۔

پھر دسمبر کے اوائل میں اتفاقاً ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ نہ بل لگا، نہ تیل اور یہ کیس خود بخود ہی حل ہو گیا۔

ایک روز میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد آرام کرنے اپنے کوارٹر میں آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد ایک کانٹیل نے آکر بتایا ”ملک صاحب! آپ فوراً تھانے آجائیں۔ ایک بہت بڑی واردات ہو گئی ہے۔“

”اوائے کیسی واردات؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ بولا ”جنتب“ ڈاکوؤں کے مسلح گروہ نے ایک برات پر حملہ کر دیا تھا۔

”حملہ کر دیا تھا!“ میں نے وردی پہننے کے دوران میں حیرت سے پوچھا ”کہاں حملہ کر دیا تھا۔“

میری سمجھ میں تمہاری پلت بالکل نہیں آ رہی۔“

کانٹیل نے بتایا ”زیادہ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں ہے لیکن لٹ پٹ کر آنے والے براتی تھانے میں بیٹھے ہیں۔“

”یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اتھراں ہزاری سے برات دہن کو لے کر دریا کے کنارے والے گاؤں آ رہی تھی۔“ کانٹیل نے کہا ”گاؤں سے باہر جنگلات میں ڈاکوؤں کے مسلح گروہ نے حملہ کر کے برات کو لوٹ لیا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دریا کی دوسری جانب جو گاؤں واقع تھے، وہاں ذکیٹی کی اکا دکا وارداتیں تو سننے میں آتی تھیں لیکن ڈاکوؤں کا کوئی باقاعدہ مسلح گروہ نہیں تھا۔

میں تھانے میں داخل ہوا تو متاثرین برآمدے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تعداد میں تقریباً چالیس افراد ہوں گے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ لوگ اتھراں ہزاری سے دہن کو بیاہ کر دریا کے کنارے واقع گاؤں میں لا رہے تھے کہ راستے ہی میں گھڑ سوار ڈاکوؤں کے مسلح گروہ نے ان پر دھاوا بول دیا تھا۔

میں نے فوری طور پر ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور ہوشیار قسم کے پولیس اہلکاروں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے مذکورہ جنگلات کی جانب روانہ کر دی۔ اس کے بعد میں فریادیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے دلہا کے باپ امیر دین سے پوچھا ”ڈاکوؤں کی تعداد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”وہ کم از کم دس افراد تھے۔“ امیر دین نے رونی صورت بنا کر جواب دیا ”وہ سب



گھوڑوں پر سوار تھے اور اسلحے سے لیس تھے۔ کچھ کے پاس کلباڑیاں بھی تھیں۔ وہ اپنے چروں پر ڈھالے لگائے ہوئے تھے۔“

میں نے پوچھا ”کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟“

”نہیں جناب، کوئی بندہ مرا تو نہیں لیکن ہمارے اچھے خاصے آدمی زخمی ضرور ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ پر ہم نے بھی دو ڈاکوؤں کو خوب مزہ چکھایا ہے۔“

”کیا مزہ چکھایا ہے؟“

امیر دین نے بتایا ”جب ڈاکوؤں نے تمام زیورات اور قیمتی سامان پر ہاتھ صاف کر لیا، برات میں موجود کچھ نوجوانوں کو اچانک جوش آگیا۔ اس وقت ڈاکو فرار ہونے کے لیے گھوڑوں کو ایڑ لگا ہی رہے تھے۔ ہمارے نوجوانوں نے آخری گھوڑے پر سوار دو ڈاکوؤں پر جھپٹا مار کر انہیں نیچے گرا دیا۔ ان دونوں کے پاس کلباڑیاں تھیں لیکن ہمارے نوجوانوں نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ باقی ڈاکو وہاں سے فرار ہو چکے تھے اس لئے بھی ہمارے قابو میں آنے والے ڈاکو ہمت ہار گئے اور لوگوں نے مار مار کر انہیں لولہن کر دیا۔“

”وہ دونوں ڈاکو اب کہاں ہیں؟“

حوالدار صوبہ خان نے مجھے بتایا ”ملک صاحب، میں نے انہیں حوالات میں بند کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک کی حالت بہت نازک ہے، مجھے نہیں لگتا کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ رہ سکے گا۔ مشتعل براتیوں نے اس کا بھر کس نکال دیا ہے۔“

میں نے حوالدار سے کہا ”ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ۔“

”تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں ڈاکو میرے کمرے میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ میں نے حوالدار سے پوچھا ”صوبہ خان، تم نے اس ڈاکو کو پہچانا نہیں۔“

صوبہ خان نے دوبارہ گہری نظروں سے اس ڈاکو کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی، پر جوش لہجے میں بولا ”ملک صاحب، یہ تو پھوری بد معاش ہے۔“

”بالکل درست۔“ میں نے کہا ”شاید تم نے پہلے اس کی داڑھی کی وجہ سے نہیں پہچانا۔ ہمارے پاس اس کی جو تصویر ہے اس میں یہ داڑھی کے بغیر ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ صوبہ خان ندامت آمیز لہجے میں بولا ”میں پہلے واقف اسے نہیں پہچان سکا تھا۔“

پھوری کے ساتھ جو دوسرا ڈاکو براتیوں کے ہتھے چڑھا تھا، اس کی حالت قدرے بہتر

تھی۔ میں نے اسے دوبارہ حوالات میں بھیج دیا اور پھوری کو جلد از جلد ضلع اسپتال بھیجنے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔

ایک ہفتے کے علاج معالجے کے بعد اس کی حالت کچھ سنبھل گئی لیکن ڈاکٹر اس کی جانب سے پر امید نہیں تھے۔ براتیوں نے اس کے جسم پر اتنے ڈانگ سوئے برسائے تھے کہ اس کا پتہ محال نظر آتا تھا خصوصاً سر میں آنے والی چونٹیں شدید تھیں۔

جب پھوری کو یقین ہو گیا کہ وہ اب بچ نہیں سکے گا تو اس نے سب کچھ بچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب زندگی کی امید ہی باقی نہ رہے تو انسان کے پاس جھوٹ بولنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

پھوری نے موت و زیست کی کشمکش میں جھٹلا ہونے کے دوران میں جو بیان دیا، آپ اسے پھوری کا اقبال جرم بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کیس کی آخری کڑی بھی۔ پھوری کے بیان کے بعد یہ ذخیرہ مکمل ہو گئی تھی۔ میں مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔



پھوری دل میں یہ تہیہ کر کے جمیل اور عابدہ کے تعاقب میں نکلا تھا کہ اسے چھپے ہی کوئی مناسب موقع ملا، وہ ان دونوں کو موت کی نیند سلا دے گا۔ اگر عابدہ اسے حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر وہ اسے کسی دوسرے کا بھی نہیں ہونے دے گا۔ اس مقصد کے لئے ایک تیز دھار خنجر بھی اس نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

شور کوٹ تک وہ نہایت کامیابی سے ان کا پیچھا کرتا رہا تھا لیکن اس کے بعد وہ اچانک پھوری کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ پھوری سٹپا کر رہ گیا، تاہم وہ ان کی تلاش میں پہلے بستی اسلام گیا پھر واپس شور کوٹ لوٹ آیا۔ ایک دن وہاں گزار کر وہ پیر محل آگیا۔ یہاں بھی جب تلاش لا حاصل رہی تو وہ قہقروانا سے ہوتا ہوا حویلی ہمارے پہنچ گیا۔ اس دوران میں اچھے خاصے دن گزر گئے تھے۔ وہ انہیں جون کو حویلی ہمارے پہنچا تھا۔ جمیل اور عابدہ کا ٹھکانا معلوم کرنے کے بعد اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ دیر نہیں کرے گا اور آج ہی ان کا کام تمام کر دے گا۔ شب بھری کے لئے وہ نہر کے پل کے ساتھ بنی ہوئی پختہ پڑیوں کو استعمال کرنے لگا۔ دن میں گاؤں کی عورتیں ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر کپڑے وغیرہ دھو کر آتی تھیں لیکن رات میں اس طرف کوئی رخ نہیں کرتا تھا اور بالکل سناٹا ہوتا تھا۔

دقوسے کی رات نصف شب کے قریب پھوری نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ قدم اس کے قریب آ گئے۔ اس نے پل کی آڑ سے دیکھا۔

نکاح کر لو گے۔ یہی بات تم مجھے اتنی دیر سے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو نا کیوں؟“  
”یہ کوئی ناچاز اور نامناسب بات بھی نہیں ہے۔“

”اگر اس قسم کی شرائط عائد کرنا تھیں تو بغیر نکاح کے میرے ساتھ شوہر کی حیثیت سے کیوں رہے۔ کیوں برباد کیا تم نے مجھے؟“

”اس میں تمہاری مرضی بھی شامل تھی۔“ جمیل نے ڈھٹائی سے کہا ”اور میں کوئی پیچھے نہیں ہٹ رہا ہوں، تمہیں بے آسرا دے سہارا نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میرا وعدہ ہے کہ تم سے شادی کروں گا اور۔۔۔“

”مجھے نہیں سنا اب تمہاری مزید بکواس۔“ عابدہ نے طیش کے عالم میں کہا اور نہر کی جانب بڑھنے کے لئے زور لگانے لگی۔

”دیکھو عابدہ، میری بات مان جاؤ۔“ اس مرتبہ جمیل کے لہجے میں درخواست تھی ”اگر تم نے خودکشی کر لی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔“

”تم کیسے زندہ نہیں رہو گے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی ”ادھر گاؤں میں تمہاری معتبر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم جاؤ، اس کے ساتھ شادی رچاؤ۔“

”تم نے ایک مرتبہ بھی میری مجبوری کو سنجیدگی سے نہیں لیا عابدہ۔“ وہ شکوہ شکایت پر اتر آیا ”اور اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اگر میں نے یاسمین سے شادی نہ کی تو میری بہن کا گھرا جڑ جائے گا۔ یہ رشتہ اگر نہ ہوا تو میرے والد کو اتنا صدمہ پہنچے گا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا، وٹے سٹے کے معاملات تو تم جانتی ہی ہو۔“

عابدہ نے کہا ”یہ باتیں تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھیں۔ اگر تم اتنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے تو مجھے گھر سے کیوں بھکا کر لائے ہو؟“

”میں تمہیں یہ سمجھا کر نہیں لایا، تم خود بھاگنا چاہتی تھیں۔“ جمیل نے بے مروتی سے کہا ”میں نے گھر سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے تو تمہاری مدد کی ہے۔ تمہاری دکھ بھائی کی باتیں سن کر میرا دل پیچ گیا تھا۔“

عابدہ نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا ”تم بھی ذرا حسین کی طرح بیچڑے ہی نہ ہو، تم بہنوں کا نصیب ہی خراب ہے، کاتب تقدیر نے ہماری قسمت میں کڑوے بادام ہی رکھے ہیں جو اوپر سے زیادہ دلکش اور خوش نما نظر آتے ہیں مگر میں خالہ نہیں ہوں جو اس کا رسوا ہو کر واپس چلی جاؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی یا تمہیں نیست و نابود کر دوں گی۔“

اسے اپنی نظروں کے سامنے دو افراد کے ہیولے نظر آئے۔ مزید قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ وہ ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ عورت تیز قدموں سے چلتے ہوئے نہر کے کنارے طرف بڑھ رہی تھی جبکہ مرد اسے ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا پھر جب وہ کے کنارے پر پہنچ گئے تو پھوری کو ان کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں اور یہ آوازیں کہ وہ ایک دم چوکنہ ہو گیا۔ اس نے اپنے کانوں میں پھینکا ہوا سیسہ داخل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ مرد کہہ رہا تھا۔

”رک جاؤ عابدہ، یہ حماقت نہ کرو۔“

پھوری نے ماسٹر جمیل کی آواز پہچان لی تھی۔ پھوری ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ایسی اوٹ میں بیٹھا تھا کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے مگر وہ ان دونوں کو نہ صرف دیکھتا تھا بلکہ ان کی واضح آواز بھی سن رہا تھا۔ اس وقت پھوری اور ان دونوں کے درمیان دور تک کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔

عابدہ نے کہا ”یہ حماقت نہیں ہے۔ چھوڑ دو میرا ہاتھ۔“  
”خودکشی کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔“ جمیل نے سمجھانے والے انداز میں

تمہیں تو محبت تھی مجھ سے۔ کہاں مگنی تمہاری وہ محبت؟“  
عابدہ نے غصیلے لہجے میں کہا ”تم نے محبت کے نام پر مجھے دھوکا دیا ہے۔“

”میں دھوکے بازی نہیں ہوں عابدہ۔“  
”اس سے بڑا دھوکا اور کیا ہو گا کہ مجھے اپنی مگنی سے بے خبر رکھا۔“ عابدہ نے

میں غصے کا طوفان اٹھائیں مار رہا تھا۔  
”میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔“ جمیل نے کہا۔

وہ بھرمی ”تمہارا مناسب وقت ہمیشہ نامناسب موقع پر آتا ہے۔“ عابدہ نے

ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانے کے لئے زور مارا ”تم اتنے دنوں سے مجھے ساتھ لے پھر لیکن ابھی تک تمہیں نکاح کا مناسب موقع نہیں مل رہا۔“

جمیل نے معتدل لہجے میں کہا ”سارے حالات تمہارے سامنے ہیں اور میں نے انکار کب کیا ہے۔ تم تو میری جان ہو۔ میں تم سے ضرور شادی کروں گا۔ مجبوری کو محسوس کرنے کی کوشش کرو۔“

”تمہاری مجبوری یہ ہے کہ تم اپنی مگنیت کو چھوڑ نہیں سکتے۔“ عابدہ نے نفرت سے

انداز میں کہا ”اگر میں تمہیں دوسری شادی کی تحریری اجازت دے دوں تو تم فوراً

”نامرد، بھڑے! پتا نہیں، تم نے کس لیتیا کا دودھ پی رکھا ہے کہ تمہارے قول میں اتنا تضاد پایا جاتا ہے۔ اگر تمہارے اندر ایک بزدل چوہا بیٹھا تھا تو مجھے کیوں گھر سے گھر کیا۔ میں اپنے باپ کے منہ پر کالک مل کر تمہارے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ اگر اپنی بہن کے گھر کو بچانے کی اتنی ہی فکر تھی اور اپنی منگیتر کو اپنانے کا اتنا ہی شوق تھا تو کیوں خواب دکھائے..... کیوں مجھے برباد کیا..... کیوں.... آخر کیوں؟“

تھوڑی ہی دیر میں عابدہ نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے۔  
 پھوری کو ایسے لگا، جیسے وہ کسی خوف ناک خواب سے بیدار ہو گیا ہو لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا کام خاصا آسان ہو گا۔ اس کا کام خاصا آسان ہو گا۔ اس کا کام خاصا آسان ہو گا۔ اس کا کام خاصا آسان ہو گا۔

جیل کی پشت پھوری کی جانب بھی اور وہ پھوری کی آمد سے بے خبری کی آواز کی بات یہ ہے کہ جب میں وقوعے کے روز تفتیش کر رہا تھا اور میں نے جیل کے درمیان ہانپ رہا تھا۔ ابھی تک اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ کمرے کا آلا توڑ کر اس کا سامان چمک کیا تھا تو اس وقت پھوری حویلی بہادر ہی میں تھا پھر اس کے قدموں کے قریب ہی زمین پر چت پڑی تھی۔ اس کی گردن میں گرہ لگا ہوا تھوڑا سا منجم ہوا۔ کہ میں متبذ تفتیش کے لئے خانیوال جانے والا ہوں تو اس نے واپس ہٹ کر خیال دل سے نکال دیا اور سیدھا اٹھراں ہزاری روانہ ہو گیا۔ بعد ازاں وہ ڈاکوؤں کا تھا لیکن اس کے جسم اور روح کا ناتا منقطع ہو چکا تھا۔

اسی وقت آن واحد میں پھوری کا خنجر دستے تک جمیل کے سینے میں یکن کی طرف سے بستر پر تڑپ تڑپ کر جان دے تو میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے کیوں کر پر پوست ہو گیا۔

سرتی بدن کا مالک ایک گھرو جوان تھا۔ قد بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک تھا، چھ فٹ سے لکھا اس کے چہرے پر کھنٹی مومچیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ اس نے موسم کی مناسبت ہلوار قبض پہن رکھی تھی۔ اس کے خد و خال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک خوب رو جوان تھا۔ مگر اس وقت اس کی ساری خوب صورتی اور رعنائی موت کی اندھیری گود میں اپنا

## جرم بے گناہی

اسکندر مرزا نے نیا نیا اقتدار سنبھالا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی لائل پور (فصل آباد) شہری حدود کے ایک تھانے میں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ ہفتے کا دن تھا۔ میں موت کے مطابق تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے کام نمٹا رہا تھا کہ چند افراد کسی نوجوان کے رپورٹ درج کرانے میرے کمرے میں آئے۔

ان میں ایک شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ خاصا خستہ حال اور درانداز آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ انیس بیس سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ باقی دو افراد درمیانی تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بوڑھے شخص نے رونا شروع کر دیا۔ ”تھانے دار صاحب، میرے جوان بیٹے کو کسی نے قتل کر دیا۔ میری تو دنیا ہی ابراہیم وہ میرا دایاں بازو تھا، میرے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ میں تو جیتے جی مر گیا۔“

”کس نے قتل کر دیا ہے تمہارے بیٹے کو؟“ میں نے معتدل لہجے میں پوچھا پھر جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بیٹھ جاؤ، اور تسلی سے ساری بات بتاؤ۔“

”جناب، ادھر گھر میں میرے بھائی کی لاش رکھی ہے۔“ بوڑھے کے ساتھ آنے والے نوجوان نے کہا ”آپ ہمارے ساتھ چلیں اور قانونی کارروائی کریں۔“

میں نے کہا ”حوصلہ رکھو نوجوان۔“ پھر بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے بوجھ کر دھر ہے تمہارا گھر؟“

”ادھر گھنٹہ گھر کے پاس۔“

میں نے اے ایس آئی شہباز خان اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ان چار افراد کو اپنے چاروں طرف دیکھ کر دیکھا۔ مقتول کا نام طفیل احمد تھا اور وہ بوڑھے شخص کبیر علی تھا۔

جائے واردات پر پہنچ گیا۔ مقتول کا نام طفیل احمد تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو اپنے بھائی احمد کے چھوٹے بھائی کا نام حبیب احمد تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو اپنے ساتھ تھانے میں آیا تھا۔ باقی دونوں افراد محلے دار تھے جو ازراہ ہمدردی ان کے ساتھ تھے۔

طفیل احمد کی لاش مکان کی چھت پر پڑی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال تھی۔ اس پرچے کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ باقی اشیاء کی فہرست اے ایس آئی نے تیار کر لی تھی۔ میں نے وہ لسٹ مقتول کے بوڑھے باپ کبیر علی کے حوالے کی اور تمام چیزیں اس کے پاس رکھ دیں۔ اس کے بعد میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور

رکھا تھا جناب! صبح سے شام تک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ باقی وقت وہ گھر میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں میں گزارتا تھا۔ اس کا تو بس ایک ہی شوق تھا۔ ورزش۔ اللہ جانے کس کی نظر کھانسی میرے جوان بچے کو؟ تھا بھی تو وہ بتایا شہزادہ۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گیا تو میں نے پوچھا۔ ”طفیل احمد کون سی ورزش کرتا تھا؟“

”اسے تن سازی کا شوق تھا۔“ کبیر علی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”وہ منہ اندھیرے اٹھ کر باقاعدگی سے تن سازی کے کلب جاتا تھا۔ واپس آکر وہ غسل کرتا، پھر ہاتھ وغیرہ کر کے کارخانے چلا جاتا تھا۔“

میں نے کہا ”کبیر علی! شہ زوری کے جتنے بھی شعبے ہیں مثلاً تن سازی، پہلوانی، کبڈی وغیرہ۔ ان میں بہت جلد دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ وہاں اگر چار بندے جن ہوں تو ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہو گا جناب! مگر میرے بیٹے کا کوئی دشمن نہیں تھا۔“ کبیر علی نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ”وہ بڑا پیارا بچہ تھا۔ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ بھی بزرگوں کا بہت احترام کرتا تھا۔“

میں نے کہا ”کبیر علی! تمہارے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے اور یہ کام کسی دوست کا نہیں ہو سکتا۔“

”رب سوہنا بہتر جانتا ہے۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دل گیر لہجے میں بولا ”میں کسی پر شک کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔“

مقتول کی جامہ تلاشی سے جو چیزیں برآمد ہوئی تھیں وہ میں نے ایک کانسیل کے ڈالے کی تھیں مگر لاش کی ساتھ اسپتال جاتے ہوئے اس کانسیل نے وہ تمام اشیاء الیس آئی شہباز خان کی تحویل میں دے دی تھیں۔ وہ بہ شدہ پرچہ جس پر دو عورتوں کے نام لکھے ہوئے تھے اور جسے میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا، اس کا اندراج سالانہ کی فہرست میں نہیں تھا۔ وہ دونوں میرے دل میں بری طرح کھنک رہے تھے۔

میں نے کبیر علی سے پوچھا ”دیکھو کبیر علی، تمہارا جوان بیٹا قتل ہوا ہے۔ میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ میں تمہارے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا البتہ اگر تم مجھ سے قانون کرو تو میں طفیل احمد کے قاتل کو گرفتار کر کے اسے قرار واقعی سزا دلوانے کا تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ بولو، قانون سے تعاون کرو گے؟“

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ضلع اسپتال بھجوا دیا۔ اب گواہوں کے بیانات اور ابتدائی پڑا کچھ باقی تھی۔ دونوں کانسیل تو لاش کے ساتھ ہی اسپتال چلے گئے تھے۔ میں اور اسے آئی شہباز خان، کبیر علی کی راہ نمائی میں نیچے بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت بیٹھک ہمارے علاوہ مقتول کا چھوٹا بھائی حبیب احمد اور اس کی ماں ہاجرہ بی بی بھی موجود تھے۔ کبیر علی کو وہاں روک کر باقی افراد کو گھر کے اندرونی حصے میں بھیج دیا۔ اسے الیس شہباز خان بھی باہر چلا گیا۔

میں نے کبیر علی سے سوال کیا ”تمہیں کب پتہ چلا کہ تمہارا بیٹا قتل ہو چکا ہے؟“ وہ اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولا ”میں تو اس وقت سو رہا تھا۔ چیخ پکار کی آواز سن کر ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ گھر میں ایک کھرام مچا ہوا تھا۔ مجھے جب برپا ہونے والی قیامت کا پتہ چلا تو میرے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ حبیب احمد نے مجھے سنبھالا نہ دیا ہوتا تو میں بے ہوش ہی ہو جاتا۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگا۔ میں نے پوچھا ”لاش کو سب سے پہلے کر دیکھا تھا؟“

”ثریا نے۔“ اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا ”میری بیٹی ثریا رفع حاجت کے صبح چھت پر گئی تو بھائی کو خون میں لت پت دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی۔“ واضح رہے کہ پنجاب میں اس زمانے میں اور آج کل بھی چھوٹے محلوں میں آٹا ہاتھ روم چھت پر تعمیر کرواتے ہیں۔

میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا ”طفیل احمد شادی شدہ تھا؟“ اس نے نفی میں جواب دیا، میں نے استفسار کیا ”وہ کیا کام کرتا تھا؟“ ”برتنوں کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔“ کبیر علی نے جواب دیا۔ ”کارخانہ پینٹل اور المونیم کے برتن تیار کئے جاتے ہیں۔ طفیل احمد وہاں ڈھلائی کا کام کرتا تھا۔“ ”وہ عام طور پر کتنے بجے گھر آ جاتا تھا؟“

”شام سے پہلے ہی وہ گھر پہنچ جاتا تھا۔“ کبیر علی نے بتایا۔ ”کل بھی وہ حسب گھر آیا تھا۔ رات کو اچھا خاصا سویا تھا اور...“

کبیر علی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے پوچھا ”اس کی کسی سے وغیرہ تو نہیں تھی؟“ ”نہ دشمنی، نہ دوستی۔“ وہ ہنسنے ہوئے لہجے میں بولا ”وہ تو اپنے کام سے کام رہتا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا ”حینہ بیگم کے کتنے بچے ہیں؟“  
 ”دو“ کبیر علی نے جواب دیا ”ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹا بڑا ہے۔ اس کا نام سلطان  
 ہے۔ سلطان سے چھوٹی سسلٹی ہے۔ سسلٹی کی عمر اٹھارہ انیس سال ہو گی۔“  
 اب بات کچھ کچھ کھلتی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا ”کبیر علی! تم نے بتایا تھا کہ مقتول  
 غیر شادی شدہ تھا۔ کیا اس کی کہیں ممکنہ وغیرہ ہوئی تھی؟“  
 ”میں نے اپنی بہن کے گھر اس کی شادی کی بات تو چلائی تھی۔ جیلہ، طفیل کے لئے  
 نہایت ہی موزوں لڑکی تھی مگر اس نے میری بات نہیں مانی اور اس رشتے سے صاف انکار کر  
 دیا۔ ورنہ اس سال میں اس کی ممکنہ تو کر ہی دیتا۔“  
 ”کیا وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا تھا؟“  
 ”اللہ جانے جی!“ وہ شکستہ لہجے میں بولا ”مجھ سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی  
 تھی۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ کبیر علی سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکے گی۔ میں نے دو  
 چار رسمی سوالات کے بعد اسے بیٹھک سے باہر بھیج دیا اور اس کی بیٹی ثریا کو اندر بلا لیا۔  
 لاش کو سب سی پہلے ثریا ہی نے دیکھا تھا۔  
 ثریا چودہ پندرہ سال کی ایک دھان پان لڑکی تھی۔ اس وقت وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔  
 اس کے چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی رونا شروع کر دے گی۔ میں تھوڑی دیر  
 تک اسے پکارتا رہا۔ وہ حبیب احمد سے چھوٹی تھی اور دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ثریا  
 سے چھوٹی ایک اور بہن نبیلہ بھی تھی جس کی عمر بارہ سال تھی۔ ثریا کے اوسان بحال ہوئے  
 تو میں نے پوچھا۔

”ثریا بیٹی! تم جب آج صبح چھت پر گئیں تو تم نے وہاں کیا دیکھا؟“  
 ”وہ ٹھہر ٹھہر رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ہاتھ روم میں جاتی ہوں۔  
 آج بھی جب میری آنکھ کھلی تو میں نے حسب معمول چھت کا رخ کیا پھر بھائی طفیل کی لاش  
 دیکھ کر میں چیخنے لگی۔“  
 ”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ طفیل مر چکا تھا؟“ میں نے پوچھا ”کیا تم نے اسے چھو کر  
 دیکھا تھا؟“

”وہ بولی“ میں نے عجیب سے انداز میں بھائی کو چھت پر پڑے ہوئے دیکھا تو چونک  
 اٹھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے تشویش ہوئی تو میں اس کے قریب چلی گئی۔ اسی وقت

”میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں تھانے دار صاحب!“  
 میں چند لمحوں تک خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر سنسنی خیز لہجے میں پوچھا  
 ”طفیل احمد کا کہیں کوئی چکر تو نہیں تھا؟“  
 ”کیسا چکر جناب؟“ اس نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔  
 ”میرا مطلب ہے، کوئی عشق وغیرہ کا چکر۔“ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے  
 کہا ”وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا؟“

کبیر علی کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کچھ  
 چاہتا ہو مگر اسے چھپانا بھی چاہتا ہو۔ اسے کنکشن میں مبتلا دیکھ کر میں نے نرم لہجے میں کہا  
 ”تم نے پولیس سے تعاون کا وعدہ کیا ہے کبیر علی! ہمارے لئے ایک معمولی اور بظاہر غیر اہم  
 بات بھی بہت کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ اگر اپنے بیٹے کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا  
 دیکھنا چاہتے ہو تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔“

”میں نے اب تک آپ سے کوئی بھی بات نہیں چھپائی جناب!“ اس کے لہجے سے  
 بسی عیاں تھی۔  
 ”حینہ بیگم کون ہے؟“ میں نے کبیر علی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز  
 میں سوال کیا۔

”جی!“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔  
 ”میں نے دوسرا وار کیا ”زلیخا بی بی کو جانتے ہو؟“  
 ”حینہ بیگم.... زلیخا بی بی۔“ اس نے انک انک کر دہرایا۔  
 ”اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو مجھ سے کسی بھلائی یا تعاون کی امید نہ رکھو۔  
 کبیر علی!“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ مجھے یقین تھا کہ ان دونوں عورتوں کا طفیل احمد  
 قتل سے بلا واسطہ یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔  
 کبیر علی نے کہا ”حینہ بیگم تو ہمارے گواہی (پڑوسی) رحیم الدین کی بیوی کا نام ہے  
 زلیخا بی بی نام کی کسی عورت سے میں واقف نہیں ہوں۔“  
 اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مجھے لگا، وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے  
 میں نے زلیخا بی بی کے ذکر کو موقوف کر کے حینہ بیگم کے بارے میں پوچھا۔

”حینہ بیگم کیسی عورت ہے؟“  
 ”ہمارے ساتھ تو بہت اچھی ہے۔“

”جب تم اٹھ کر چھت کی طرف جا رہی تھیں تو کیا طفیل احمد اپنے بستر پر موجود تھا؟“  
 ”وہ بیٹھک میں سوتا ہے۔“ وہ جلدی سے بولی ”بیٹھک کا ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا ہے۔ وہ دیکھیں۔“ اس نے بیرونی دروازے کی جانب اشارہ کیا ”وہ صبح صبح ورزش کرنے جاتا ہے اور میرے اٹھنے کے بعد ہی وہ گھر سے نکلتا ہے بلکہ میں ہی اسے جگاتی ہوں۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے بتایا۔ ”جب طفیل بھائی چلا جاتا ہے تو میں بیٹھک کے دروازے کو اندر سے کدئی لگا دیتی ہوں۔ اس طرح باقی افراد کی نیند خراب نہیں ہوتی۔“  
 میں نے اچانک سوال کیا ”تمہارا بھائی کس لڑکی سے محبت کرتا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی ”میں ہی سب سے پہلے اٹھتی ہوں عموماً اذانوں کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اہاں تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں اور اب بھی رہتی ہیں اس لئے گھر کا بیشتر کام میں ہی کرتی ہوں۔ دوسروں کے جاگنے سے پہلے یہ ناشتہ وغیرہ تیار کر دیتی ہوں۔“  
 ”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی ”میں ہی سب سے پہلے اٹھتی ہوں عموماً اذانوں کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اہاں تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں اور اب بھی رہتی ہیں اس لئے گھر کا بیشتر کام میں ہی کرتی ہوں۔ دوسروں کے جاگنے سے پہلے یہ ناشتہ وغیرہ تیار کر دیتی ہوں۔“  
 ”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی ”میں ہی سب سے پہلے اٹھتی ہوں عموماً اذانوں کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اہاں تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں اور اب بھی رہتی ہیں اس لئے گھر کا بیشتر کام میں ہی کرتی ہوں۔ دوسروں کے جاگنے سے پہلے یہ ناشتہ وغیرہ تیار کر دیتی ہوں۔“  
 ”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی ”میں ہی سب سے پہلے اٹھتی ہوں عموماً اذانوں کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اہاں تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں اور اب بھی رہتی ہیں اس لئے گھر کا بیشتر کام میں ہی کرتی ہوں۔ دوسروں کے جاگنے سے پہلے یہ ناشتہ وغیرہ تیار کر دیتی ہوں۔“  
 ”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

بھائی کے سر سے نکلنے والے خون پر میری نظر پڑی تو میں بوکھلا گئی۔ اس کے قریب چھت بھی خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہی میں نے سیڑھیوں کی جانب لاڑ دی اور نیچے آکر سب کو جگا دیا۔“

اس نے بات ختم کی تو میں نے پوچھا ”جب تم بیدار ہونے کے بعد اوپر چھت پر تھیں تو کیا اس وقت گھر کے باقی افراد سو رہے تھے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی ”میں ہی سب سے پہلے اٹھتی ہوں عموماً اذانوں کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اہاں تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں اور اب بھی رہتی ہیں اس لئے گھر کا بیشتر کام میں ہی کرتی ہوں۔ دوسروں کے جاگنے سے پہلے یہ ناشتہ وغیرہ تیار کر دیتی ہوں۔“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

”تم نے بتایا ہے کہ جب تم چھت پر پہنچیں تو تم نے بھائی طفیل احمد کو عجیب انداز میں لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ تمہارا بھائی طفیل ہی تھا جب اذانوں کے وقت اچھا خاصا اندھیرا ہوتا ہے اور تم نیند سے بیدار ہونے کے سبب پوری طرح ہوش و حواس میں بھی نہیں تھیں؟“

جانتے۔ صرف مجھے اور امی کو پتہ ہے۔ ابو کو پتہ چل گیا تو وہ ہم سے بہت ناراض ہوں گے کہ ہم نے ان سے یہ بات کیوں چھپائی۔“

”فکر نہ کرو، میں تمہارے ابو سے اس بات کا ذکر نہیں کروں گا۔“ میں نے اسے دلا دیتے ہوئے کہا ”تم کھل کر مجھے ساری بات بتاؤ۔“

”ساری بات یہی ہے جو میں نے آپ کو بت ہے۔“ ثریا نے کہا ”بھائی طفیل احمد سلمیٰ کو پسند کرتے تھے۔ سلمیٰ بھی انہیں بہت چاہتی تھی مگر سلمیٰ کی امی اس کی شادی اپنے بھائی کرنا چاہتی تھی۔ امی نے حسینہ بیگم کو ایک مرتبہ ٹھولا تھا مگر اس نے صاف انکار کر دیا کہ کسی بھی قیمت پر سلمیٰ کی شادی طفیل سے نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنی بیٹی صرف اور صرف اپنے بھانجے ہی کو دے گی۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے متجانبہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا ”آپ نے وعدہ کیا ہے کہ آپ یہ سب ابو کو نہیں بتائیں گے!“

”میں اپنا وعدہ ضرور نبھاؤں گا۔“ میں نے کہا پھر پوچھا ”کیا طفیل اور سلمیٰ چھپ چھپ کر ملتے بھی تھے؟“

اس کے چہرے پر پہلے تو ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ میرے سوال کا جواب فی میں دینا چاہتی ہو پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور بولی ”ہاں، کبھی کبھی وہ چھپتے پر مل جاتے تھے۔“

اس نے میرے شک کی تصدیق کر دی تھی، میں نے پوچھا ”وہ دن میں ملتے تھے یا رات میں؟“

”زیادہ تر رات میں۔“

میں نے ثریا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے باہر بھیج کر اس کی ماں باجرہ بی بی کو اندر بلا لیا۔ تاہم میں نے ثریا کو بھرپور تسلی دی تھی کہ میں یہ باتیں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ مطمئن رہے اور جاتے جاتے اس سے یہ بھی وعدہ لیا تھا کہ وہ فی الحال ہمارے درمیان ہر قسم کی گفتگو کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا مجھے یقین دلایا تھا۔

ہاجرہ بی بی چالیس پینتالیس سال کی ایک نحیف و نزار عورت تھی۔ اگرچہ اس عمر میں بھی اکثر لوگ اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن مسلسل بیماری نے ہاجرہ کا حال بے حال کر دیا تھا۔ وہ دق کی دائمی مریضہ تھی۔ اس سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ سلمیٰ کے رشتے کے حوالے سے اس نے ثریا کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کر دی تھی۔ ثریا کی طرح اس نے بھی مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ان باتوں کا کبیر علی سے تذکرہ نہ کروں۔ اس کے بقول

کبیر علی بہت غصہ ور تھا اور ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ حالانکہ میں نے کبیر علی کو اس سے مختلف پایا تھا۔ خیر، ظاہر ہے گھر والے اسے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ میں تو صرف جانتا تھا کہ وہ ایک غریب آدمی تھا جو گھنٹہ گھر چوک میں سبزی اور پھل بیچتا تھا اور یہ کہ اس کے جوان بھلے مانس بیٹے کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔

واپس تھانے جانے سے پہلے میں نے کوشش پر جا کر دوبارہ جانے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ پوری گلی کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ کچھ مکانوں کی چھتیں البتہ اونچی نیچی ضرور تھیں۔ مقتول طفیل احمد کے گھر کے دروازے کا رخ شمال کی جانب تھا۔ اس پوری گلی کے دروازے شمال کی طرف ہی کھلتے تھے۔ اس گلی کی پشت پر جو مکانات بنے ہوئے تھے ان کے دروازے جنوب میں واقع گلی میں کھلتے تھے۔ دونوں گلیوں کے مکانات پیچھے سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اکثر مکانوں کی چھت پر پردہ لگا ہوا تھا۔ مکان کی منڈیر کو بیٹوں کی چٹائی سے قد آدم اونچا کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک چھت سے دوسری چھت پر نظر نہ پاسکے۔ چھت کے کنارے پر بنی اس سنگل اینٹ کی دیوار کو مکان کا پردہ کہا جاتا ہے۔ سلمیٰ کا گھر طفیل کے گھر سے مشرق میں واقع تھا۔ طفیل کی لاش چھت کے جس کونے سے ملی تھی، وہاں پر پردے کی مشرق اور جنوبی دیواریں آپس میں ملتی تھیں۔ یہی وہ کونہ ہو گا جہاں یہ دونوں محبت کے متوالے اپنی اپنی چھت پر کھڑے ہو کر درمیانی دیوار کے اوپر اوپر ملا کرتے تھے۔ یہ تو ممکن تھا کہ طفیل وہ دیوار پھاند کر کبھی سلمیٰ کی چھت پر بھی چلا جاتا ہو لیکن اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ سلمیٰ اس دیوار کے اس طرف آتی ہو گی۔ دیسے عشق کی آگ میں یہ کوئی ایسا ناممکن بھی نہیں تھا۔

کیا سلمیٰ، طفیل کی قاتلہ ہو سکتی ہے؟ میرے ذہن میں ایک فوری خیال نے سر ابھارا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کی تردید کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا خیال ابھرا ”ابو“ پھر طفیل کا قاتل کون ہے؟ اس سلسلے میں مختلف امکانات میرے ذہن میں روشن ہوئے۔ ممکن ہے، سلمیٰ کا بھائی سلطان اپنی بہن سے طفیل کے تعلقات سے آگاہ ہو گیا ہو۔ اس نے کھوج لگا لیا ہو کہ وہ دونوں راتوں میں چھپ چھپ کر چھت پر ملتے ہیں۔ پھر موقع مل کر اس نے طفیل کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ اس کام کے لئے اسے دوسری چھت پر آنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی ہوگی۔ ممکن ہے، طفیل بے دھیانی میں کھڑا ہو اور دیوار کی آڑ میں چھپے ہوئے سلطان کو اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا ہو۔ میں اپنے ذہن میں امکانات کے ٹھوسے دوڑا رہا تھا۔ اس قسم کے قتل کی وارداتوں میں مدعی جب کسی پر اپنے شک کا اظہار



نہ کرے تو ہمیں اسی طرح تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانا پڑتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ پچھواڑے کے مکان سے مقتول پر حملہ کیا گیا ہو۔ بہر حال میں نے سب سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کیا اور چھت سے نیچے اتر آیا۔

نیچے اے ایس آئی شہباز خان میرا منتظر تھا۔ ضابطے کی ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد ہم کبیر علی کے گھر سے باہر نکل آئے۔ میں نے شہباز خان سے کہا ”ذرا مقتول کے پڑوسیوں کو بھی چیک کر لیں۔“

”جی ضرور ملک صاحب۔“ شہباز خان نے کہا اور ایک دروازے پر دستک دے دی۔ یہ طفیل کے گھر سے مغربی سمت والا مکان تھا۔ پتہ چلا کہ وہاں ایک بے اولاد جوڑا رہتا تھا۔ نظام دین اور حلیمہ بی بی بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ انتہائی بے ضرر اور معصوم لوگ تھے۔

میرے کہنے پر اے ایس آئی نے رحیم الدین کے دروازے کی کنڈی کھڑکا دی۔ رحیم الدین کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ اردو بازار میں اس کی کتابوں کا بیویں کی دکان تھی۔ رحیم الدین کا گھرمیری تفتیش کا خصوصی ٹارگٹ تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سرفہرست تو یہ بات تھی کہ مقتول طفیل احمد کا رحیم الدین کی بیٹی سلسلی سے عشقیہ چکر چل رہا تھا۔ پھر مقتول کی جیب سے جو پرچہ برآمد ہوا تھا اس میں رحیم الدین کی بیوی حسینہ بیگم کا نام لکھا ہوا تھا۔ کچھ دیگر باتیں بھی تھیں جو مناسب موقع پر بتائی جائیں گی۔

دستک کے جواب میں دروازہ ذرا سا کھلا۔ اس ادھ کھلے دروازے سے کسی عورت نے جھانکا پھر دھیمی آواز میں پوچھا ”کون ہے؟“

”میرا نام ملک صفدر ہے۔“ میں نے بھاری آواز میں کہا ”میں تھانے وار ہوں اور طفیل احمد کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں، ذرا رحیم الدین کو باہر بھیجیں۔“

وہ عورت جو یقیناً حسینہ بیگم ہی ہوگی، اپنے دروازے پر پولیس کو دیکھ کر ذرا بھی نہ گھبرائی، تیز لہجے میں بولی ”طفیل کے قتل سے ہمارا کیا تعلق اور رحیم گھر میں نہیں ہے، دکان پر چلا گیا ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تو میں نے فوراً دروازے کے پٹ میں اپنا پاؤں رکھ دیا، پھر اس کے مزاج کے مطابق سخت لہجے میں کہا ”بی بی، اگر رحیم گھر میں نہیں ہے تو اپنے لڑکے سلطان کو باہر بھیجو۔“

”سلطان لاہور گیا ہوا ہے۔“

”وہ لاہور کب گیا ہے؟“ میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا ”آج صبح ہی گیا ہے۔“

اس کے جواب سے مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ میرے ذہن میں مختلف خیالات چکرارہے تھے۔ میں نے خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا ”سلسلی تو گھر میں ہی ہوگی۔ میں ذرا اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”خدا کا غضب ہے، خواہ مخواہ شریف لوگوں کو کیوں پریشان کرتے ہیں آپ۔“ حسینہ بیگم نے ترخ کر کہا ”گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، رحیم سے جا کر پوچھیں۔۔۔ اور ہاں، اس سلسلے میں میری بیٹی کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا انداز تحکمانہ اور بد مزاجانہ تھا، میں نے سخت لہجے میں کہا ”رحیم سے تو ہم دکان پر بھی مل لیں گے مگر اس کیس میں تم سے بھی پوچھ گچھ کرنا ہے۔ تمہارا بیٹا سلطان اور بیٹی سلسلی بھی تفتیش کے رگڑے میں آئیں گے۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ”اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹے گی بی بی۔“

میں باتوں میں دروازے کی طرف سے غافل ہو گیا تھا، اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ میں چاہتا تو زبردستی بھی دروازہ کھلوا سکتا تھا مگر اس دلت میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہیں تھا۔ اس کے بات کرنے سے بھی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصی اوکھی عورت تھی۔ میں شہباز خان کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔



پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے اے ایس آئی منظور حسین کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے آتے ہی مجھے سیلوٹ کیا، میں نے کہا ”دو ہوشیار قسم کے بدلتوں کو ساتھ لے جاؤ اور اردو بازار سے رحیم الدین کتب فروش کو پکڑ لاؤ۔“

منظور حسین نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ”او کے سر، ابھی گیا، ابھی آیا جناب۔“ ”تور ہاں، اس کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کرنا۔ اسے بتا دینا کہ بس معمولی پوچھ

پوچھ کے لئے بلایا ہے۔“

”ایسا ہی ہو گا ملک صاحب!“ منظور حسین نے مجھے یقین دلایا پھر کہا ”لیکن اگر اس نے تمہارے آئے میں کوئی پس و پیش کیا تو اس صورت میں۔۔۔۔۔“

”میرا خیال ہے، اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ میں نے اے ایس آئی کی بات کانٹے

ہوئے کہا ”مجھے یقین ہے کہ وہ تھانے آنے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گا۔“  
 ”آپ کہہ رہے ہیں ملک صاحب تو ایسا ہی ہو گا۔“ اس نے دوبارہ سیلوٹ کیا اور  
 کمرے سے نکل گیا۔

میں نے مقتول کی جیب سے برآمد ہونے والی چیزوں کو میز پر پھیلا لیا اور بغور ایک ایک  
 کو اٹھا کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ شاید ایک بات کا تذکرہ کرنا میں بھول گیا۔ لاش کو ضلع اسپتال  
 بھجواتے وقت میں نے آلہ قتل (وہ کوری کوری اینٹ جس پر ”آر۔ سی“ کے حروف بنے  
 ہوئے تھے) کو کیسیائی تجربے کے لئے لیبارٹری بھجوا دیا تھا۔ آلہ قتل کے کیسیائی تجربے اور  
 پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آجاتی تو تفتیش میں واضح پیش رفت ہو سکتی تھی۔

اس وقت کمرے میں اے ایس آئی شہباز خان بھی موجود تھا مگر خاموشی سے میری  
 کارروائی دیکھ رہا تھا۔ تمام چیزوں کو باری باری الٹ پلٹ کرنے کے بعد میں نے تعویذ کو  
 کھولنا شروع کر دیا۔ وہ تہ شدہ ایک ویسا ہی تعویذ تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتے ہیں۔ میں نے  
 کھول کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ مختلف خانوں میں اردو حروف حتمی درج تھے۔ کہیں کہیں  
 اردو ہند سے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ تو میری سمجھ میں نہیں آیا مگر تعویذ کے اختتام  
 پر جو چند سطر عبارت تحریر کی گئی تھی، اسے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ اگرچہ وہ تحریر خوب  
 گھسیٹ کر لکھی گئی تھی مگر پھر بھی میں نے حسینہ بیگم اور زلیخا بی کے نام پڑھ ہی لئے۔  
 اس کے بعد میرا حیرت زدہ ہونا لازمی بات تھی۔

میرے چہرے کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے شہباز خان نے کہا ”لگتا ہے ملک صاحب کو  
 خاص پوائنٹ آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے!“

میں نے شہباز خان کو اس پرچے کے بارے میں بتا دیا تھا جس پر حسینہ بیگم اور زلیخا  
 بی کے نام درج تھے۔ میں نے کہا ”شہباز خان، پوائنٹ تو دو عدد ہاتھ لگے ہیں مگر اپنی جگہ یہ  
 دونوں نامکمل ہیں۔ میرا خیال ہے ان دونوں پوائنٹ کے ملنے سے جو تیسرا پوائنٹ ملے  
 آئے گا وہ ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔“

شہباز خان آگے جھک کر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تعویذ کو پڑھنے کی کوشش کر رہا  
 تھا۔ میں نے وہ تعویذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ حسینہ بیگم اور زلیخا بی کے اضافہ اس نے بھی  
 پڑھ لئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ”کوئی آئیڈیا ذہن میں آ رہا ہے شہباز خان؟“  
 ”میرا خیال ہے آپ بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہوں گے۔“ میری بات کا جواب

دینے کے بجائے اس نے خیال آرائی کی۔  
 ”کس انداز میں؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا ”یہ تعویذ حسینہ بیگم یا زلیخا بی یا پھر دونوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔۔۔۔۔“  
 اور۔۔۔۔۔“

”تیار کروانے والا یا تو مقتول طفیل احمد تھا جو یہ تعویذ سلمیٰ کو دینا چاہتا تھا یا یہ تعویذ  
 سلمیٰ نے تیار کروایا تھا اور طفیل احمد کو دیا تھا۔“ میں نے شہباز خان کی بات مکمل کرتے  
 ہوئے کہا۔

”بالکل درست۔“ وہ چوچوش انداز میں بولا ”اور۔۔۔۔۔ اور اگر یہ تعویذ طفیل احمد نے بنوایا  
 تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ رات ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی ورنہ مقتول یہ  
 تعویذ سلمیٰ کے حوالے کر دیتا، اس کی جیب سے برآمد نہ ہوتا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے کہا ”دوسری صورت میں اگر یہ تعویذ سلمیٰ نے کسی  
 سے تیار کروایا تھا اور وہ اسے طفیل احمد کو دینا چاہتی تھی تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ وہ رات  
 کو بھٹ پر آئی تھی اور ان دونوں نے ملاقات بھی کی تھی ورنہ یہ تعویذ مقتول کی جیب سے  
 نہ نکلتا۔“

”اور پھر طفیل احمد کو قتل کر دیا گیا۔“ شہباز خان نے ڈرامائی انداز میں کہا ”اس طرح  
 سلمیٰ کی ذات شک کی چادر میں لپٹے ہوئی نظر آتی ہے۔“

میں نے کہا ”اگر سلمیٰ بذات خود قاتل نہیں ہے تو یقیناً وہ قاتل سے واقف ہے یا کم از  
 کم اس تک ہماری راہنمائی کر سکتی ہے۔“

”اور یہ بھی ممکن ہے، ہمارے سارے اندازے ہی غلط ہوں۔“ شہباز خان نے مدبرانہ  
 لہجے میں کہا ”تعویذ کی حقیقت وہ نہ ہو جو ہم قیاس کر رہے ہیں۔“  
 ”ب کچھ ممکن ہے شہباز خان۔“ میں نے کہا ”تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول سے  
 بھنی ہے۔“

”میرا تجربہ بھی یہی ہے ملک صاحب۔“  
 بندہ لحات کے توقف کے بعد میں نے کہا ”اس علاقے میں تعویذ گنڈے کرنے والے  
 لوگوں سے تم واقف ہو؟“

”بہن اچھی طرح ملک صاحب۔“ شہباز خان نے جواب دیا ”ویسے تو کئی ایک افراد ہیں  
 جن کے ہاتھ میں کچھ بہت مشہور ہے۔“

ہے۔ میں نے فوراً رحیم الدین کو اندر کمرے میں بلا لیا۔ ساتھ ہی میں نے شہباز خان کو غلبے کا اشارہ کر دیا۔ میں تنہائی میں رحیم الدین سے کچھ ذاتی نوعیت کے سوالات بھی کرنا چاہتا تھا۔ ممکن تھا، شہباز خان کی موجودگی میں وہ کھل کر بات نہ کر سکتا۔

”ہاں بھی رحیم دیا۔“ وہ بیٹھ چکا تو میں نے کہا ”تم نے آج بھی دکان کھول لی۔ تمہارے پڑوس میں ایک بندہ قتل ہو گیا ہے۔ تمہارے دل میں خدا کا ذرا سا بھی خوف نہیں ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ عاجزی سے بولا ”مجھے بہت بعد میں پتہ چلا تھا اس واردات کا۔ میں تو حسب معمول دکان پر آ گیا تھا۔ میںیں پر مجھے اس واقعے کی اطلاع ملی تھی۔“

”اور تم ابھی تک دکان کھولے بیٹھے ہو؟“

وہ لجاجت سے بولا ”کیا کریں سرکار۔ روزی کا معاملہ ہے۔ آج کل ویسے بھی بچوں کے پرچے ہو رہے ہیں۔ دکان پر کام بڑھ گیا ہے۔ سلطان بھی آج صبح لاہور چلا گیا ہے ورنہ وہ دکان کے کام میں میرا ہاتھ بٹاتا تھا۔ آج تو میں اکیلا ہی پھنس گیا ہوں۔“

میں نے پوچھا ”سلطان صبح لاہور کس کام سے چلا گیا تھا؟“

سلطان میری نظر میں مشکوک افراد کی لسٹ میں تھا۔ عین واردات کے روز اس کا ”سرے شہر چلا جانا غیر معمولی بات تھی۔ رحیم الدین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

”تھانے دار صاحب، اس نے مجھے تو بتایا نہیں تھا کہ وہ کیوں لاہور جانا چاہتا تھا۔ بس میں بیٹے میں کوئی کھسر پھسر ہوئی تھی کل رات۔ آج صبح جب میں بیدار ہوا تو وہ لاہور روانہ ہو چکا تھا۔“

میں نے پوچھا ”لاہور میں وہ کس جگہ گیا ہو گا؟“

”چھوڑ میں اس کا مانا رہتا ہے۔ ادھر کپڑے کی دکان ہے اس کی شوکت کلاتھ ہاؤس۔“

”زیادہ تر وہیں جاتا ہے۔ آج بھی وہ شوکت علی کی پاس ہی گیا ہو گا۔“

میں نے پراسرار انداز میں پوچھا ”رحیم الدین، تمہاری باتوں سے لگتا ہے، تم گھر میں بیٹے ہوئے بھی گھر میں نہیں رہتے۔ تمہاری بیوی بچے جو پروگرام بناتے ہیں ان کی تمہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے، گھر میں تمہاری گھر والی کی زیادہ چلتی ہے؟“

اس نے جھنجھکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا ”بس کچھ نہ پوچھیں تھانے دار

”سرمجو!“ میں نے حیرت آمیز انداز میں اس کے الفاظ دہرائے ”یہ بھلا کیا نام ہوا؟“

”او جناب! سرمجو کا نہیں پتہ آپ کو۔“ شہباز خان نے کہا ”وہ سلائی نہیں ہوتی جس سے آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر کسی پیر کا نام۔۔۔۔“

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اے ایس آئی بول اٹھا ”ملک صاحب، پیر سرمجو دراصل بہت دیر پتلا ہے۔ رنگ بھی اس کا سیاہ ہے۔ اس پر غضب خدا کا یہ کہ وہ ہر وقت آنکھ میں گمرا سرمہ لگائے رکھتا ہے۔ کچھ لوگ تو اسے سرمے والی سرکار بھی کہتے ہیں۔ میری بیوی بھی اس کی بہت معتقد ہے۔ کہتی ہے، سرمے والی سرکار کے تعویذوں میں بڑا اثر ہے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے؟“

”اب اسے جو بھی کہیں ملک صاحب۔ عورتیں اور خصوصاً دہاتی عورتیں تعویذ گنڈے پر بہت یقین رکھتی ہیں۔ میری بیوی خالص دہاتن ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بچے ڈاکڑ کی دوائی سے ٹھیک نہیں ہوتے مگر سرمے والی سرکار کے ایک تعویذ سے بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ اپنے اپنے اعتقاد کی بات ہے جناب۔“

”اور تمہارا اعتقاد کیا ہے؟“ میں نے شہباز خان سے پوچھا ”تم بھی پیر سرمجو کو صاحب کرامت سمجھتے ہو؟“

وہ دھیمی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ”کیوں مذاق کرتے ہیں جناب! میں اللہ باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔“ پھر وہ یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا ”ویسے ملک صاحب، پیر سرمجو ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ اگر یہ تعویذ اس کا ”تخلیق کردہ“ ہے تو وہ یہ بھی بنا سکتا ہے کہ اس نے تعویذ کس کو دیا تھا اور کس مقصد سے دیا تھا۔“

”میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔“ میں نے گنبد لہجے میں کہا ”کل ہم دونوں سرمجو کے ”دیدار“ کو جائیں گے۔“

شہباز خان جلدی سے بولا ”وہ اتوار کو باقاعدگی سے چھٹی کرتا ہے۔“

”بڑا قاعدے قرینے والا پیر ہے بھی۔“ میں نے کہا ”ایسا ہے تو آج رات ہی اس سے

”ملاقات“ کر لیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“

اسی وقت ایس آئی منظور حسین نے آکر اطلاع دی کہ رحیم الدین کتب فروش خانہ

صاحب! زیادہ گزر چکی، تھوڑی باقی ہے۔ یہ بھی جیسے تیسرے گزر ہی جائے گی۔ مجھے کیا چاہیے دو وقت کا کھانا۔ وہ تو بہرحال مجھے مل ہی جاتا ہے۔ خواہ مخواہ کیا فائدہ گھر میں فساد ڈالنے کا۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے خاصا شاکسی تھا اور طویا کہہ ان کے ساتھ نباہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا ”رحیم دینا“ یوں آنکھیں بند کر لینے سے سارے حل نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھ جاتے ہیں۔ تمہارے آگے ایک جوان بیٹا اور بیٹی ہے۔ گھر کے معاملات سے تمہاری لاتعلقی بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا ”سب جائیں جہنم میں، میں نے صبر کر لیا ہے۔“  
میں نے کہا ”میں صبح تمہارے گھر بھی گیا تھا مگر تمہاری بیوی نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ قانون کے ساتھ تعاون کرنے کے بجائے الٹا آنکھیں دکھانے لگی۔“  
وہ بولا ”وہ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی، آپ سے کیا کرے گی۔“  
میں نے اچانک پوچھا ”یہ زلیخا بی بی کون ہے؟“

”زلیخا بی بی تو میری ساس کا نام ہے۔“ اس نے جواب دیا پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی میز کی دراز سے وہ پرچہ نکال کر اس کے سامنے کر دیا جس پر حسینہ بی بی اور زلیخا بی بی کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ پرچہ پڑھا۔ میں نے پوچھا ”تم پہچان سکتے ہو؟ یہ تحریر کس کی ہے؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر بغور پرچے کا جائزہ لیا پھر جواب دیا ”یہ میری بیٹی سلی کی تحریر ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے سوال کیا ”آپ کو یہ پرچہ کہاں سے ملا ہے؟“

”مقتول کی جیب سے۔“ میں نے سنناتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔  
”مقتول کی جیب سے!“ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں میرے الفاظ دہرائے۔

ہر اس نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔  
میں نے کہا ”رحیم الدین، تم مجھے خاصے مقتول آدمی نظر آتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے بلکہ ہر قسم کا تعاون کرو گے۔“

اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں ابھی سب کچھ تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”مقتول کی جلد تلاشی سے تمہاری بیٹی سلی کی یہ تحریر برآمد ہوئی ہے۔ تم اس تحریر کی تصدیق؟“

کر چکے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلی سے مقتول کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ اسی لئے سلی نے اپنی ماں اور نانی کا نام لکھ کر مقتول کو دیا تھا اور۔۔۔“ میں نے وہ تعویذ بھی قبول کر رحیم الدین کے سامنے کر دیا اور ایک سطر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ دیکھو“ میں بھی تمہاری بیوی اور تمہاری ساس کا نام لکھا ہوا ہے۔“

اس نے تشویش بھری نظروں سے تعویذ کی مذکورہ سطر کو پڑھا۔ میں نے کہا ”یہ بات تو تم بھی جانتے ہو گے کہ تعویذ گنڈے کرنے والے عموں ماں کے نام کا سارا لیتے ہیں۔ اس تعویذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمہاری بیوی کے لئے تیار کیا گیا ہے کیونکہ یہاں واضح طور پر حسینہ بیگم اور اس کی ماں زلیخا بی بی کا نام موجود ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے زلیخا بی بی کا نام ”اور یہ تعویذ بھی ہمیں مقتول کی جیب سے ملا ہے۔“

رحیم الدین ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ میں نے گہیر آواز میں کہا ”اب کیا کہتے ہو رحیم الدین؟“

اس کی گردن جھک گئی۔ کافی دیر تک وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر شرمندگی آمیز لہجے میں صرف اتنا کہا ”اگر حسینہ نے میری بات مان لی ہوتی تو شاید مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا“  
کاش اس سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔“

میرے مزید کریدنے پر اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی سلی اور مقتول طفیل احمد کے درمیان محبت کی ہانڈی پک رہی تھی۔ اسے جب ان معاملات کا پتہ چلا تو اس نے بیوی سے کہا کہ وہ بیٹی کو کنٹرول کرے۔ حسینہ نے کوشش بھی کی اور سلی کو باور کرایا کہ اس کی شادی اگر ہوگی تو حسینہ کے بھانجے ہی سے ہوگی۔ وہ اپنی بہن کو زبان دے چکی ہے مگر سلی اپنے خالہ زاد کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

سلی جب گھر میں سختیاں ہونے لگیں تو اس نے طفیل کو ان حالات سے آگاہ کر دیا چنانچہ طفیل احمد نے اپنی ماں ہاجرہ بی بی کو سلی کی ماں کے پاس رشتے کی بات کرنے بھیج دیا۔ حسینہ نے سختی سے اس رشتے کی مخالفت کی اور مقتول کی ماں کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اس طرف سے منہ دھو رکھے۔ رحیم الدین کو جب پتہ چلا کہ طفیل احمد نے رشتے کے لئے باقاعدہ اپنی ماں کو بھیجا ہے تو اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ وہ طفیل اور سلی کے رشتے کا مخالف نہیں تھا۔ اس کی نظر میں طفیل ایک انتہائی شریف، خوش اخلاق اور کماؤ لڑکا تھا۔ وہ اسے ہر قسم سے سلی کے قابل سمجھتا تھا۔ اسے ان کی ملاقاتوں اور محبت کے طریقہ کار سے اختلاف نہ تھا۔ اس کے خیال میں یہ بدنامی اور رسوائی والی بات تھی۔ سیدھے اور مستحسن طریقے سے

”ہائی باپ، آپ فکر ہی نہ کریں۔ جو آپ کا حکم۔“  
دو چار مزید سوالات کے بعد میں نے اسے جانے دیا۔



بہنے کی شام چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم پیر سرخو عرف سرے والی سرکار سے ملنے نہ پاسکے۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ اس روز سرکاری چھٹی تھی اور سرے والی سرکار خاصے رکاری واقع ہوئے تھے۔ پیر کی صبح ہم وہاں جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اس کے ساتھ ہی آلہ قتل کے کیمیائی تجزیے کی رپورٹ بھی منسلک کی۔ میں نے رپورٹ کو کھول کر پڑھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول طفیل احمد کی موت سر میں لگنے والی شدید زخمی کے باعث واقع ہوئی تھی۔ رپورٹ میں اس کی موت کا تعین ہفتہ، آٹھ تاریخ، صبح ۱۱ اور چار بجے کے درمیان کیا گیا تھا۔ یعنی اذان فجر سے کچھ دیر پہلے۔ اس کا مطلب تھا، مقتول کی بن رٹیا اپنے معمول کے مطابق چھت پر پہنچی تو طفیل احمد کو قتل ہوئے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔

کیمیائی تجزیے کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اینٹ کے کونے پر پایا جانے والا خون مقتول طفیل احمد کا ہی تھا اور جو بال اینٹ پر چپک گئے تھے وہ بھی مقتول کے سر کے بال تھے۔ یعنی طفیل احمد کو اسی اینٹ سے شدید ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ قاتل جو قاتل بھی تھا وہ اس بات سے واقف تھا کہ سلی کی اور طفیل چھپ چھپ کر چھت پر ملے تھے۔ بات بھی ظاہر ہے کہ قاتل کو ان دونوں کی یہ ملاقاتیں پسند نہیں تھیں اس لئے وہ موقع ملنے پر ان کے درمیان پھر موقع ملے ہی اس نے کام کر دکھایا۔ میرا شک بار بار سلی کے بھائی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ماں کا حمایتی تھا اور چاہتا تھا کہ سلی کی شادی موسیٰ خان ہی سے ہو جائے۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ ایک دو بار اس نے سلی پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا جس کی وجہ سے سلی کے سلی کے طفیل احمد سے مراسم تھے۔

گزشتہ روز میں سلی کا بیان لینے اس کے گھر پر گیا تھا مگر سلی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے سوال جواب کئے جاتے۔ محبوب کی موت نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ بار بار ہوش ہو جاتی تھی۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ سلی کا بھائی سلطان ابھی لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ مقتول طفیل احمد کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اس کے دروازے سے لے گئے تو میں نے اے ایس آئی شہباز خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

ان کی شادی ہو جاتی تو رحیم الدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس مرحلے پر حسینہ بیگم اس کے خیال کی بھرپور مخالفت کی۔ اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر ایکی ہوئی تھی۔ سلی کی شادی ہوگی تو اس کی بن سہینہ بیگم کے بیٹے موسیٰ خان سے ہوگی ورنہ وہ پتہ نہیں کر ڈالے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

رحیم الدین اپنا دکھڑا بیان کر چکا تو میں نے کہا ”تمہارے خیال میں طفیل احمد کا ہونا کون ہو سکتا ہے؟“  
”میں کچھ نہیں جانتا جناب۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

میں نے کہا ”رحیم الدین، حالات واقعات اور شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تمہاری بیٹی اس قتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوگی۔“ ایک لمحے کے لئے ظاہر رہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ٹھوس لہجے میں کہا ”اور تمہارا بیٹا سلطان میری نظروں میں مشکوک ہے۔“

وہ جلدی سے بولا ”سلطان ایسا لڑکا نہیں ہے جناب!“  
”کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے رحیم الدین۔“  
”میرا بیٹا قتل نہیں کر سکتا تھا نہ دار صاحب!“ وہ روہائے لہجے میں بولا ”آپ کو فہمی ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا ”اس کا پتہ بھی چل جائے گا۔ ذرا وہ لاہور سے واپس تو آجائے۔“ پھر نے اضافہ کیا ”تمہاری بیٹی سلی سے بھی ایک ملاقات ضروری ہے۔ تم مجھے بتاؤ یہ ملاقات گھر میں ہو سکتی ہے یا اسے بھی تھانے بلوانا پڑے گا؟“

”جناب، میں عزت دار غریب آدمی ہوں۔ آپ سلی کو تھانے نہ بلوائیں۔ میں تو یہ جی مر جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”کل اتوار ہے۔ چھٹی کا دن ہے۔ تمہاری دکان بند ہوگی اور تم گھر میں رہو گے۔ میں کل سلی کا بیان لینے تمہارے گھر آ رہا ہوں۔“

”ست بسم اللہ جناب!“  
”اور تمہارا بیٹا جیسے ہی لاہور سے واپس آئے، اسے سیدھا تھانے بھیجنا۔“  
”جی تھانے دار صاحب، میں ایسا ہی کروں گا۔“ وہ گھٹیا کر بولا۔  
میں نے سرزنش بھرے انداز میں کہا ”جب تک طفیل احمد کا قاتل پولیس کی میں نہیں آجاتا، تم یا تمہارے گھر کا کوئی فرد علاقے سے باہر نہیں جائے گا۔“

”شہباز خان، تمہاری سرے والی سرکار سے بعد میں مل لیں گے۔“ میں نے کہا۔  
ذرا آلہ قتل کا مسئلہ حل ہو جائے۔“

”اس کا کیا کرنا ہے جناب؟“

میں نے کوری اینٹ کو گھورتے ہوئے زیر لب کہا ”یہ ہمیں قاتل تک پہنچائے گی۔“  
شہباز خان نے پوچھا ”وہ کس طرح ملک صاحب؟“

”یہ دیکھ رہے ہو؟“ میں نے اینٹ کے پیٹ میں لکھے ہوئے ”آر۔سی“ کے حروف  
جانب اشارہ کیا ”اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ اینٹ کس بھٹے کی تیار کردہ ہے۔“  
”پھر؟“

”پھر پہلے تم ہوشیار قسم کے چند کانشیلوں کو پورے علاقے کے بھٹوں کے نام  
کرنے بھیج دو۔“ میں نے کہا ”اور انہیں تاکید کر دو کہ ہر بھٹے سے ایک ایک اینٹ  
بطور نمونہ لے کر آئیں۔ اس طرح ہمارا بہت سا وقت بچ جائے گا۔“

”میں سمجھ گیا ملک صاحب، اس طرح پتہ چل جائے گا کہ یہ اینٹ جس سے  
کو قتل کیا گیا، کس بھٹے کی بنی ہوئی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اسے اپنے منصوبے کی مزید تفصیلات بتاتے ہوئے  
آلہ قتل کے طور پر استعمال ہونے والی اینٹ غیر استعمال شدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے  
یہ اینٹ بہت سے بھی حاصل کی گئی ہے وہاں تعمیرات کا کام ابھی شروع نہیں  
جاری ہے۔ اس اینٹ پر پائی جانے والی اینٹوں کی مخصوص دھول سے ثابت ہوتا ہے کہ  
پانی، ریت، سینٹ یا گارے نے اسے جھوا بھی نہیں اور اسے بھٹے سے نکلے زیادہ عرصہ  
نہیں ہوا۔“ میری تجربہ کار نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں کہ اس اینٹ کی عمر ڈیڑھ دو ماہ سے  
نہیں ہوگی۔

”زبردست!“ شہباز خان نے پر جوش لہجے میں کہا ”بلک صاحب، آپ کا ذہن بہت  
تک سوچتا ہے۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”میں ابھی آیا۔“ اس نے کہا اور کمرے  
سے باہر نکل گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مطلوبہ بھٹے کا سراغ لگانے کے لئے ضروری انتظامات کرنے  
اگر اس اینٹ کے مالک کا پتہ چل جاتا تو قاتل تک رسائی آسان ہو جاتی۔

اجانک ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں چکا اور میں خودی  
خان کو تلاش کرنے کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔ میں چاہتا تو ایک کانشیل کو بھیج کر شہباز

کمرے میں ہی بلا لیتا۔ مگر وہ خیال اتنا فوری اور بروقت تھا کہ میں اور کچھ سوچ ہی نہ سکا۔  
شہباز خان، ہیڈ محرر کے کمرے میں دکھائی دے گیا۔ وہ چند بٹے کئے سپاہیوں سے  
رازارانہ انداز میں کھسک پھر کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو سیدھا میرے پاس چلا آیا۔  
میں نے چھوٹے ہی کہا ”میں نے تمہیں جس مشن کی ذمہ داری سونپی ہے، اس سے  
پہلے ایک اور کام کرنا بھی ضروری ہے۔“  
”جی دوسو ملک صاحب۔“

”تم ایسا کرو، دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دو کہ وہ مقتول طفیل احمد کے محلے کا دورہ کریں اور  
جس گھر کے سامنے بھی نئی اینٹیں رکھی نظر آئیں وہاں سے ایک ایک اینٹ اٹھا لائیں۔ یہ  
ہم نہایت ہوشیاری اور چالاک سے ہونا چاہئے۔ اور ہاں، سپاہیوں کو تاکید کر دینا کہ سادہ لباس  
میں یہ کارروائی ہونا چاہئے۔ اس کام کے لئے تم ایسے سپاہیوں کا انتخاب کرو جن کی یادداشت  
بہت اچھی ہو تاکہ وہ یہ یاد رکھ سکیں کہ کون سی اینٹ کس گھر کے سامنے سے اٹھائی  
گئی۔“

”او کے سر!“ شہباز خان نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”میں ابھی رحیم الدین کے گھر جا رہا ہوں۔ مقتول کے محبوب کا بیان بہت  
فوری ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی، اس کے حواس بحال ہوئے ہیں کہ نہیں۔“  
”میں شام سے پہلے آپ کو حوصلہ افزا رپورٹ دوں گا۔“ شہباز خان نے پریقین لہجے  
میں کہا۔

میرا اسے وہیں سپاہیوں کے ساتھ گفت و شنید کرتے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور  
ایک کانشیل کو بھیج کر ایس آئی منظور حسین کو اپنے پاس بلا لیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانشیل نے آکر بتایا کہ منظور حسین ابھی آیا نہیں۔ مجھے یاد آ گیا،  
منظور حسین کی بیوی بیمار تھی اس نے گزشتہ رات مجھے بتایا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا۔ بیوی  
ہسپتال میں دکھانے کے بعد اسے تھانے آنا تھا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ میں  
سے جو انداز فتح محمد کو ساتھ لیا اور رحیم الدین کے گھر پہنچ گیا۔

ملکی کی حالت پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ رحیم الدین نے ہمیں ہینچک میں بٹھایا پھر خاطر  
دار کا ارادہ ظاہر کیا لیکن میں نے اسے ایسے کسی بھی انتظام سے منع کر دیا اور تیز لہجے میں  
”بچو، سلطان کو تم نے ابھی تک تھانے نہیں بھیجا۔ وہ ہے کدھر، نظر نہیں آ رہا؟“  
”وہ تو ابھی تک لاہور ہی سے نہیں آیا۔“ رحیم الدین نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا ”وہ کب آئے گا بھی؟ تم نے اپنی گھر والی سے دریافت کیا تھا؟“  
 ”ہاں“ میں نے پوچھا تھا۔ ”رحیم الدین نے بتایا ”وہ کب آئے گا“ آج کسی بھی دن  
 جائے گا۔“

”چلو جب تک سسلی کا بیان لے لیتے ہیں۔“

رحیم الدین ”ایک منٹ بس“ کہہ کر گھر کے اندر دھنچھے میں چلا گیا پھر واپس آکر  
 ”آجائیں تھانے دار صاحب“ میں نے پردے کا انتظام کر دیا ہے۔“

میں حوالدار فتح محمد کو بیٹھک میں چھوڑ کر رحیم الدین کے ساتھ سسلی کے پاس پہنچ  
 مجھے سسلی کو دیکھ کر حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ طفیل احمد کی موت نے اس پر بڑے گہرے اثر  
 مرتب کئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے وجود سے زندگی نچوڑ لی ہو۔ وہ چہرہ  
 سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ  
 نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی پھر پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ بظاہر سسلی اور طفیل احمد  
 درمیان ایک پڑوسی سے زیادہ کوئی تعلق یا رشتہ نہیں تھا مگر اس کی کیفیت سے اندازہ ہوتا  
 کہ ان دونوں کے بیچ گہرا قلبی تعلق موجود تھا۔ اس کے چہرے پر طاری حزن و ملال  
 تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے اس کی عزیز ترین ہستی کو قتل کر دیا گیا ہو۔

میں نے رحیم الدین کو تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اب میرے  
 سسلی کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے پہلے تو اس سانچے پر سسلی کی انگلیوں  
 کی پھر نہایت ہی نرم لہجے میں دریافت کیا ”کیا تم چاہتی ہو کہ طفیل احمد کے قاتل کو  
 واقعی سزا ملے؟“

اس نے ہنسی آنکھوں سے مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی تھی۔  
 بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”اب کیا فائدہ۔ جو ہوتا تھا ہو چکا۔ میری دوست ہی  
 ہے۔ اب تو اماں اپنی مرضی کر کے ہی رہے گی۔“

”اس کا مطلب ہے تم قانون سے تعاون کرنے کو تیار نہیں ہو؟“  
 اس نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔ ”آپ مجھ سے کس قسم کا  
 چاہتے ہیں؟“

”میرے تھانے کی حدود میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے  
 میں کہا ”یہ قابل دخل اندازی پولیس معاملہ ہے۔ میں قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے  
 اس تھانے میں متعین کیا گیا ہوں۔ طفیل احمد کے قاتل کو ڈھونڈنا اور اسے کیفر کرنا

پہنچانے پر فرض ہے۔ قاتل تک رسائی میں مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔“  
 اس کی کنٹرول کنوڑا آنکھوں کی گہرائی میں اضافہ ہو گیا، تھرائے ہوئے لہجے میں بولی ”میں  
 چل تک آپ کی رہنمائی کیسے کر سکتی ہوں؟“

میں نے اسے مقتول طفیل احمد کی جیب سے برآمد ہونے والا تعویذ اور اس پرچے کے  
 بارے میں تفصیلاً بتا دیا جس پر حسینہ بیگم اور زلیخا بی کے نام لکھے ہوئے تھے۔ وہ حیرت  
 آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے استفسار کیا۔  
 ”اس بارے میں تم کیا کہتی ہو؟“

”میں... میں... بھلا کیا کہہ...“

میں نے فوراً اسے ٹوک دیا ”تمہارا باپ رحیم الدین تمہاری تحریر کو پہچان چکا ہے۔ اس  
 نے تہدق کی ہے کہ پرچے پر دونوں نام تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں لہذا اگر تم نے  
 جوت کا سامرا لیا تو خود کو کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار کر لو گی۔“

وہ بے چینی سے اپنے دوپٹے کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔ میں نے محسوس کیا، وہ اندر سے بے  
 انتہا مضطرب ہو چکی تھی۔ وہ کسی تذبذب میں مبتلا تھی۔ جب خاصی دیر تک اس نے میرے  
 سوال کا جواب نہیں دیا تو میں نے پوچھا ”بولو، کیا ارادہ ہے۔ سچ بولو گی یا جھوٹ؟“ وہ پھر  
 بھی خاموش رہی تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”سسلی بی بی، قتل کی پردہ پوشی، قتل سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ تم بری  
 طرح پھنسنے والی ہو۔ اور تمہارا بھائی بھی نہیں بچ سکے گا۔ ایک مرتبہ تمہارا خاندان پولیس  
 کے رگڑے میں آ گیا تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ قاتل کا نام بتاتی ہو یا سب کو گرفتار  
 کر کے تھانے لے جاؤں؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”اللہ پاک کی قسم“ میں نہیں جانتی طفیل کو کس نے قتل کیا  
 ہے۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مجھے یقین ہو گیا، وہ سچ بول رہی تھی۔  
 میں نے تدریسے نرم لہجے میں دریافت کیا ”چلو ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں کہ تم قاتل کے  
 دست میں کچھ نہیں جانتی ہو۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے طفیل احمد کو اپنی ماں اور ثانی کا  
 نام لکھ کر کیوں دیا تھا۔ اور اس تعویذ کا کیا مقصد تھا۔ اس پر بھی تمہاری ماں اور ثانی دونوں  
 کے نام لکھے ہوئے ہیں؟“

اسے جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اچانک پھٹ پڑی ”سب امی کی وجہ سے

ہوا۔ وہ رو دینے والے لمحے میں بولی ”ابو طفیل سے میری شادی کے لئے نیم رضامندی  
امی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ میں نے گھریلو صورت حال کا طفیل سے ذکر کیا تو  
مجھے ایک نئی راہ بھائی۔“

وہ رک کر آنسو صاف کرنے لگی، میں نے پوچھا ”کون سی نئی راہ؟“

سلمیٰ نے بتایا ”طفیل نے مجھے مشورہ دیا کہ امی کی رائے اپنے حق میں ہموار کر  
لے پیر صاحب سے کوئی تعویذ لینا چاہئے۔ پھر اس نے پیر صاحب سے اس سلسلے پر  
بھی کی۔ پیر صاحب نے میری امی اور نانی کا نام منگوا یا۔ وہ میں نے ایک پرچے پر  
طفیل کو دے دیا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پیر صاحب سے مجھے ایسا تعویذ لا کر دے  
امی کا ارادہ بدل جائے گا۔ مجھے وہ تعویذ امی کے پلنگ کے پائے کے نیچے دبانا ہو گا۔  
اثر تعویذ کی کرامت سے امی کا دل پھر جائے گا اور وہ ہم دونوں کی شادی کی مخالفت  
آجائیں گی۔ ہفتے کی صبح طفیل نے وہ تعویذ مجھے دینا تھا مگر اس دن....“

اس کی آواز بھگ گئی۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا ”اس پیر صاحب کا نام  
والی سرکار تو نہیں ہے؟“

”جی، طفیل نے یہی نام بتایا تھا۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

تعویذ اور ناموں والے پرچے کا معاملہ صاف ہو گیا تھا مگر ابھی بہت سی باتیں  
طلب تھیں۔ میں نے مشتقانہ انداز میں پوچھا ”پھر کیا ہوا۔ میرا مطلب ہے، ہفتے کی  
ہوا تھا؟“

وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی ”میں کچھ نہیں جانتی کیا،

میری تو اس روز طفیل سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔“

”ملاقات نہ ہو پانے کی وجہ؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بظاہر

ٹھوس لہجے میں سوال کیا ”کیا تم اس روز چھت پر نہیں گئی تھیں؟“

”مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔“ وہ جزبہ ہو کر بولی۔ ”حالانکہ میں نے کوشش

کی تھی۔“

”موقع نہ ملنے کا سبب کیا تھا؟“

سلمیٰ نے بتایا ”اس روز سلطان کو لاہور جانا تھا اس لئے وہ جلدی بیدار ہو گیا

سلطان نے پہلے اپنا پروگرام بتایا ہوتا تو میں طفیل کو اس سے آگاہ کر دیتا اور ہم اس

ملاقات کو ملتوی کر دیتے مگر سلطان نے رات سوتے وقت بتایا کہ وہ صبح لاہور

جائے گا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں طفیل کو مطلع کر سکتی۔ ہم عموماً سورج طلوع  
ہونے سے قبل ہی ملے تھے۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح سلطان کی نظر بچا کر  
بہت پر جاؤں اور طفیل کو کوئی اشارہ دے دوں مگر میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔“

میں نے پوچھا ”سلطان کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟“

”صحیح وقت کا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن اس وقت ابھی اجالا نہیں ہوا تھا۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“ میں نے استفسار کیا۔ ”جب سلطان گھر سے نکل گیا تو تم نے چھت

پر جا کر طفیل سے تعویذ کیوں نہیں لیا؟“

وہ بولی ”سلطان کے جاتے ہی میں نے چھت کی جانب دوڑ لگا دی تھی حالانکہ مجھے امید

نہیں تھی کہ اب تک طفیل وہاں موجود ہو گا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکی پھر

بتایا ”ہاڈی ملاقاتوں کے لئے مخصوص وقت گزر چکا تھا۔ اب چھت پر طفیل کے ملنے کے

امکانات نہیں تھے لیکن میں نے سوچا، دیکھ لینے میں کیا حرج ہے.... پھر چھت پر پہنچنے سے

پہلے ہی میرے قدم رک گئے۔ میں اس وقت آدھے ذینے طے کر چکی تھی جب مجھے طفیل

کے گھر کی چھت سے شریا کی چیخ سنائی دی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں اگلے قدموں

واپس گھر میں آ گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد شور مچ گیا کہ طفیل احمد کو کسی نے چھت پر قتل

کر دیا ہے۔“

آخری جملہ ادا کرنے تک اس کی سانس بری طرح پھول چکی تھی۔ میں نے پوچھا ”میں

نے سنا ہے، سلطان، طفیل احمد کو سخت ناپسند کرتا تھا؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”طفیل سے میل ملاقات کی وجہ

سے سلطان نے تمہیں ایک دو بار مارا بھی تھا؟“

”ظاہر ہے، وہ میرا بھائی ہے۔ کوئی بھی غیرت مند بھائی یہ بات برداشت نہیں کر

سکتا۔“

میں نے سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”ایک غیرت مند بھائی اپنی عزت کی خاطر

جو بھی کر سکتا ہے.... قتل بھی!“

اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرائے لگیں، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی ”میرا

بھائی قتل نہیں کر سکتا۔ اس نے طفیل کو قتل نہیں کیا۔“

”اس کا پتہ تو میں چلا لوں گا“ ذرا وہ ہاتھ تو آجائے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔



تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا البتہ مجرموں کے ساتھ ہم بات برا سلوک کرتے ہیں، انا لٹکا کر چڑی اویڑ دیتے ہیں ان کی۔“  
وہ میرے لمبے کی تختی اور الفاظ کی تندی سے لرز کر رہ گیا، میں نے پوچھا ”وہ لاث صاحب کا بچہ سلطان ابھی آیا نہیں لاہور سے؟“

رحیم الدین نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک تیس چوبیس سال کا نوجوان گھر میں داخل ہوا، پھر گھر میں دو پولیس والوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ اس نے انگ انگ کر پوچھا ”ابا! کیا... ہو گیا... پولیس...؟“  
میں نے اس نوجوان کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے نقش و نگار رحیم الدین سے بہت ملتے تھے۔ میں نے آنکھیں سکڑ کر کہا ”برخوردار، ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم سلطان ہی ہو نا؟“

”یہ میرا بیٹا سلطان ہی ہے تمہارے دار صاحب۔“ رحیم الدین نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

حوالدار نے سلطان کو کالر سے پکڑ لیا ”چل اوئے آگے لگ، ٹیو سلطان کی اولاد۔“  
”میرا بیٹا بے قصور ہے تمہارے دار صاحب!“ رحیم الدین نے لجاجت سے کہا ”طفیل احمد کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“  
”طفیل کو کسی نے قتل کر دیا ہے!“ سلطان نے حیرت آمیز لمبے میں چیخ کر کہا ”یہ کب کی بات ہے؟“

”اوئے زیادہ ایکننگ کی ضرورت نہیں سلطنت ڈاکو۔“ حوالدار فتح محمد نے اسے ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا ”تمہارے چل کر سب پتہ لگ جائے گا۔“

سلطان کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی حیرانی کو میں کوئی واضح معنی نہ پہنا سکا۔ مجھے لڑائی اور حقیقت دونوں کا بیک وقت گمان ہوا تھا۔ میں نے رحیم الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تمہارا بیٹا بے گناہ ہے تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ دوسری صورت میں مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

”رحم سرکار، رحم۔“ وہ گڑگڑانے لگا ”اس کی ماں یہ سب برداشت نہیں کر سکے گی۔“  
”اب برداشت تو کرنا ہی پڑے گا بزرگو۔“ فتح محمد نے معنی خیز انداز میں کہا ”ہم اسے پوچھ گچھ کے لئے تمہارے لئے جا رہے ہیں، کوئی پھلے (پھانسی) دینے نہیں۔“

وہ منت آمیز لمبے میں بولی ”میں قسم کھا کر کہتی ہوں، سلطان نے کچھ نہیں کیا۔ بات درست ہے کہ وہ ہمارے تعلقات کی وجہ سے مجھ سے ناراض رہتا تھا۔ اس نے راہ راست پر لانے کے لئے ایک دو بار تھپڑ بھی مارے تھے مگر وہ اس حد تک نہیں جا کر وہ قاتل نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔“

”قانون کی کتاب میں قسموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے لڑکی۔“ میں نے کہا ”صرف ثبوت مانگتا ہے، ثبوت۔ تمہارے پاس سلطان کی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے؟“  
وہ عجیب سے لمبے میں بولی ”قانون کے پاس میرے بھائی کے قاتل ہونے کا کوئی ثبوت ہے؟“

”محرمات اور وجوہات ہیں قانون کے پاس۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”ثبوت بھی مل ہی جائے گا۔“  
”تو جائیں پھر جا کر ثبوت تلاش کریں۔ مجھے خواہ مخواہ کیوں پریشان کر رہے ہیں؟“ اکتائے ہوئے لمبے میں بولی۔

میں نے کہا ”یہ بھی کر لیں گے اور بہت جلد کر لیں گے۔“ چند لمبے میں خاموشی اسے گھورتا رہا پھر دوستانہ انداز میں کہا ”تمہارے خیال میں طفیل کو کون قتل کر سکتا ہے؟“  
”یہ سوال آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولی ”میں نے آپ کو اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔“  
میں ابھی اس کی جان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ”تمہیں کسی پر شک بھی نہیں ہے؟“  
نے تیز لمبے میں سوال کیا۔

”نہیں۔“ اس نے سپاٹ لمبے میں جواب دیا۔  
میں نے پوچھا ”طفیل کی کسی سے دشمنی تھی؟“  
”یہ جا کر اس کے گھر والوں سے پوچھیں۔“

میں سمجھ گیا کہ اب وہ میرے کسی سوال کا سیدھا جواب نہیں دے گی اس لئے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ ہم وہاں سے آنے لگے تو رحیم الدین نے کہا۔  
”تمہارے دار صاحب، اب تو آپ کا شک دور ہو گیا نا۔ خدارا، ہمیں اس کیس نہ گھسیٹیں۔ مجھے تمہارے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”ابھی کہاں رحیم الدین۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ”شک آسانی سے دور نہیں ہو سکتا... اور ہاں، تمہارے پولیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہوئے کما "جابر حسین" اگر یہ دروغ گوئی سے کام لے یا کسی بات کا الٹا جواب دے تو تم غفلت نہ برتنا۔"

"تیس فکر ہی نہ کرو ملک صاحب۔" وہ دو مرتبہ اٹھک بیٹھک لگا کر بولا پھر اپنے بازوؤں کی پھیلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "یہ کس دن کام آئیں گے۔ میں کوئی غفلت نہیں کروں گا۔ میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔۔۔ آپ پوچھ گچھ کا آغاز کریں۔"

میں نے سلطان سے پوچھا "کیا پروگرام ہے شاہ زادے، خود ہی سب کچھ بتاؤ گے یا جابر حسین کو ہاتھ پیرہانے پڑیں گے۔"

اس نے خوف زدہ نظروں سے جابر حسین کو دیکھا پھر تھوک نکل کر منمناتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا "تھانے دار صاحب، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو پرسوں اچھا خاصا یہاں سے گیا تھا۔ آج واپس آیا ہوں تو یہ مصیبت میری منتظر تھی۔"

میں نے سوچا اس کو آہستہ آہستہ گھسنا چاہئے۔ میں نے سوال کیا "پرسوں ہفتے کے روز آٹھ تاریخ کو تم کتنے بجے گھر سے نکلے تھے؟"

"صبح سویرے، ابھی اندھیرا ہی تھا۔" اس نے جواب دیا "میں اڑے سے نکلنے والی پہلی بس سے لاہور گیا تھا۔"

میں نے پوچھا "اتنی صبح لاہور جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟"

"وہاں فٹ بال کا میچ تھا۔"

جابر حسین نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا "اوائے فٹ بال کے گھوڑے، اتنی دور صبح ہی صبح بیچ دیکھنے جاتے ہو۔ اندھیرے میں کون تمہاری ماں کا خصم فٹ بال کھیلتا ہے؟"

"جناب، آپ کا سپاہی مجھے خواہ مخواہ مار رہا ہے۔" سلطان نے جتنی نظروں سے مجھے دیکھا "یہ تو بہت زیادتی والی بات ہے۔ آپ سیانے آدمی ہیں۔ خود اندازہ لگا لیں، لاکل پور لاہور خچے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ پھر یادای باغ (لاہور کا بسوں کا اڈا) سے اچھرہ بھی کافی فاصلے پر ہے۔ ایک گھنٹہ تو لگ ہی جاتا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا "اور میں بتاؤں کہ وہاں میں کوئی بیچ دیکھنے نہیں گیا تھا بلکہ بیچ کھیلنے گیا تھا۔ یقین نہ آئے تو آپ میرا بیگ کھول کر دیکھ لیں۔ اس میں میرے کپڑے اور جوتے آپ کو مل جائیں گے، اور میں آپ سے ایک درخواست کروں گا تھانے دار صاحب، اپنے سپاہی سے کہیں کہ میری ماں کو گالیاں نہ دے، میں برداشت نہیں کروں گا۔۔۔"

اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی جابر حسین نے اس کے گال پر ایک زوردار طمانچہ

ہم گھر کے بیرونی دروازے سے نکلنے لگے تو پیچھے سے حسینہ بیگم کی آواز آئی "اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں سب کو مزہ چکھا دوں گی۔"

پھر وہ ایک ایک کا نام لے کر مغفلات بکنے لگی۔ اس کا ہدف ملامت مقتول کے گھر والے تھے۔ وہ یہ سمجھی تھی کہ ہم مقتول کے ورثا کے کہنے پر سلطان کو پکڑنے آئے تھے جب کہ صورت حال اس کے برعکس تھی۔ کبیر علی نے کسی پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے تفتیش کی گاڑی ابھی ریک رہی تھی جب کہ اسے پوری رفتار سے دوڑنا چاہئے تھا۔

میں نے تھانے پہنچتے ہی سلطان کو حوالات میں بند کر دیا۔ میرا ارادہ تھا، تھوڑی دیر بعد اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔ پھر میں دوسرے ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔

سلطان جب گھر میں داخل ہوا تھا تو اس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ بھی تھا جو تھانے آتے ہوئے اس نے اپنے باپ کو دینا چاہا تھا مگر حوالدار نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا اور وہ بیگ اس وقت میری میز پر رکھا ہوا تھا۔

انتہائی ضروری نوعیت کے کام نمٹانے کے بعد میں نے سلطان کے بیگ کو کھول کر دیکھا مگر اس میں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی۔ روزمرہ استعمال کی چند اشیائے علاوہ ایک ٹریک سوٹ تھا اور پی ٹی شووز۔ میں نے الٹ پلٹ کر اچھی طرح بیگ کو دیکھ لیا مگر کوئی ایسی چیز یا سراغ نہ مل سکا جس سے موجودہ کیس میں مدد مل سکتی ہو۔ میں نے ایک کانٹیلبل کو حکم دیا کہ وہ سلطان کو میرے پاس لے آئے۔ ساتھ ہی میں نے ایک بٹے کے نو مند سپاہی کو بھی بلا لیا۔

سلطان میرے کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھنے لگا تو میرے مطلوبہ سینڈو ٹائپ سپاہی نے اس کی گردن پر ہاتھ جماتے ہوئے کہا "اوائے نواب کے پتر، یہ تھانہ ہے۔ تمہارا بے کا گھر نہیں۔ چل سیدھا کھڑا ہو جا۔ یہاں مجرموں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں نے کیا جرم کیا ہے جناب؟" سلطان نے متوحش نظروں سے مجھے دیکھا۔

سپاہی نے اس کی کمر پر لات رسید کی "اوائے جرم خود کرتے ہو اور پوچھتے ہم سے؟"

یہ ڈرامے بازی یہاں نہیں چلے گی۔

میں نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم گردن گردن تک پھنس چکے ہو۔ تمہارا پوتا بہت مشکل ہے۔ اس لئے میں جو پوچھوں، سچ سچ بتانا۔ اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو سمجھ لینا کہ تمہاری خیر نہیں۔" پھر میں نے یحیم خٹیم سپاہی کو اشارہ کرنا

جڑ دیا ”برداشت تو تمہارے فرشتے بھی کریں گے بچو! تھانے میں تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں، تم کس کھیت کی مولیٰ ہو۔“

”دیکھیں جناب، اب یہ فرشتوں کو بھی برا بھلا کہہ رہے ہیں۔“ سلطان نے شکایتی لہجے میں کہا ”یہ تو بہت گناہ کی بات ہے۔“

سلطان اپنی باتوں سے بہت بھولا بالفاظ دیگر احمق اور بے وقوف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے بیگ میں ٹریک سوٹ اور پی ٹی شوڈ دیکھ لئے تھے۔ ہو سکتا تھا وہ واقعی میچ کھیلنے گیا ہو مگر میں پوری طرح اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا میں نے جابر حسین سے کہا ”اب جب تک میں اشارہ نہ کروں، تم حرکت میں نہ آنا، ٹھیک ہے!“

جابر حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے سلطان سے کہا ”اور تم مجھے اشارہ کرنے کا موقع فراہم نہیں کرو گے۔ کیوں، ٹھیک ہے؟“

سلطان نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے ہر سوال کا مکمل اور درست جواب دے گا۔ میں نے پوچھا ”تمہارے باپ نے بتایا تھا کہ تم اسے بتائے بغیر لاہور چلے گئے تھے؟“

”اگر ابا کو بتاتا تو وہ مجھے جانے سے روک دیتا۔“

میں نے پوچھا ”تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟“

وہ بولا ”بارہ جماعتیں پاس ہوں جناب! سرکاری نوکری کی تلاش میں دن گن رہا ہوں۔“

”تم نے بتایا ہے کہ لاہور میں اچھرہ گئے تھے۔“ میں نے پوچھا ”اچھرہ میں تمہارا کون رہتا ہے؟“

رحیم الدین نے مجھے بتایا تھا کہ اچھرہ میں سلطان کے ماموں شوکت علی کی کپڑے کی دکان ہے۔ میں اسی بات کی تصدیق چاہتا تھا۔

”وہاں میرا ماں رہتا ہے جناب، سگا ماں۔ میری امی کا ایک ہی بھائی ہے۔“

”تمہارا ماں کرتا کیا ہے؟“

”اؤھر زلیدار روڈ پر اس کی کپڑے کی دکان ہے۔“ اس نے بتایا ”شوکت کھاتھ ہاؤس۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”یہ نہ سمجھنا کہ تم جو بتاؤ گے، میں آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لوں گا۔ ہم تمہاری باتوں کی تصدیق کے لئے ایک پولیس پارٹی لاہور تمہارے مامے کے پاس بھی بھیجیں گے۔“

”آپ جیسے چاہے، تسلی کر لیں۔“

میں نے سوال کیا ”فٹ بال کا میچ کوئی اتنا طویل تو ہوتا نہیں کہ تم اب واپس آئے ہو۔ تم اب تک وہاں کیا کر رہے تھے؟“

”میں صرف میچ کھیلنے نہیں گیا تھا۔“ اس نے بتایا ”میرا گھومنے کا بھی پروگرام تھا۔ کبھی کبھی تو گھر سے نکلنے کا موقع ملتا ہے ورنہ ابا تو ہر وقت روکتا ہی رہتا ہے۔“

میں نے پوچھا ”مجھے پتا چلا ہے کہ تمہیں طفیل احمد سے شدید نفرت تھی؟“

”وہ جس قسم کی حرکتیں کر رہا تھا، میں اس سے محبت تو کر نہیں سکتا تھا۔“

”یہ نہ بھولو کہ ان حرکتوں میں تمہاری بہن بھی برابر کی شریک تھی!“

وہ جذباتی لہجے میں بولا ”میری بہن معصوم اور ناسمجھ ہے جو اس کے برکاوے میں آگئی تھی۔ میں نے زمانے کی اونچ نیچ اسے اچھی طرح سمجھا دی تھی مگر۔۔۔“

”تم نے اس سلسلے میں اس کی پٹائی بھی کی تھی؟“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”وہ میری مجبوری تھی۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا ”ایک بھائی ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا تھا۔“

میں نے اندھیرے میں تیر جھوڑا ”اور بہن کی پٹائی کرتے وقت تم نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر سلمیٰ نے طفیل سے میل جول ختم نہ کیا تو تم طفیل کو قتل کر دو گے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”اور پھر تم نے اپنی دھمکی پر عمل بھی کر دکھایا کیونکہ سلمیٰ نے تمہاری وارننگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے طفیل سے ملنا جلنا برقرار رکھا تھا۔ تم نے طفیل کا قصہ پاک کر دیا۔“

”میرا دماغ پھٹ جائے گا تھانے دار صاحب!“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرے کو چھپاتے ہوئے بولا ”میری یہ خواہش ضرور تھی کہ اللہ کرے، طفیل مرجائے یا کہیں دور چلا جائے تا کہ میں سکون سے رہ سکوں، میری بہن کا پیچھا چھوٹے مگر میں نے کبھی اسے خود قتل کرنے کے بارے میں بھولے سے بھی نہیں سوچا۔ اور اب۔۔۔ اب جب وہ قتل ہو چکا ہے تو مجھے اس کی موت کا دکھ ہو رہا ہے۔“ پھر وہ باقاعدہ رونے لگا۔

میں نے جابر حسین سے کہا ”اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ باقی پوچھ گچھ صبح ہو گی۔“

دوسرے ہی لمحے جابر حسین، سلطان کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے کرسی کی پشت

سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔

دن رات میرا مجرموں سے واسطہ رہتا تھا۔ میں ایک ہی نظر میں مجرم اور بے گناہ کو پہچان جاتا تھا۔ میں جب تک سلطان سے ملا نہیں تھا تو میرا پورا شک اسی پر تھا کیونکہ حالات و واقعات اس کی مخالفت میں جا رہے تھے۔ اس سے پوچھ گچھ کے بعد مجھے اپنے خیالات میں کچھ پلک محسوس ہوئی۔ اگر وہ پیدائشی اداکار نہیں تھا تو اس کے قاتل ہونے کے امکانات پچاس فی صد کم ہو گئے تھے یعنی پچاس فیصد ابھی باقی تھے۔ میں سردست اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک وہ پوری طرح بے گناہ ثابت نہیں ہو جاتا یا اگر اس کے بجائے کوئی اور شخص قاتل ہے، وہ گرفتار نہیں ہو جاتا اس وقت تک میں اسے حوالات میں ہی رکھوں گا۔

ایک بات سلطان کے حق میں جاتی تھی۔ وہ یہ کہ مقتول طفیل احمد کو سر کے پچھلے حصے میں اینٹ سے ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اگر وقوعہ کے روز طفیل احمد، سلمیٰ کی چھت پر نظریں لگائے اس کا انتظار کر رہا تھا تو اس صورت میں اگر سلطان اس پر وار کرتا تو ایک تو وہ اس کی نظر میں آ جاتا، دوسرے اینٹ کا نشانہ طفیل کے سر کا سامنے والا حصہ یا چہرہ بنتا۔ مگر یہ کوئی فارمولا نہیں تھا، ایک امکانی بات تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب سلطان نے طفیل کے سر کو نشانہ بنایا ہو، طفیل اس کی جانب پشت کئے کھڑا ہو۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ بالفرض اگر سلطان نے طفیل کی جان نہیں لی تھی تو پھر قاتل کون تھا؟ میں اٹھ کر پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔



شہباز خان نے حسب وعدہ سورج غروب ہونے سے پہلے خاصی کارآمد معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی تھانے کے برآمدے میں اچھی خاصی اینٹیں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ شہباز خان کے بھیجے ہوئے سپاہیوں نے علاقے کے تمام بھٹوں کا تفصیلی سروے کیا تھا۔ شہباز خان بہ نفس نفیس ایک ٹیم کے ساتھ تھا۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آلہ قتل کے طور پر استعمال ہونے والی اینٹ کون سے بھٹے سے خریدی گئی تھی۔ شہباز خان نے پوری تفصیل سنانے کے بعد کہا۔

”ملک صاحب“ وہ بھٹ ہمارے قریب ہی ہے۔ اس کا نام ”ریاض سراکس“ ہے۔ ”آر۔ سی“ اس کا مخفف ہے۔ ”میں نے پوچھا“ تم نے معلوم کیا کہ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ میں انہوں نے کس کس کو اینٹیں

فروخت کی ہیں؟“

”جی ہاں، میں نے بہت کرید کرید کر پوچھا تھا۔“ شہباز خان نے جواب دیا ”مگر کوئی حتمی بات پتہ نہیں چل سکی۔ بھٹے کے مالک ریاض بھٹی سے بھی میں نے ملاقات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ روزانہ کتنی ہی پارٹیاں اینٹیں لے کر جاتی ہیں۔ ہم کسی کا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ پھر ڈیڑھ ماہ پہلے ہم سے کون کون اینٹیں خرید کر لے گیا تھا، یہ بتانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”اور محلے میں تم نے جن دو سپاہیوں کو مشن سونپا تھا، اس کی کیا رپورٹ ہے؟“

”ملک صاحب، چونکہ یہاں سے نزدیکی بھٹ ریاض سراکس ہے اس لئے مقتول طفیل احمد کے گھر کے آس پاس جہاں بھی اینٹیں رکھی نظر آئیں وہ سب ”آر۔ سی“ مارک ہی کی ہیں۔“

میں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شہباز خان نے چونکنے والے لہجے میں کہا ”ملک صاحب، جائے وقوعہ کے نزدیک ترین پائی جانے والی ”آر۔ سی“ میک اینٹیں ہماری کچھ راہنمائی کر سکتی ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“ اس کی بات سن کر میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

شہباز خان نے بتایا ”وہ اینٹیں مقتول کے گھر کے پچھواڑے یعنی جنوبی گلی میں رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ اینٹیں عظمت باجوہ کی ملکیت ہیں اور اسی کے دروازے پر ایک جانب دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ اگر ہم عظمت باجوہ کو شامل تفتیش کر لیں تو کام کی کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اے ایس آئی شہباز خان نے پوچھا ”ملک صاحب، آپ سلمیٰ کا بیان لینے گئے تھے، کوئی کامیابی ہوئی؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ میں نے کہا ”سلطان کو ہم نے پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا ہے۔ کل اس سے مزید پوچھ گچھ کریں گے۔“

”کیا وہ طفیل احمد کے قتل سے انکاری ہے؟“ شہباز خان نے پوچھا۔

”ہاں، ابھی تک تو انکاری ہے۔“ میں نے کہا ”البتہ وہ تعویذ والا معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ سلمیٰ نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ تعویذ مقتول طفیل احمد نے سر جو پیر ہی سے بولایا تھا مگر سلمیٰ تک نہ پہنچ سکا، اس سے پہلے ہی وہ قتل کر دیا گیا۔“

وہ بولا تو حلق کی گھرائی سے تھا مگر اس کے ہونٹوں سے کوئے کی ”کائیں کائیں“ جیسی آواز برآمد ہوئی۔ اس نے لباس بھی کالے رنگ کا ہی پہن رکھا تھا۔ دھوئی اور کرتہ۔ ہم کمرے میں بیٹھی ہوئی درمی پر بیٹھ گئے۔ درمی کا رنگ بھی ہر چیز سے میچ کر رہا تھا یعنی بالکل سیاہ۔

میں نے کمرے میں چاروں جانب نظریں دوڑانے کے بعد کہا ”قبلہ“ یہ ہر طرف سیاہی سی سی کیوں پھیلی ہوئی ہے؟

”تھانے دار صاحب“ اندھیرے ہی میں سے روشنی کا ظہور ہوتا ہے۔“ اس نے مفکرانہ انداز میں جواب دیا۔ ”اندھیرا نہ ہو تو روشنی کا وجود بھی ختم ہو جائے۔ ہم یہاں اندھیرے میں بیٹھ کر دنیا جہاں کو رشد و ہدایت کا نور بانٹ رہے ہیں، اسے آپ سیاہی نہ سمجھیں۔ یہ روشنی کا منبع ہے، ہیرے کی کان ہے۔“

”واہ! سبحان اللہ! ماشاء اللہ۔“ اے ایسی آئی نے پیر سرخو کی لن ترانی پر جھوم کر داد دی جو کہ واضح طنز تھا۔

سرے والی سرکار نے مجھ سے پوچھا ”آپ بھی کوئی تعویذ وغیرہ لینے کی غرض سے آئے ہیں یا کوئی قانونی پے پیڈنگ نے پریشان کر رکھا ہے۔ کوئی ڈاکو ہاتھ نہیں آ رہا یا کسی بد معاش نے آپ کا جینا دو بھر کر رکھا ہے۔ ہمارے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔“

”او نہیں بابے او! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”اس قسم کے مسائل سے نمٹنا ہم بخوبی جانتے ہیں۔“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا ”اگر کوئی تعویذ وغیرہ نہیں لینا تو پھر کیوں آئے ہو؟“

”ہم تعویذ لینے نہیں بلکہ آپ کو ایک تعویذ دکھانے آئے ہیں۔“ اے ایس آئی نے راحت کی۔

”تعویذ دکھانے؟“ میرے کانوں میں کائیں کائیں سے مشابہ آواز آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سرخو صاحب کے چہرے پر بخنی کے آثار نمودار ہو گئے ”کیسا تعویذ؟“ اس نے کڑک کر پوچھا۔

میں نے مقتول طفیل احمد کی جب سے برآمد ہونے والا تعویذ کھول کر سرے والی سرکار کے سامنے کر دیا پھر پوچھا ”کیا یہ تخلیق آپ ہی کے ”دست مبارک“ کی ہے؟“

وہ تعویذ کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ ایک نظر تعویذ پر ڈالتا، پھر نگاہیں اٹھا کر ہمیں بھی لگتا۔ حجرے میں بسی ہوئی اگر بیویوں کی بے تحاشا خوشبو مجھے ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

”اب تو سرے والی سرکار سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔“ شہباز خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

میں نے شہباز خان کے خیال کی توثیق کر دی پھر دوسرے روز ہم دونوں پیر سرخو عرف سرے والی سرکار کے آستانے پر پہنچ گئے۔

پیر سرخو کا آستانہ بھی ویسا ہی تھا جیسا اس قسم کے پیروں کا ہوتا ہے۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی، وہاں پر آنے والے لوگوں میں عورتوں کی اکثریت تھی۔ میں نے دیکھا، ان عورتوں کے چہرے پیر سرخو کے لئے عزت و احترام کے جذبات سے چمک رہے تھے۔ پیر صاحب کا آستانہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک بڑا کمرہ انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، دوسرے بہ نسبت چھوٹے کمرے میں پیر صاحب بذات خود تشریف فرما تھے۔ ایک مجاور ٹائپ ہٹا کٹنا آدمی سب کو باری باری پیر صاحب کے حجرے میں بھیجتا تھا۔

ہم اس وقت سادہ لباس میں تھے۔ اگر ہم اپنی باری کا انتظار کرتے تو سارا دن نکل جاتا۔ اس لئے میں نے پرچی سسٹم پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور کاغذ کے ایک پرزے پر ”ملک صفر حیات“ تھانہ انچارج“ لکھ کر تہ کرنے کے بعد اسی مجاور کو دیتے ہوئے کہا۔

”یہ پیر صاحب تک پہنچا دیں۔ ہم ان کے خاص مہمان ہیں اور ہمیں واپس بھی جلدی جانا ہے۔“

مجاور نے سرتاپا ہم دونوں کا جائزہ لیا پھر وہ پرچی لے کر اندرونی کمرے میں گھس گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اندر سے برآمد ہوا۔

”پیر صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔“ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پیر صاحب کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت وہ وہاں اکیلے ہی تھے۔

ہم سے چند لمحے پہلے ایک سالک وہاں سے نکل کر گئی تھی۔ حجرے میں آکر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئلے کی کسی کان میں گھس آیا ہوں۔ شہباز خان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پیر سرخو کا رنگ توڑے سے بھی زیادہ سیاہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ بسا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بھی سیاہ رنگ کیا گیا تھا حتیٰ کہ پردوں کا رنگ بھی سیاہ ہی تھا۔ مجھے عجیب سی کراہت کا احساس ہوا۔ سرے والی سرکار کمرے کے ایک کونے میں لکڑی کی چوکی پر تشریف فرما تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ مجھے ایک کوا ہی لگا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے حلق کی گھرائی سے کہا۔

”آئیے آئیے، تشریف لائیے تھانے دار صاحب! آج کیسے راستہ بھول گئے۔“

موسیٰ خان سے کرنا چاہتی تھی لیکن سسلی، موسیٰ خان سے شدید نفرت کرتی تھی اور اس بات سے موسیٰ خان بھی بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے سسلی کا دل اپنی جانب مائل کرنے کے لئے مجھ سے تعویذ بنوایا۔ ہمارا تو کام ہی خدمت خلق کرنا ہے۔ ہم کسی کو مایوس نہیں کر سکتے نا البتہ اونچ نیچ ضرور دکھا دیتے ہیں۔ موسیٰ خان میرے پاس تعویذ لینے پہلے اور طفیل احمد بعد میں آیا تھا۔ میں نے دونوں طلب گاروں سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دیں۔ یہ دونوں میں سے کسی کی نہیں ہوگی۔ بہت خون خرابا ہو گا۔ وہ دونوں بری طرح پچھتاہیں گے مگر ان پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ موسیٰ خان ہر قیمت پر سسلی کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور سسلی صرف اور صرف طفیل احمد کو حاصل ہونا چاہتی تھی۔ ہم نے تو دونوں کو خلوص نیت سے تعویذ بنا کر دے دیئے تھے۔ وہ نہیں مانے تو اس میں تعویذوں کا بھلا کیا قصور۔ کلام الہی تو اپنا کام کرے گا نا۔“

اپنی تقریر دل پذیر ختم کر کے سرچو نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے پوچھا ”آپ کے خیال میں تعویذوں نے اپنا اثر دکھا دیا ہے؟“

”آپ خود سمجھ دار ہیں۔“

اس کے ذمہ معنی جواب کو میں بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ اس وقت میرا ذہن بڑی سرعت کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی شہباز بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے مصنوعی تشکر کے جذبات چہرے پر بجاتے ہوئے کہا ”اب لگے ہاتھ یہ بھی بتا دیں کہ موسیٰ خان کا گھر کدھر ہے؟“

”سب نیزے نیزے (قریب قریب) ہی ہیں۔“ وہ بولا ”طفیل احمد اور سفینہ بیگم کا گھر آگے پیچھے ہے۔“

سرچو کے جواب نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے شہباز خان کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

باہر آکر میں نے شہباز خان سے کہا ”اس کالے کوے کے تعویذ نے تو کیا اثر کیا ہو گا مگر لگتا ہے، موسیٰ خان نے کوئی کام ضرور دکھایا ہو گا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے افسانہ کیا ”ملک صاحب، وہ عظمت باجوہ کا گھر بھی تو اسی گلی میں ہے۔“

”ہاں، تم نے بتایا تھا۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔

چاروں طرف اتنی زیادہ اگریتیاں سلگ رہی تھیں کہ ان کے دھوئیں اور خوشبو نے فضا میں فرحت کے بجائے گھٹن کا احساس پیدا کر رکھا تھا۔

”آپ کو یہ تعویذ کہاں سے ملا؟“

اچانک حجرے کی خاموش فضا میں پیر سرچو کی آواز ابھری۔ اس نے اپنی آواز کو بار بار بنانے کی پوری کوشش کی تھی مگر ایسا کوئی تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ مگر نے سخت مگر غیر گستاخانہ لہجے میں کہا۔

”سرکار، یہ تفتیش کا کام آپ ہمارے لئے ہی رہنے دیں۔ آپ ہمیں وہ بتائیں جو ہر نے پوچھا ہے۔“

اسے میرا انداز ناگوار لگا مگر اس کے اظہار کے بجائے اس نے روکھے لہجے میں کہا ”ہاں، یہ تعویذ میرے ہاتھ کا ہی لکھا ہوا ہے۔ طفیل احمد نے اپنی متوقع ساس کو رام کرنے کے لئے بنوایا تھا۔“

”آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ طفیل احمد اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“ شہباز خان نے کہا۔

”ایسے کام کا یہی نتیجہ نکلتا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر سرچو کو دیکھا ”آپ کون سے کام کی بات کر رہے ہیں؟“

وہ مدبرانہ انداز میں گویا ہوا ”تھانے دار صاحب، ایک چیز کو دو آدمی کھینچ رہے ہوں تو جانتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟“ میں اس کی بات کو کوئی واضح معنی نہیں پہن سکا تھا اس لئے خاموش ہی رہا۔ اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئی کہا ”بڑا بھیانک نتیجہ نکلتا ہے ملک صاحب، یا تو وہ چیز ہی ٹوٹ جاتی ہے یا پھر اپنے کھینچنے والوں میں سے کسی ایک کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ بعض اوقات تو دونوں کو ہی تباہ و برباد کر دیتی ہے۔“

”قبلہ“ الفاظ ذرا آسان اور قابل فہم استعمال کریں۔“ شہباز خان نے کہا ”شاردار کناہوں کے بجائے صاف اور سیدھی بات کریں۔“

وہ آنکھیں بند کر کے مراقبے میں ڈوب گیا کچھ دیر کے بعد ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا ”صاف اور سیدھی بلکہ کھری بات یہ ہے کہ طفیل احمد، سسلی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سسلی راضی تھی مگر اس کی ماں کو یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ طفیل نے اپنی ہونے والی ساس کا دل پھٹانے کے لئے مجھ سے تعویذ لیا۔ دوسری جانب سسلی کی ماں اپنی بیٹی کی شادی اپنی بہن کے بیٹے

”کوئی بھی نہیں۔ بس میں ہوں۔“ سفینہ بیگم نے بتایا ”ہم ماں بیٹے کا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔“

میں نے اے ایس آئی شہباز خان کو ایک کانٹیل کے ساتھ مین بازار کی طرف روانہ کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ وہ فی الفور موسیٰ خان کو گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔ پھر میں نے سفینہ بیگم سے کہا۔

”ابھی تمہارا وہ بھلے مانس پتر گرفتار ہو کر یہاں آ جاتا ہے۔ جب تک ہم گھر کی تلاشی لیں گے۔“

اس نے گھر میں ہماری مداخلت پر تھوڑا پس و پیش کیا مگر میں نے ایک زبردست دھکا مار کر اسے سیدھا کر لیا ”بی بی“ زیادہ اڑی نہ کر ورنہ میں تجھے بھی باندھ کر تھانے لے جاؤں گا اور اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ تجھے بھی حوالات میں بند کر دوں گا۔“

وہ میری دھمکی میں آگئی اور اندر جانے کے لئے اس نے ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ میں کانٹیل کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ پانچ مرلے پر بنا ہوا ایک اوسط درجے کا مکان تھا۔ اس کے پیچھے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا اس کے بعد صحن تھا۔ صحن میں ایک جانب باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک بانس کی سیڑھی باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس گھر میں موسیٰ خان کے باپ فرید خان کا انتقال ہو چکا تھا۔ سفینہ بیگم نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد موسیٰ خان نے مین بازار والی دکان سنبھال لی تھی۔ وہ جدی پشتی تمباکو کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

میں نے گھوم پھر کر اچھی طرح پورے گھر کی تلاشی لے لی مگر کوئی قابل گرفت چیز برآمد نہ ہوئی۔ پھر میں بانس کی سیڑھی کے ذریعے باورچی خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ باورچی خانے کی چھت پچھنے کمروں کی بہ نسبت خاصی نیچی تھی اور باورچی خانے کی چھت پر سے کمروں کی چھت پر جانے کے لئے وہاں ایک اور چھوٹی سی سیڑھی موجود تھی۔ اس کے صرف تین قدم تھے۔ میں اس ننھی منی سیڑھی کے ذریعے کمروں کی چھت پر پہنچ گیا۔

یہاں آکر مجھ پر واضح ہوا کہ سفینہ بیگم کے گھر کی چھت طفیل کے مکان سے قریباً ایک فٹ نیچے تھی۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس چھوٹی سیڑھی کو چھت کے مشرقی کونے میں لگایا پھر اس پر چڑھ کر پردے کی دوسری جانب جھانکا۔ یہ وہ کونہ تھا جہاں سفینہ بیگم کے گھر کی چھت کے پردے کی مشرقی اور شمالی دیواریں آپس میں ملتی تھیں۔ میری

شہباز خان بولا ”تو پھر ادھر ہی چلتے ہیں۔“  
”ادھر تو جانا ہی ہے شہباز خان۔“ میں نے کہا ”لیکن پہلے ذرا تھانے سے ہو لیں۔“  
پھر ہم تیزی سے تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔



ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم موسیٰ خان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرے ساتھ اس وقت شہباز خان کے علاوہ دو کانٹیل بھی تھے اور ہم سب سرکاری وردی میں تھے۔ موسیٰ خان کا گھر عظمت باجوہ کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ موسیٰ خان کے گھر کی پشت طفیل کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ میں نے عظمت باجوہ کے گھر کے سامنے اینٹوں کے چنے دیکھ لئے تھے۔ وہ سب ”آر۔ سی“ مارک کی اینٹیں تھیں اور بالکل کوری۔

شہباز خان نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ چالیس بیالیس سال کی ایک صحت مند عورت دروازے میں نمودار ہوئی پھر اپنے سامنے وردی پوش پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرا گئی ”ہائے میں مر گئی۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا مگر میں نے آگے بڑھ کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

میں نے کہا ”بی بی“ سفینہ بیگم تمہارا ہی نام ہے؟“  
اس نے اثبات میں جواب دیا ”میں نے پوچھا تمہارا پتر موسیٰ کدھر ہے؟ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

”اس نے کیا کیا ہے؟“  
”اس نے طفیل احمد کو قتل کیا ہے۔“  
وہ جلدی سے بولی ”آپ کو مغالطہ لگا ہے تھانے دار صاحب“ میرا پتر ایسا نہیں ہے۔“  
”سب ماؤں کا اپنے بیٹوں کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”اپنے بیٹے کو باہر نکالو۔“

”وہ اس وقت گھر میں نہیں ہے۔“  
”کہاں گیا ہے وہ؟“  
وہ بولی ”دکان پر ہوتا ہے وہ اس وقت۔ ادھر مین بازار میں اس کی تمباکو کی دکان ہے۔“

”گھر میں اور کون کون ہے؟“

برے پاس۔“  
سفینہ بتیم نے بت کو شش کی کہ ہم اس کے بیٹے کو بے قصور تسلیم کر لیں مگر یہ  
ارے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس دوران میں پورے محلے کو پتہ چل چکا تھا کہ پولیس نے  
بل احمد کے قتل کے الزام میں موسیٰ خان کو گرفتار کر لیا ہے۔ ہمارے آس پاس اچھے  
سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں مقتول طفیل احمد کا باپ کبیر علی اور بھائی حبیب احمد بھی  
تھے۔

کبیر علی نے مجھ سے پوچھا ”ملک صاحب، موسیٰ نے اقبال جرم کر لیا ہے۔“  
”بھولے بادشاہ، مجرم اتنی آسانی سے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرتے۔ اس مقصد کے  
لئے انہیں تھانے میں ”سمنان“ رکھنا پڑتا ہے۔ حوالات کی ”روح پرور“ ہوا کھانے کے بعد  
وہ کچھ اگنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔“

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”آپ کا جیسے جی چاہے، تفتیش کریں مگر  
انہیں چاہتا کہ کسی بے گناہ کا خون میری گردن پر آئے۔ اسی لئے میں نے کسی پر اپنے  
کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ میرے بیٹے کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔“  
”تم فکر نہ کرو کبیر علی۔“ میں نے اس سیدھے سادے شخص کی سادگی پر دل میں ہنستے  
ئے بظاہر تسلی آمیز لہجے میں کہا ”ہم بے گناہ اور قصور وار کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔  
ری گردن پر کسی کا خون نہیں آئے گا۔“

پھر ہم موسیٰ خان کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ گئے۔



موسیٰ خان کے سلسلے میں مجھے عدالتی ریمانڈ کی ضرورت نہیں پڑی۔ حوالات میں  
لدی ہوئی ایک ہی رات نے اس کا مزاج ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا جو  
کما کی روایتی ”سمنان نوازی“ کا لطف اٹھاتا رہتا۔ معمولی درگت کے بعد وہ لائن پر آگیا  
اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ اس نے جو اپنا بیان لکھوایا، اس کا خلاصہ یہ تھا۔  
”وہ دل و جان سے سلسلی پر عاشق تھا مگر سلسلی کی ٹکاپیں کسی اور ہی صورت پر تکی ہوئی  
۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ سلسلی اور طفیل چھپ چھپ کر راتوں میں چھت پر  
ہیں۔ اس نے کئی مرتبہ انہیں اپنی آنکھوں سے راز و نیاز کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ان  
کی چھتیں ملی ہوئی تھیں اس لئے ایک دوسرے پر نظر رکھنا ان کے لئے خاصا آسان  
نہ ہوتا تھا۔ موسیٰ خان نے اپنی پستقامتی اور نیچی چھت کی مشکل کو چھوٹی سیڑھی سے

نظروں نے جو کچھ دیکھا، وہ بت اہم اور چونکا دینے والا تھا۔

یہ طفیل کی چھت کا وہی کوٹا تھا جہاں اسے قتل کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں روشنی کا  
ایک جھمکا سا ہوا اور ساری صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ طفیل وقوعہ کے  
روز جب سلسلی کا انتقام کر رہا تھا تو یہاں سے با آسانی اس پر وار کیا جاسکتا تھا اور یہ وار یقیناً  
موسیٰ خان نے کیا ہو گا۔ اس کے پاس طفیل کو قتل کرنے کا ایک مضبوط جواز موجود تھا۔ وہ  
سلسلی کو حاصل کرنا چاہتا تھا مگر طفیل اس کے رستے کا کٹنا ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس کانے کو  
پھننے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔ چاہے وہ سرچو کا تعویذ ہو یا اینٹ سے وار کرنے  
کی کارروائی۔

گلی میں شور کی آواز سن کر میں چھت سے اتر آیا۔ شہباز خان، موسیٰ خان کو گرفتار کر  
کے لے آیا تھا۔ موسیٰ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہاں تک آتے آتے اس کی اچھی خاصی  
خاطر تواضع بھی کی گئی تھی۔

موسیٰ خان پستقامت اور خاصا ڈیل ڈول والا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں  
اس وقت خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ شہباز خان نے اسے ایک ٹھڈا رسید کرتے ہوئے  
کہا ”ملک صاحب، بڑی مشکل سے قابو آیا ہے یہ۔ ہمیں دیکھے ہی یہ دکان چھوڑ کر بھاگ لگا  
تھا۔“

”کیوں اوئے تلو نڈی موسیٰ خان؟“ میں نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ”اپنی ماں  
کے یار کو کیوں قتل کیا تم نے؟“

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا جناب۔“ وہ روئی صورت بنا کر بولا۔

شہباز خان نے ایک جھانپڑ رسید کرتے ہوئے خوں خوار لہجے میں پوچھا ”اوئے، کھوٹے  
دے کھر۔ ہمیں دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کیوں کی تھی تم نے؟“

میں نے کہا ”موسیٰ خان“ ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔ تمہارے پیر سرچو۔۔۔ بھی ہمیں  
تمہارے بارے میں بت کچھ بتایا ہے اور میں نے خود اس جگہ کا معائنہ بھی کر لیا ہے۔ جہاں  
گھات لگا کر تم نے اپنے رقیب کو شکار کیا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ چپ چاپ  
اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ ہمیں اقرار کرانے کے بت سے طریقے آتے ہیں۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا سرکار۔“ وہ سسے ہوئے لہجے میں بولا ”میں تو.....“  
”یہ ایسے نہیں مانے گا ملک صاحب۔“ شہباز خان نے اس کی کمر پر ایک دھوکا برسایا  
”اے تھانے لے کر چلیں۔ میں خود اس کی زبان کھلوادوں گا۔ اس گور بجو کا فارمولا ہے



حل کر لیا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی اس نے اسی میڑھی پر چڑھ کر طفیل احمد کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔

## زمین اندوز

لاہور سے راولپنڈی جائیں تو راستے میں گجرات کے بعد کھاریاں سے پہلے ایک چھوٹا سا شہر پڑتا ہے، لالہ موسیٰ۔ لالہ موسیٰ کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہاں بہت بڑی غلہ منڈی ہے۔ اس غلہ منڈی سے ہزاروں ٹن کے حساب سے اناج ٹرکوں میں بھر کر ملک کے طول و عرض میں پہنچایا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند سالوں میں کچھ عرصے کے لئے میں لالہ موسیٰ کے ایک تھانے میں بھی متعین رہا۔ جو واقعہ آج میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، یہ اسی دور کا ہے۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ میں فجر کی نماز ادا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ان دنوں میری رہائش سرکاری کوارٹر میں تھی جو تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے شبینہ ڈیوٹی والا ایک کانشیبل کھڑا تھا۔ اس نے سیلوٹ کرنے کے بعد کہا ”ملک صاحب“ ادھر ریلوے لائن کے پاس ایک بندہ گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔“

”ادھر کدھر؟“

”ادھر“ ریلوے اسٹیشن سے پہلے۔“ کانشیبل نے بتایا ”جہاں پنکڑوں نے اپنی جھگیاں ڈال رکھی ہیں۔“

ریلوے اسٹیشن سے کچھ پہلے اور بعد میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پنکڑوں، خانہ بدوشوں اور پنجابوں وغیرہ نے جھگیاں بنا رکھی تھیں۔ اس زمانے میں یہ شہر ابھی زیادہ پھیلا نہیں تھا اور ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کا علاقہ زیادہ تر دیران ہی تھا۔ میں نے کانشیبل سے پوچھا۔

”اے ایس آئی احمد حسن تھانے ہی میں ہے؟“

”جی سر۔“

میں نے کہا ”اس سے کہو“ دو کانشیبلوں کے ساتھ فوراً موقع پر پہنچے۔ میں بھی تیار ہو کر آتا ہوں۔“

اگرچہ موسیٰ کی ماں سفینہ بیگم نے اس کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ بمن کی بیٹی کو اپنے گھر ضرور لائے گی۔ حسینہ بیگم بھی اس رشتے پر کمر بستہ تھی۔ مگر کے کسی فرد نے اس رائے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ڈالی تھی مگر سہلی جس سے موسیٰ کی شادی ہونا تھی وہی کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک دو بار موسیٰ نے موقع پا کر سہلی کو اپنے دلی جذبات سے آگاہ کرنا چاہا تو اس نے موسیٰ کو بری طرح جھڑک دیا تھا بلکہ یہ کہیں تو زیادہ مناسب ہو گا کہ سہلی نے موسیٰ کی بے عزتی کی تھی۔ مایوس و نامراد موسیٰ نے دل برداشتہ ہو کر سرے والی سرکار کے آستانے کا رخ کیا اور ”سنگ دل سے سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں“ والا تعویذ لے آیا لیکن خاصا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی جب تعویذ کی کوئی ”کرامت“ ظاہر نہیں ہوئی تو ایک رات اس نے حتیٰ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر آٹھ تاریخ کی صبح ہونے سے قبل ہی اس نے اپنے رقیب سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

میں نے چالان تیار کر کے دوسرے روز اسے عدالت میں پیش کر دیا۔ سرحدی پیر کی ایک بات جزوی طور پر سچ ثابت ہوئی تھی۔ سہلی دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں ملی تھی۔ ایک نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے، دوسرے کی پوری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرنے والی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، محبت اور جنگ میں سب چلتا ہے۔ محبت اور جنگ میں اگر کامیابی ہو جائے تو انسان سرشار اور مالا مال ہو جاتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں جہاں اور ہلاکت خیزی ہی حصے میں آتی ہے۔ چاہے وہ جہاں کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہو۔

طفیل احمد اپنے رقیب کی نفرت کا نشانہ بنا اور انتقام کی بھیشت چڑھ گیا۔ موسیٰ خان کو اس کے کئے کی سزا ملی۔ سہلی نے تاحیات شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ پوری زندگی محبوب کی یادوں کے سارے بسر کرنا چاہتی تھی۔ اگر محبت کرنا واقعی جرم نہیں ہے تو اللہ جانے، سہلی کو کس جرم بے گناہی کی سزا ملی۔ اللہ کی مصلحتیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے! یہ عشق انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سلطان کو میں نے اسی روز چھوڑ دیا تھا۔



کانشیل چلا گیا تو میں نے جلدی جلدی وردی پہنی۔ اس وقت تک سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ کانشیل کی اطلاع کے مطابق جس جگہ حادثہ پیش آیا تھا وہ تھانے سے زیادہ دور نہیں تھی اور مذکورہ گاڑی پشاور یا راولپنڈی سے آنے والی ہی ہو سکتی تھی کیونکہ اس زمانے میں لاہور سے آنے والی کوئی گاڑی علی الصبح لالہ موسیٰ سے نہیں گزرتی تھی۔ آج کل کا مجھے علم نہیں ہے۔

اگلے دس منٹ میں 'میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ میں تھانے پہنچا تو پوری طرح اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اے ایس آئی احمد حسن میری ہدایت کے مطابق موقع کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ حادثے کی جگہ پر اچھے خاصے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تعداد قریبی جگہوں میں بسنے والے خانہ بدوشوں کی تھی۔ کچھ فاصلے پر جا کر ٹرین بھی رک گئی تھی۔ اس کا انجن والا حصہ پلیٹ فارم میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے ٹرین کا شکار ہونے والے شخص کا جائزہ لیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ متونی چوبیس سال کا ایک خوب رو اور صحت مند جوان تھا۔ اس نے لمبے کی شلوار کے اوپر بوسکی کی قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے ایکہ دو رنگی جرسی بھی پہن رکھی تھی جس میں سرخ اور نیلے رنگ کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں اس کے جڑے کا کالا جوتا تھا اور گرم جرابیں بھی تھیں میں نے اس کی لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو مجھے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا لیکن وہ غیر معمولی بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ ٹرین نے اس کے جسم کو بری طرح کچل دیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہاں زیادہ خون نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اس بد قسمت شخص کی جامہ تلاشی لی تو اس کی جیبوں سے چند کاغذات برآمد ہوئے۔ سامنے والی جیب سے ایک فیکری کارڈ بھی ملا۔ اس کارڈ پر چسپاں تصویر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کارڈ اسی حادثے کا شکار ہونے والے شخص کا تھا۔ اس کارڈ پر اس کا نام جمیل اختر درج تھا۔ فیکری کا نام "مسجد الکیشریکل انڈسٹریز" اور ایڈریس جی۔ ٹی روڈ گجرات کا تھا۔ سائیڈ پاکٹ سے ملنے والے پرس میں تقریباً ساڑھے چار سو روپے کی رقم موجود تھی۔ پرس کے ایک خانے میں "نیو خان بس سروس" کا ایک ٹکٹ بھی موجود تھا جس کے مطابق جہلم سے لالہ موسیٰ تک سفر کیا گیا تھا تاہم اس ٹکٹ پر کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں تھی۔ اس کے علاوہ متونی کی بائیں کلائی پر ایک کبھی گھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ ان تمام اشیاء میں قابل ذکر چیز وہ فیکری کارڈ تھا جس کے ذریعے متونی کا کوئی سراغ مل سکتا تھا یعنی اس کے

بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اے ایس آئی جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کر چکا تو میں نے پوچھا "احمد حسن، حادثے کی اطلاع کس نے دی تھی؟" "ایک خانہ بدوش تھا جناب!" اے ایس آئی نے جواب دیا "ابھی یہاں کھڑا تھا۔" وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

"میں ہوں سرکار۔" مسکین سی صورت والے ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا "میرا نام غلام حسین ہے۔ یہ جھگی میری ہے۔" اس نے ایک نزدیکی جھگی کی جانب اشارہ کیا۔ متونی جیل اختر کی لاش اس جھگی کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی نے کہا "ملک صاحب، غلام حسین تو ہمیں رہے گا۔ اس کا بیان بعد میں لے لیں گے۔ پہلے آپ ٹرین کے ڈرائیور کا بیان لے لیں۔ ٹرین کافی دیر سے پلیٹ فارم پر رکی ہوئی ہے، مسافر پریشان ہو رہے ہیں۔"

"کدھر ہے وہ ڈرائیور؟" میں نے پوچھا۔ "اے ایس آئی نے ایک شخص کو آگے کرتے ہوئے کہا "یہ رہا جناب۔" وہ لگ بھگ چالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے اپنا نام نیاز علی بتایا پھر کہا "تھانے دار صاحب، اس حادثے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ دھند اتنی تھی کہ مجھے کچھ لگائی نہیں دیا۔"

"نیاز علی، تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے پوچھا "یہ حادثہ اتفاقاً پیش آیا ہے یا یہ شخص جان بوجھ کر ٹرین کے سامنے آیا تھا۔ میرا مطلب ہے، کہیں یہ خودکشی کا کیس تو نہیں؟" اس واقعے نے نیاز علی کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولا "جناب! میں نے عرض کیا ہے تاکہ دھند اتنی زیادہ تھی کہ تھوڑے فاصلے کا منظر بھی دکھائی دینا مشکل رہا تھا۔ پھر اسٹیشن چونکہ قریب آچکا تھا اس لئے ٹرین کی رفتار بھی خاصی کم تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے حسب عادت و سہل بھی بجایا تھا۔ اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے ہم و سہل ضرور بجاتے ہیں۔"

میں نے اچانک پوچھا "تم نے بتایا ہی کہ دھند کے سبب تمہیں یہ شخص نظر نہیں آیا تو پھر اس حادثے کے بعد تم نے ٹرین کیوں روک دی۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان کے نیچے آ چکا ہے؟"

"میرے ساتھ بیٹھے ہوئے فارمین نے میری توجہ اس طرف دلائی تھی۔" نیاز علی نے

بائیں جانب ہی بیٹھا ہوا تھا جس نے ڈرائیور کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔ میں قمر علی کو فارغ کر کے ٹرین کے گاڑی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا وہ خاصی دیر سے مضطرب تھا اور بار بار گھڑی پر نظر ڈالتا تھا۔

گاڑی نے بیزار کن لہجے میں کہا ”جناب تھانے دار صاحب، بیان شیان بہت ہو چکے۔ اب ہمیں جانے کی اجازت دیں۔ آپ کی اور کتنی کارروائی باقی ہے۔ ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔ آخر ہم بھی کسی کو جواب دہ ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں گاڑی صاحب، میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں پڑنے دوں گا۔“

میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”آپ کی لاگ بک کہاں ہے؟“

اس نے اشارے سے بتایا ”وہ آخری ڈیا میرا ہے۔ لاگ بک اسی میں رکھی ہے۔“

پھر میرے کہنے پر گاڑی اپنے ڈبے سے لاگ بک لے آیا۔ میں نے ٹرین کی تاخیر کے ضمن میں مختصراً اس حادثے کے بارے میں تحریر کر کے دستخط کر دیئے۔ گاڑی نے لاگ بک واپس لے کر میرا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس کے بعد میں خادم حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

خادم حسین نے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ دوسرے خانہ بدوشوں کی طرح اس کی جھگی بھی ٹرینوں کی گزر گاہ کے بہت نزدیک تھی اس لئے ٹرینوں کی آمد و رفت اور ان کے شور شرابے کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ وہ صبح بہت جلد بیدار ہو جاتا تھا۔ حسب معمول آج جب وہ بیدار ہوا تو اس کے کانوں میں ٹرین کا وہل اور پھر اس کے گزرنے کا شور سنائی دیا۔ اس نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہ دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک غیر مانوس آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی چیز دھپ سے اس کی جھگی کے قریب آ کر گری تھی۔ ٹرین کے شور میں اس نے یہ آواز واضح طور پر سنی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر آیا تو اس کی نظر گھڑی نما اس چیز پر پڑی جس کی آواز ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جھگی میں سنی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر وہ اس پر اسرار گھڑی کے نزدیک چلا گیا۔ پھر ساری صورت حال اس پر واضح ہو گئی۔ اس وقت تک ٹرین جگیوں کے پاس سے گزر چکی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اسٹیشن تھا مگر خادم حسین کے بیان کے مطابق جب اس نے ٹرین کو پلیٹ فارم پر پہنچنے سے پہلے ہی رکتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ ٹرین والوں کو بھی اس حادثے کا پتہ چل چکا ہے۔ تھانہ جگیوں کے بونکے نزدیک ہی تھا اس لئے وہ اس واقعے کی رپورٹ کرنے بھاگ بھاگ تھانے پہنچ گیا۔

خادم حسین اپنی وضع قطع سے ایک مسکین آدمی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے بیان میں

مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”اس نے کسی چیز کو ٹرین سے ٹکرا کر سائیڈ میں گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“ اس نے ایک لمحہ رک کر گہری سانس لی پھر بولا ”اس کے ساتھ ہی کسی مسافر نے ہنگامی زنجیر کھینچ دی تھی۔ مجھے مجبوراً ٹرین روکنا پڑی یعنی چند گز پہلے ہی روکنا پڑی ورنہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر تو اسے رکنا ہی تھا۔“

میں نے دو چار رسمی سوالات کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی اور اس مسافر کو بلا لیا جس نے ٹرین کی زنجیر کھینچی تھی۔ اس کا نام قمر علی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہاتھ روم جانے کی غرض سے کھڑا تھا مگر ہاتھ روم میں پہلے سے کوئی موجود تھا اس لئے وہ دروازے میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین کی رفتار سست ہو چکی تھی۔ اگرچہ باہر ابھی اندھیرا تھا مگر ٹرین کے دروازے سے باہر کا دھندلا دھندلا نظارہ بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ٹرین کے انجن سے کوئی گھڑی نما چیز ٹکرا کر دور اندھیرے میں جا گری ہے۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی پیدا ہوا کہ کوئی بندہ ٹرین سے ٹکرایا ہے۔ اس فوری خیال کے رد عمل میں اس نے زنجیر کھینچ دی تھی۔

اس کا بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا ”قمر علی، کیا تم پہلی مرتبہ ٹرین میں سوار ہوئے ہو؟“

وہ میرے اس عجیب و غریب سوال پر بوکھلا گیا پھر سنبھل کر بولا ”نہیں جناب، سیکڑوں مرتبہ ٹرین میں سفر کر چکا ہوں۔“

”پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ جب اسٹیشن نزدیک آ رہا ہو تو ہاتھ روم استعمال نہیں کرتے؟“

اس نے تھینبی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر جواب دیا ”میں یہ بات جانتا ہوں جناب۔ لیکن یہ ”ضرورت“ ہی ایسی ہے کہ بڑے بڑے مجبور ہو جاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”تم کون سی بوگی میں سفر کر رہے ہو؟“

”انجن سے پیچھے والی دوسری بوگی میں۔“

”جب تم نے انجن سے کسی چیز کو ٹکرا کر اندھیرے میں گرتے دیکھا تو اس وقت تم کون سے دروازے میں کھڑے تھے؟“

قمر علی نے بتایا ”میں اس وقت ٹرین کے بائیں دروازے میں کھڑا تھا۔“

اس کے جواب میں وزن تھا۔ ہم اس وقت جہاں کھڑے تھے یعنی جہاں حادثہ پیش آیا تھا وہ ٹرین کی بائیں سمت ہی تھی۔ پھر ڈرائیور کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ فارمین بھی

کوئی ہیر پھیر نظر نہ آیا تاہم اپنی تسلی کے لئے میں نے اس سے دو چار سوالات ضرور کئے۔ میں نے پوچھا ”خادم حسین“ تم نے بتایا ہے کہ کسی چیز کے گرنے کی غیر معمولی آواز سن کر تم جھگی سے باہر آئے تھے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، باہر آ کر تم نے سب سے پہلے کیا دیکھا تھا؟“ وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا ”یہی دیکھا تھا جناب۔“ اس نے متونی جمیل اختر کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔

شاید وہ میرا سوال پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”اس کے علاوہ تم نے کیا دیکھا تھا۔ اس پاس کوئی آدمی یا کوئی غیر معمولی بات؟“

دراصل بات یہ تھی کہ لاش کی حالت سے میں نے اندازہ لگایا تھا، جمیل اختر پوری طرح گاڑی کی نیچے نہیں آیا تھا کیونکہ اس صورت میں اس کے وجود کا صحیح سلامت رہنا ممکن نہیں تھا۔ زیادہ نہیں تو اس کا جسم دو ٹکڑوں میں تو تقسیم ہو ہی جاتا۔ جب کہ متونی کا جسم مختلف جگہ سے کچلے جانے کے باوجود موجود تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ٹرین سے اس کا جزوی ٹکراؤ ہوا تھا اور انجن نے ایک زور دار دھکے سے اسے دور پھینک دیا تھا۔ اس صورت میں ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نے دانستہ اسے دھکا دے کر ٹرین کے سامنے کر دیا ہو۔ یہی جاننے کے لئے میں نے خادم حسین سے یہ سوال کیا تھا۔

”نہیں جناب، میں نے کسی اور بندے کو یہاں نہیں دیکھا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”خادم حسین“ تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے یہی سوال وہاں پر موجود دوسرے افراد سے بھی باری باری کیا۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کوئی بھی شخص متونی سے واقف نہیں تھا۔ وہ سب کے لئے اجنبی تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی تھی کہ متونی اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔

اس کی جیب سے برآمد ہونے والے فیکٹری کارڈ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ گجرات میں ملازمت کرتا تھا۔ نیو خان بس سروس کے کنکٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہلم سے لالہ موی پنچا تھا۔ ویسے یہ ایک کمزور امکان تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کنکٹ پرانا ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے موٹے کیش میو اور لاریوں بسوں کے کنکٹ وغیرہ استعمال کرنے کے بعد پھینکنے کے بجائے جیبوں میں ہی بھرے رکھتے ہیں۔ ویسے مجھے امید تھی کہ متونی جمیل اختر کا تعلق اگر لالہ موی سے نہیں تھا تو گجرات یا جہلم سے ضرور تھا۔

اگر یہ اتفاقی حادثہ نہیں تھا تو دوسرے امکانات کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ یہ کسی

چور اچکے یا اٹھائی گیرے کی حرکت بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ایسی صورت میں متونی کی کلائی پر نہ تو گھڑی موجود رہتی اور نہ ہی اس کے پرس سے نقدی برآمد ہوتی۔ دوسرا امکان خودکشی کا تھا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہو۔ ابھی میں مکمل طور پر اندھیرے میں تھا۔ جب تک متونی کی شناخت نہ ہو جاتی، میں کوئی واضح تفتیشی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

میں نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد متونی جمیل اختر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے مقامی اسپتال بھجوا دیا۔



پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کی مطابق متونی جمیل اختر کی موت چار دسمبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن پر ایسے نشانات بھی پائے گئے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اس کی گردن خاصی دیر تک دوپے رکھی ہوگی۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت میں اس کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی۔ بہر حال میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ متونی کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جمیل اختر کو قتل کیا گیا تھا اور ٹرین سے ٹکراؤ سے کوئی پانچ چھ گھنٹے قبل وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ جو کوئی بھی اس کا قاتل تھا اس نے اس واقعے پر پردہ ڈالنے کے لئے اسے حادثے کا رنگ دیا تھا مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس کے فریب کی قلعی کھول دی تھی۔ واضح رہے کہ جائے وقوعہ کی کارروائی پانچ دسمبر کی صبح کو کی گئی تھی۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ایک قتل کی واردات تھی، میں نے مقتول کی شناخت کے لئے اس کی تصویریں دوسرے علاقے کے تھانوں کو بھجوا دیں اور ایک نامعلوم قاتل کے خلاف رپورٹ درج کر کے تفتیش کا آغاز کر دیا۔ میرا پہلا ٹارگٹ وہ فیکٹری تھی جہاں مقتول کام کرتا تھا۔ میں نے اپنے علاقے کے ایس بی کو پوری صورت حال سے آگاہ کیا اور اس کی اجازت سے گجرات پہنچ گیا۔ سب اسپیکر فضل کریم میرے ساتھ تھا۔

میں نے گجرات میں پولیس ہیڈ کوارٹر اور متعلقہ تھانے کو اپنے کام سے مطلع کیا اور بدھا ”ساجد الیکٹرکل انڈسٹریز“ پہنچ گیا۔ یہ فیکٹری مین جی ٹی روڈ پر تھی اور وہاں بجلی کی لوڑیں اور پنکھے بننے تھے۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے اور فیکٹری میں بڑے زور

شور سے کام جاری تھا۔

دفتر میں میری ملاقات فیکٹری کے مینجر سے ہوئی۔ اس کا نام اشفاق بخاری تھا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا ایک ذیلا پتلا آدمی تھا۔ اپنی جسامت کی مناسبت کے بالکس اس نے گھنی اور بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس وقت ہم سادہ لباس میں تھے اس لئے بات چیت سے پہلے میں نے اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا۔

”میرا نام ملک مضطر حیات ہے۔“ میں نے کہا ”میں لالہ موسیٰ کے ایک تھانے کا انچارج ہوں۔ ہم ایک ضروری تفتیش کے سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔“ اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا پھر میز کے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے خوشامدانہ لہجے میں بولا ”تشریف رکھیں جناب۔“ ہم بیٹھ چکے تو اشفاق بخاری نے دفتر ہی میں موجود ایک چہرہ اسی صورت شخص کو حکم دیا ”اوئے منظورے‘ جا۔ تھانے دار صاحب کے لئے اچھی سی دودھ پتی بھالالہ۔“

”نہیں بخاری صاحب‘ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا پھر منظورے نامی اس شخص کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اشفاق بخاری کی جانب مڑ کر کہا ”ہم اس وقت ڈیوٹی پر ہیں۔ آپ یہ تکلیف رہنے ہی دیں۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔“

اشفاق بخاری نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور سنجیدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا ”فرمائیے ملک صاحب‘ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

میں نے اپنی جیب سے مقتول جمیل اختر کا فیکٹری کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا ”یہ شخص آپ کی فیکٹری میں کام کرتا ہے؟“ ”جی ہاں‘ یہ ہماری ہی فیکٹری کا ملازم ہے۔ بہت اچھا موثر فٹر ہے۔“ اشفاق بخاری۔

جواب دیا پھر اچھے ہوئے لہجے میں سوال کیا ”کیا بات ہے ملک صاحب‘ خیریت تو ہے؟“ ”خیریت نہیں ہے بخاری صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

جمیل اختر کتنے دن سے فیکٹری نہیں آ رہا؟“ وہ گڑبڑا کر بولا ”وہ بات دراصل یہ ہے کہ جناب میں گزشتہ روز فیکٹری نہیں آیا تھا مگر میں میرے بیٹے کی شادی کا ہنگامہ چل رہا ہے اس لئے کئی روز سے فیکٹری کے معاملہ بھی پوری طرح نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا ”لیکن آ۔“

لگنہ کریں‘ میں ابھی سب معلوم کر لیتا ہوں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے منظورے کو حکم دیا ”اوئے منظورے‘ بس کے جا اور اندر سے مسز جمیل کو بلا لا۔“

منظورا وہاں سے چلا گیا تو اس نے مجھے بتایا ”مسز جمیل فٹنگ ڈیپارٹمنٹ کا انچارج ہے۔ جمیل اختر اسی کے ساتھ کام کرتا ہے۔“ پھر اس نے مجھ سے سوال کیا ”مسئلہ کیا ہے ملک صاحب‘ کہیں جمیل کو کوئی حادثہ وغیرہ۔۔۔“

میں نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے کہا ”چار دسمبر کی رات کو کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔ ہمیں اس کی لاش لالہ موسیٰ ریلوے اسٹیشن کے قریب پڑی ملی ہے۔ یہ فیکٹری کارڈ اس کی جیب سے نکلا ہے جس کے سہارے ہم آپ تک پہنچے ہیں۔“

”اوئے!“ اشفاق بخاری نے ایک گہری سانس خارج کی اور خاموش ہو گیا۔ وہ اچانک بہت زیادہ افسردہ ہو گیا تھا۔

اتنی دیر میں مسز جمیل اختر کے اندر داخل ہوا۔ وہ کام کے کپڑوں میں لباس تھا جن پر جا بجا تیل اور گریس کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مینجر اشفاق بخاری سے کہا ”باؤ جی‘ آپ نے مجھے بلایا ہے؟“

”ہاں استاد جمیل۔“ اشفاق بخاری نے بوجھل لہجے میں کہا ”یہ تھانے دار صاحب ہیں۔ لالہ موسیٰ سے آئے ہیں۔“ اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا ”لالہ موسیٰ میں انوار کی رات کسی نے جمیل اختر کو قتل کر دیا ہے۔“

”جمیل اختر کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟“ اس نے اشفاق بخاری کا آخری جملہ دہرایا پھر خوف زدہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا ”کس نے قتل کیا ہے اسے۔ اس کی تو کسی سے دشمنی وغیرہ بھی نہیں تھی؟“ پھر وہ افسوس ناک انداز میں سر ہلانے لگا۔

میں نے پوچھا ”اس کا گھر کدھر ہے؟“ ”کیا گھر ہو گا اس کا۔“ مسز جمیل نے شکستہ لہجے میں کہا ”چھڑا چھانٹ تھا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ادھر بھڑی گلی میں کسی کا کرایہ دار تھا۔“

میں نے تعجب آمیز لہجے میں دریافت کیا ”کیا مطلب‘ اس کے گھر والے کہاں ہیں؟ کیا وہ اسی ضلع کا رہنے والا نہیں تھا؟“

”اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی جناب!“ مینجر اشفاق بخاری نے بتایا ”وہ چار پانچ سال سے ہمارے یہاں کام کر رہا تھا مگر اس نے کبھی اپنے بارے میں کھل کر

نہیں بتایا۔ کچھ لوگوں نے اسے کریدنے کی کوشش بھی کی تو وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتا تھا۔

میں نے کہا ”کمال ہے“ ایسے پر اسرار آدمی کو آپ نے اپنی فیکٹری میں ملازم رکھا ہوا تھا جس کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہی نہیں!“

”ملک صاحب، ہم کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔“ اشفاق بخاری نے کہا ”وہ ہمارے کام کا آدمی تھا اس لئے ہم نے اسے کام پر رکھ لیا۔ باقی معاملات سے ہمیں کیا لینا دینا۔“

میں نے مستری مجید سے سوال کیا ”استاد جی، جمیل اختر اتنے دن سے غائب ہے۔ آپ کو اس کے بارے میں تشویش نہیں ہوئی؟“

”وہ آخری دن دو تاریخ کو فیکٹری آیا تھا۔“ مستری مجید نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ”مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ مجھے کا دن تھا۔ جمیل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دوسرے روز یعنی تین تاریخ کو چھٹی کرے گا۔ اس سے اگلے دن اتوار تھا۔ اس طرح اسے دو دن کی چھٹی مل جاتی یعنی ہفتہ اور اتوار کی۔ اس کا ارادہ لاہور جا کر گھومنے پھرنے کا تھا۔“

”جب وہ پیر کو بھی فیکٹری نہیں پہنچا تو آپ نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”کیا کرنا تھا جناب۔“ مستری مجید نے کہا ”میں نے سوچا، وہیں رک گیا ہو گا کسی پاس۔ اس عمر میں آدمی موجد میلنا کرتا ہی ہے نا جناب۔“

”حیرت کی بات ہے استاد مجید۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”آج سات تاریخ ہو گئی ہے۔ آپ کا ایک کاریگر اتنے دن سے غائب ہے۔ آپ کو کام میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آ رہی؟“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا ”مجھے میمن صاحب نے بتایا ہے کہ جمیل اختر بہت عمدہ موٹر فٹر تھا۔ ایسے کاری گروں کی تو فیکٹری کو ہر لمحہ ضرورت رہتی ہے۔ آپ کو چاہئے تھا کہ اس کے گھر سے معلوم کرواتے کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں ہے؟“

مستری مجید نے جواب دیا ”اس کی ضرورت ہوتی تو میں ایسا ہی کرتا تھا نے وار صاحب! آج کل کام ذرا ٹھنڈا ہے۔ پنکھوں کا سیزن گرمیوں میں عروج پر ہوتا ہے۔ میرے ڈیپارٹمنٹ کا کام جمیل کے بغیر بھی چل رہا تھا، اس لئے میں اس کے لئے زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ آج تو وہ ضرور آئے گا۔“

”اس امید کی کوئی خاص وجہ تھی؟“

مستری مجید نے بتایا ”جی ہاں جناب، ہماری فیکٹری میں سات تاریخ کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ سات تاریخ کو بھلا کون ملازم چھٹی کرے گا۔“

میں نے اچانک پوچھا ”لالہ موسیٰ میں جمیل اختر کا کون رہتا تھا؟“  
”اللہ ہی بہتر جانتا ہے جناب!“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے مجھ سے تو کبھی لالہ موسیٰ جانے کا ذکر نہیں کیا۔“

”جہلم کی باتیں تو وہ کرتا رہتا ہو گا؟“ میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔  
”وہ باتیں کرتا ہی کہاں تھا جناب!“ مستری مجید نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ”بت گم صم اور چپ چاپ رہنے والا شخص تھا وہ۔“

میں نے فیکٹری کے میمنجر اشفاق بخاری سے کہا ”ہمیں مقتول کی جامہ تلاشی سے نیو خان بس سروس کا ایک ٹکٹ ملا ہے۔ جس کے مطابق اس نے جہلم سے لالہ موسیٰ تک سفر کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جہلم اور لالہ موسیٰ پہلے بھی جاتا رہتا ہو گا یا ان شہروں سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔“

”یہ عجیب بات بتائی آپ نے۔“ اشفاق بخاری نے کہا ”اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہاں سے جہلم گیا تھا۔ پھر واپسی میں وہ لالہ موسیٰ آیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ کیا اس کے پاس سے گجرات سے جہلم جانے کا بھی کوئی ٹکٹ برآمد ہوا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اشفاق بخاری نے کہا ”ملک صاحب، زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ آپ جمیل اختر کے مالک مکان سے مل لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں سے آپ کو کوئی کارآمد بات ضرور معلوم ہو جائے گی۔“

پھر اس نے مستری مجید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”استاد جی، ادھر سے کسی لڑکے کو لے کر دروازے کے ٹال بھڑی گلی (بہ معنی تنگ گلی) بھیج دیں۔“ اس کے بعد اس نے مجھ سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ”جناب، آپ خیال نہ کریں۔ لاہور سے ایک پارٹی کا ضروری فون آنے والا ہے، ورنہ میں آپ کے ساتھ خود وہاں جاتا۔“

”کوئی بات نہیں بخاری صاحب۔“ میں نے کہا ”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“  
پھر میں اور ایس آئی فضل کریم فیکٹری کے ایک درکر کے ساتھ بھڑی گلی پہنچ گئے۔ وہ ہمیں مطلوبہ مکان تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ محلہ بھڑی گلی میں ایک گلی اتنی تنگ تھی کہ آنے والے سے آنے والے دو صحت مند آدمی ایک ساتھ نہیں گزر سکتے تھے۔ جس گلی میں ہم اس وقت کھڑے تھے وہ بہ نسبت کھلی تھی مگر زیادہ نہیں۔ ایس آئی نے آگے بڑھ کر

یا تھا۔ تیسرے حصے میں ان کی اپنی رہائش تھی۔ کرائے کی جو پیسے آتے تھے اسی سے یہ دونوں جیسے تیسے زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے ان کے حالات اور حالت پر دلی افسوس ہوا۔ عبدالستار کی بیوی عائشہ بھی وہیں بیٹھک میں چلی آئی تھی۔ میں نے انہیں مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا تو ان کے چہرے اتر گئے۔ ان کے چہرے پر چھائی ہوئی غم و اندوہ کی گہری گھٹا سے میں نے اندازہ لگایا کہ جمیل اختر کی موت سے انہیں ایسا صدمہ پہنچا تھا جیسے ان کا اپنا بیٹا قتل ہو گیا ہو۔ ان کے حواس بحال ہوئے تو میں نے سلسلہ سوالات کا آغاز کیا۔ میں نے عبدالستار سے پوچھا۔

”جمیل اختر آپ کے پاس کب سے رہ رہا تھا؟“

اس نے جواب دیا ”کوئی چار پانچ سال تو ہو ہی گئے ہیں۔“

”وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟“

اس نے میرے اس سوال پر سوالیہ اور ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ”بزرگو“ میرا مطلب ہے، اس کا گھر کہاں تھا۔ اس کے والدین، بن بھائی کہاں رہتے ہیں؟“

”یہ تو ہمیں نہیں پتہ جناب۔“

میں نے کہا ”ابھی آپ نے بتایا ہے اور فیکٹری سے بھی ہمیں یہی پتہ چلا ہے کہ وہ لگ بھگ پانچ سال سے آپ کا کرائے دار تھا۔ کسی کے بارے میں جاننے کے لئے تو پانچ... بلکہ پانچ دن بھی کافی ہوتے ہیں اور آپ کو پانچ سال میں بھی پتہ نہیں چل سکا۔“

اس کی بیوی عائشہ نے کہا ”نہ اس نے بتایا نہ ہم نے پوچھا۔“

”یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ”آپ نے بغیر کسی پچھ پڑتیت کے اسے کیسے اپنے گھر میں رکھ لیا؟“

عبدالستار نے مسکین صورت بنا کر وضاحت کرنے کی کوشش کی ”او جناب، بات دراصل یہ ہے کہ میں تو اسے دیکھتے ہی بھروسہ کرنے لگا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیوں مجھے اچھا لگا تھا۔ انتہائی معصوم اور سادہ دل.... کچھ اپنا اپنا سا۔“

”بڑا ہی بی باچہ تھا تھانے دار صاحب!“ اس کی بیوی عائشہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنے سوہنے جوان کو بھی موت آ سکتی ہے۔ اس کی توجہ کی عمر تھی۔ میرے تو دل سے ہر وقت دعا نکلتی تھی کہ سدا جوانیاں مانے، پر قدرت کا قانون بھی نرالا ہوتا ہے۔ اسے بھی سوہنی چیز ہی زیادہ پسند آتی ہے۔ ہم جیسے بڑھے بڑھی موت کی راہ

دروازے پر دستک دی۔

دستک کے جواب میں ایک بارلش شخص برآمد ہوا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ بچپن اور ساتھ کے درمیان لگایا۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھبانا کر پہلے تو ہمیں پہچاننے کی کوشش کی پھر مجھے اس کے چہرے پر نا آشنائی کے تاثرات ابھرتے دکھائی دیے۔ اس نے ٹیخ سی آواز میں پوچھا۔

”آپ لوگ کون ہیں... کس سے ملنا ہے؟“

ایس آئی نے کہا ”آپ ہی سی ملنے آئے ہیں بزرگو۔ عبدالستار آپ ہی کا نام ہے نا؟“

مستری جمیل کی زبانی ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ مقتول جمیل اختر کسی عبدالستار نامی عمر رسیدہ شخص کا کرائے دار تھا۔

”میں عبدالستار ہی ہوں۔ پر میں نے آپ کو پہچانا نہیں!“

میں نے کہا ”ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں ستار صاحب۔ ہم پہلی بار مل رہے ہیں اس لئے پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

وہ اور زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی حیرانی و پریشانی دور کرنے کی خاطر اپنا تعارف کروایا۔ اسے جب پتہ چلا کہ ہمارا تعلق پولیس سے ہے تو وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا ”آپ کس سلسلے میں تفتیش کرنے یہاں آئے ہیں؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”کیا یہاں کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے؟“

وہ میری بات کا مطلب فوراً سمجھ گیا۔ اس نے ہمیں اپنے مکان کی بیٹھک میں لے جا کر بیٹھایا۔ اس مکان میں عبدالستار اور اس کی بیوی عائشہ اکیلے رہتے تھے۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ان سب کی شادی ہو چکی تھی اور اپنے اپنے گھروں میں سب خوش تھے۔ اولاد پیدا ہونے سے قبل عبدالستار اور عائشہ جس طرح تنہا تھے، آج بھی اسی طرح تنہا تھے۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اکیلے عبدالستار نے جن تین بیٹوں کو پالا پوسا تھا، بڑھاپے میں وہ تینوں مل کر ایک باپ کو سارا نہیں دے سکے تھے۔ سب باری باری بڑھے کو چھوڑ گئے تھے اور اپنی بیویوں کی ساتھ الگ الگ رہتے تھے۔ شاید دستور زمانہ یہی ہے.... لیکن یہ دستور بڑا شرم ناک اور غیر انسانی ہے۔

عبدالستار اور اس کی بیوی نے مکان کو تین حصوں میں تقسیم کر کے دو کو کرائے پر اٹھا

میں آنکھیں بچھائے خنک رہتے ہیں اور وہ ہمارے درمیان سے اٹھ جاتے ہیں جن کی توجہ بھی نہیں ہوتی۔“

عبدالستار نے اپنی بیوی کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔ ”تھانے دار صاحب‘ اصل میں ہم نے اسے کبھی کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اپنے بارے میں پوچھے جانے والے سوالات کو وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتا تھا۔ پھر وہ گلے بہ گلے ہماری تھوڑی بہت مالدی بھی کر دیا کرتا تھا۔ کرائے کے علاوہ۔ اس لئے بھی ہم اس سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے مبادا وہ بدک کر کہیں چلا جائے۔ ہم اس عمر اور اس کمپرسی کی حالت میں اپنی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ کھونا نہیں چاہتے تھے۔ کرائے دار تو اور بھی مل جاتے ہمیں، پر جمیل کے ساتھ تو ہمارا دل لگ گیا تھا۔ اب تو اسکی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا ”مرضی مالک دی‘ انسان کیا کر سکتا ہے۔“

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا ”آپ کے پاس قیام کے دوران میں کہیں آتا جاتا بھی تھا؟“

”ہاں جی، کبھی کبھی وہ لاہور گھومنے پھرنے جاتا تھا۔“ عبدالستار نے بتایا ”ایک آدھ بار راولپنڈی بھی گیا تھا۔“

”وہ لاہور کسی رشتے دار کے پاس جاتا تھا یا.....؟“

میں نے دانستہ جملہ ادھوا چھوڑ دیا اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر اپنے سوال کا رد عمل تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کہا ”جمیل نے اپنے کسی رشتے دار کا تو کبھی ذکر نہیں کیا مگر.....“ وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا اور اپنی بیوی عائشہ کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تذبذب کے گہرے سائے لہراتے ہوئے نظر آئے تھے جیسے وہ عائشہ سے پوچھ رہا ہو کہ آگے بولنا چاہئے یا نہیں۔

میں نے جلدی سے پوچھا ”مگر کیا عبدالستار؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر استفساریہ نظروں سے بیوی کو دیکھا، میں نے کہا ”عبدالستار اگر تم قانون سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کرو گے تو قانون کی نظروں میں مجرم ٹھہرے گے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھ سے پورا پورا تعاون کرو۔ اگر تمہیں جمیل اختر کے بارے میں کوئی خاص بات، کوئی ایسا نکتہ معلوم ہے جس سے اس کے قاتل تک رسائی ممکن ہو سکے تو وہ فوراً مجھے بتا دو۔“

”پتہ نہیں وہ بات خاص ہے بھی یا نہیں....“

”تم اسکی فکر نہ کرو۔“ میں نے نرمی سے کہا ”بات کے اہم یا غیر اہم ہونے کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔“

اس نے جواب دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر الجھن آمیز نظروں سے عائشہ کو دیکھا پھر کہا ”تھانے دار صاحب‘ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل ایک عورت جمیل کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“ اس نے رک کر پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر لجاجت سے بولا ”آپ کوئی ایسا مطلب مت سمجھیں تھانے دار صاحب، وہ عورت جمیل کے ساتھ اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کا گھر والا بھی ساتھ تھا۔ ہمیں اس بات پر حیرت ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ جمیل اتنے عرصے سے یہاں رہ رہا تھا مگر اس سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ نہ کوئی مرد، نہ عورت۔ ہم نے تو یہی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے، کوئی اس کا عزیز یا رشتے دار نہیں ہے۔ اس عورت اور مرد کو دیکھ کر میرے اندر تجسس کا مادہ بیدار ہوا۔ عائشہ اس معاملے میں مجھ سے چار ہاتھ آگے ہی ہے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد عائشہ نے جمیل سے ان کے بارے میں دریافت کیا، وہ کون تھے اور کس سلسلے میں اس کے پاس آئے تھے؟ جمیل نے جواباً بتایا کہ وہ اس کی ماسی اور ماسز (خالہ، خالو) تھے۔ بازار میں وہ اسے اتفاقاً مل گئے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ہمیں حیرت تو بہت ہوئی تھی کہ اتنے عرصے بعد کوئی جمیل کا رشتے دار سامنے آیا تھا مگر حسب سابق ہم نے اس سے ان رشتے داروں کی تفصیلات نہیں پوچھی۔ وجہ وہی تھی کہ اس نے ہمیں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔“

”میں نے پوچھا ”یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”کوئی چھ سات مہینے ہو گئے ہیں۔“ عبدالستار نے جواب دیا۔

”اس کے بعد بھی وہ آئے تھے؟“ میں نے سوال کیا ”میرا مطلب ہے جمیل کی ماسی اور ماسز؟“

”نہ اس سے پہلے، نہ اس کے بعد۔“ عبدالستار کے بجائے اس کی بیوی نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”وہ کہاں رہتے ہیں، جمیل نے کچھ اس بارے میں بھی بتایا تھا؟“

”نہیں جی، کچھ نہیں بتایا۔“

”نام تو بتایا ہو گا اپنے خالو، خالہ کا؟“

عبدالستار نے سر کوئی میں جنبش دی ”نہ نام نہ پتہ، کچھ بھی نہیں۔“

”عجیب پر اسرار بندہ تھا بھی۔“ میں نے خود کھلائی کے انداز میں زیر لب کہا پھر اچانک



میں تھوڑی دیر تک خاموش نظروں سے عبدالستار کو گھورتا رہا پھر اچانک کہا ”عبدالستار“  
میں جمیل اختر کے کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“  
”بڑے شوق سے جناب!“ وہ بلا تامل بولا پھر اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”  
ہاگن والی اے، چابی کہاں رکھی تھی تم نے؟“

اس کی بیوی اندر سے جمیل کے کمرے کی چابی نکال کر لائی۔ عبدالستار نے خود اپنے  
ہاتھ سے کمرے کا تالا کھولا پھر ہمارے ساتھ ہی وہ دونوں میاں بیوی بھی کمرے میں داخل ہو  
گئے۔ ان کا انداز بہت محتاط اور محافلانہ تھا۔ جیسے خدشہ ہو کہ ہم وہاں سے کوئی چیز چرا کر نہ  
لے جائیں۔

مقتول جمیل اختر کا کمرہ ویسا ہرگز نہیں تھا جیسا عام طور پر چھترے چھانٹ لوگوں کا ہوتا  
ہے۔ نہ کسی دیوار پر مجھے فلمی اداکاروں کی کوئی تصویر لگی نظر آئی اور نہ ہی کہیں کوئی دل  
جلا شعر لکھا ہوا نظر آیا۔ وہ کمرہ کسی درویش کی کتیا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کمرے کی مغربی  
دیوار کے ساتھ زمین پر کجور کی ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک طرف ایک عام سا  
سرہانہ رکھا تھا۔ اس یسٹنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ مقتول مثلاً جنوباً سونے کا عادی تھا۔ یعنی سر  
ٹال کی طرف اور پاؤں جنوب کی جانب۔ اگر وہ سوئے وقت چہرے کا رخ دیوار کی سمت رکھتا  
ہو گا یعنی سیدھی کروٹ سے سوتا ہو گا تو یہ سونے کا ایک آئیڈیل اور صحت افزا انداز تھا۔  
کمرے کی جنوبی دیوار پر ایک قطار میں کپڑے ٹانگنے کی تین کھونٹیاں نصب تھیں جن پر کچھ  
میلے کپڑے لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسی دیوار کے ساتھ، عین کھونٹیوں کے نیچے فرش پر  
ایک بڑا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ ریگیزین کے اس سوٹ کیس کو پختہ اینٹوں پر سیٹ کر کے  
رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی چارپائی اور نہ کوئی برتن  
دیکھو۔

میرے اشارے پر سب اسپیکٹر فضل کریم نے پہلے چٹائی کو اٹھا کر دیکھا پھر کھونٹیوں پر  
لٹکے کپڑوں کی تلاشی لی مگر کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہ ہوئی۔ اس کے بعد میں سوٹ کیس کی  
طرف متوجہ ہوا۔ سوٹ کیس متقل نہیں تھا، یہ اس اعتماد کی نشانی تھی جو مقتول اسپیکٹر مالک  
نیکن پر کرتا تھا۔ میں نے عبدالستار کے سامنے اس سوٹ کیس کو کھول کر دیکھا۔ اندر دو  
جوڑے دھلے ہوئے کپڑے بڑے قریب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک موٹے  
دالوں والی قمیض، ایک عطر کی شیشی، مختلف ڈٹاؤف کی چھوٹی چھوٹی چند کتاہیں اور ایک ڈائری  
مکملی۔ میں نے باقی چیزوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد سرخ جلد والی اس ڈائری کو کھول

پوچھا ”جمیل کبھی جہلم بھی گیا تھا؟“  
وہ سوچنے والے انداز میں بولا ”شاید گیا ہو“ شاید نہ گیا ہو۔ ہمیں تو وہ یہی بتا کر جانا  
کہ سیر پانا کرنے لاہور جانا ہے۔ آگے اللہ جانے اور اس کا دین ایمان۔“  
”تین تاریخ کو بھی وہ لاہور ہی گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ دراصل میں مستری مجید کے  
بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

”مجھے تو یہی بتایا تھا۔“ عائشہ نے جواب دیا ”اس وقت ستار گھر میں نہیں تھا۔ مجھے  
اچھی طرح یاد ہے، وہ ہفتے کا دن تھا۔ جمیل نے گھر سے نکلنے وقت مجھے بتایا تھا کہ آج وہ  
فیکٹری نہیں جائے گا۔ ہفتے اور اتوار کا دن وہ سیر کرنے لاہور جا رہا ہے۔ پیر کو سیدھا  
فیکٹری ڈیوٹی پر پہنچ جائے گا، پھر شام کو ہی گھر واپس آئے گا۔“

”پیر کی شام جب وہ نہیں آیا تو آپ کو تشویش نہیں ہوئی؟“  
عبدالستار نے جواب دیا ”تشویش تو ہوئی تھی جناب! پر ہم کر بھی کیا سکتے تھے؟“  
”اس سے پہلے بھی وہ اتنے دنوں تک غائب رہا تھا؟“  
”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”جب وہ گھومنے پھرنے شہر سے باہر جاتا تھا تو  
اپنے کمرے کی چابی ساتھ لے جاتا تھا یا آپ لوگوں کو دے جاتا تھا؟“  
”شہر سے باہر کیا؟ وہ تو روزانہ فیکٹری جاتے ہوئے بھی چابی دے کر جاتا تھا۔“ عائشہ  
نے بتایا ”دراصل اس کی غیر موجودگی میں، میں اس کے کمرے وغیرہ کی صفائی کر دیتی تھی۔“  
ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”وہ بھی تو ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔“

ساجد البیکٹرکل انڈسٹریز کے مینجیر اشفاق بخاری اور ہیڈ فز مستری مجید کی طرح یہ بڑھی  
بڑھا بھی مقتول جمیل اختر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ البتہ یہاں آکر ایک حوصلہ  
افزا بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ مقتول کے کوئی خالہ، خالو بھی اس دنیا میں پائے ملتے تھے۔  
میرا اندازہ تھا کہ وہ یا تو لالہ موسیٰ میں کہیں رہتے تھے یا پھر ان کی رہائش جہلم میں ہو سکتی  
تھی۔ ویسے یہ میرا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اگر ان خالہ، خالو کا سراغ مل جاتا تو  
مقتول کو پیش آنے والے حادثے پر روشنی پڑ سکتی تھی۔ میں نے عبدالستار اور اس کی بیوی  
عائشہ کو مقتول کی جیب سے برآمد ہونے والے نیو خان بس سروس کے ٹکٹ کے بارے میں  
کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اس کے برعکس اب میری تفتیش کا  
پیش مقتول کے بے نام و نامعلوم مقام خالہ، خالو کی طرف ہو گیا تھا۔

رہے ہو؟“

”میں سمجھ گیا جناب!“ اس نے عاجزی سے کہا ”آپ فکر ہی نہ کریں، ادھر ایک چڑیا کے بچے کو بھی نہیں آنے دیں گے ہم۔“

اس کے بعد ہم دونوں مقامی تھانے پہنچے۔ تھانہ انچارج سے صبح تعارف ہو چکا تھا۔ میں نے اب تک کی تفتیش کا مختصر احوال اس کے گوش گزار کیا اور مقتول کی رہائش گاہ کو سیل کرنے کی درخواست کی۔ متعلقہ تھانے کے انچارج نے اپنے بھرپور تعاون کا مجھے یقین دلایا۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔

جب ہم واپس لالہ موسیٰ پہنچے تو رات کے سات بج چکے تھے۔ ہاں، اسے رات ہی کہا جاسکتا تھا کیونکہ ان دنوں پانچ سوا پانچ بجے سورج غروب ہو جاتا تھا اور سات بجے تک لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر عشاء کی نماز کی تیاریوں میں لگ جاتے تھے۔ لالہ موسیٰ جیسے چھوٹے شہروں میں، اس موسم میں لوگ رات دس بجے تک خواب کی نرم و نیم گرم دایوں میں اتر جاتے تھے۔ پھر چاروں طرف بج بستہ سیاہ رات ہوتی تھی اور ٹھنڈی ٹھار بریلی ہوا میں۔ کبھی ہوا سانس لینے رک جاتی تو دل ہلا دینے والا مہیب سناٹا در و دیوار کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا۔



دوسرے روز باوجود کوشش کے بھی ہم جہلم نہ جاسکے!

موسم نے راتوں رات کروٹ لی تھی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو دھواں دھار بارش نے استقبال کیا جو رات جانے کس پہر شروع ہوئی تھی۔ اس طوفانی بارش کی وجہ سے میں شاید جہلم جانے کا ارادہ ملتوی نہ کرتا اگرچہ فوری نوعیت کی ہنگامی قسم کی مصروفیات تھانے میں نہ نظر آئیں۔ ان کا ذکر آئندہ کسی کہانی میں کیا جائے گا۔ بہر حال وہ پورا دن میں تھانے میں مصروف رہا اور اگلے روز مجھے جہلم جانے کا موقع مل سکا۔ اس دن جمعہ تھا اور دسمبر کی نو تاریخ تھی۔ اے ایس آئی احمد حسن میرے ساتھ تھا۔ اس وقت بھی ہم سارہ لباس میں تھے۔ ہم تقریباً دن کے ایک بجے جہلم پہنچے تھے۔ سب سے پہلے میں نے ضلع ہیڈ کوارٹر جہلم کو اپنی آمد کی غرض و غایت سے مطلع کیا پھر مشین محلہ نمبر دو کے متعلقہ تھانے میں تھوڑی دیر رک کر، مقتول کی ماسی (خالہ) زہین کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ زہین کا اصل نام زیب النساء تھا جو بچپن میں بگڑ کر زہین ہو گیا تھا۔ بچپن میں پیدا ہونے والا یہ بگڑا بھی تک موجود اور مستعمل تھا۔ زیب النساء کے شوہر کا نام طالب حسین تھا۔ مین

لیا۔

ڈائری کے اکثر صفحات خالی تھے۔ کہیں کہیں چھوٹی موٹی رقموں کا حساب کتاب درج تھا۔ لاہور کے مختلف تاریخی مقامات کے بارے میں معلومات عامہ کی باتیں بھی چند صفحات پر لکھی ہوئی نظر آئیں۔ میں ایک ایک صفحہ الٹ کر دیکھتا چلا گیا پھر ایک ورق پر میری نظریں اس طرح رک گئیں جیسے اچانک بریک لگ گئے ہوں۔ اس صفحے پر جہلم کا ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ اس ایڈریس کے نیچے واضح طور پر ماسی زہین بھی لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”بس بن گیا کام۔“ بے خیالی میں میرے منہ سے نکلا۔

”فضل کریم نے پوچھا، ”نک صاحب، لکھا ہے۔ کوئی سراغ مل گیا ہے؟“

میں نے وہ ڈائری اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ دیکھو، مقتول کی جس ماسی کا عبدالستار نے ذکر کیا تھا، یہ اس کا ایڈریس ہے۔ وہ جہلم میں رہتی ہے۔“

”یعنی مقتول لالہ موسیٰ آنے سے پہلے جہلم میں اپنی ماسی کے پاس تھا؟“ فضل کریم نے ایڈریس پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بالکل درست خیال ہے تمہارا۔“ میں نے کہا ”وہ نکٹ بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ مقتول نے جہلم سے لالہ موسیٰ تک سفر کیا تھا۔“

”وہ لالہ موسیٰ کیوں گیا تھا؟“ فضل کریم نے پر خیال انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے جلدی سے کہا ”یہ ہمیں مقتول کی ماسی زہین بتائے گی۔“

عبدالستار اور اس کی بیوی عاتشہ ہونٹوں کی طرح کبھی مجھے اور کبھی سب انسپکٹر فضل کریم کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی پوری ڈائری دیکھ ڈالی مگر اس ایڈریس کے مجھے مزید کوئی کارآمد معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ فی الحال یہی بہت تھا۔ ناامیدی کی بنا رات میں امید کی ایک کرن پھوٹی تھی۔ میں اس ننھی سی کرن کی روشنی میں بہت دور نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایڈریس جہلم کے مشین محلہ نمبر دو کا تھا۔ میں نے مکمل ایڈریس اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس کے بعد سوٹ کیس کو واپس پرانی حالت میں اینٹوں پر رکھ کر بند کر دیا۔

باہر آکر میں نے متوں کے رہائشی کمرے کو تلا لگا دیا پھر اس کی چابی اپنی جیب رکھتے ہوئے عبدالستار سے کہا۔ ”میں یہ چابی علاقے کے تھانے میں جمع کروا دوں گا۔“ تھوڑی دیر میں یہاں اس کمرے پر سرکاری تلا لگ جائے گا۔ جب تک جمیل اختر کا گرفتار نہیں ہو جاتا، یہ کمرہ بند رہے گا اور اس کی ہر چیز جوں کی توں۔ تم میرا مطلب

بازار میں اس کی آٹو اسپیرپارٹس کی دکان تھی۔ ان کی اکلوتی بیٹی بانو عمر کے بیسویں زینہ قدم رکھ چکی تھی اور مقامی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم کو موقوف کر بیٹھی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں پتہ چلی تھیں۔

ہم سے پہلے کوئی اور شخص زینہ بن کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک وزنی تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے لگ بھگ لگایا۔ میرا اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ وہ چالیس بیالیس کا تھا مگر مستقل پیٹ کے درد میں مبتلا رہنے کے سبب اس کی صحت بہت تیزی سے گرتی چلی جا رہی تھی۔ ہم اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے تو اس نے سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی، فرمائیں!“

میں نے کہا ”ہم زینہ نامی ایک عورت سے ملنے آئے ہیں۔ وہ اسی گھر میں رہتی ہے“

”ہاں؟“

زینہ کے نام پر اس کی تیوری چڑھ گئی، سخت لہجے میں بولا ”آپ کون ہیں۔ زینہ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

”ہم جو کوئی بھی ہیں، یہ تمہیں پتہ چل جائے گا۔“ اے ایس آئی نے بھی جواب دے دیا۔

اس وقت اگر ہم وردی میں ہوتے تو یقیناً وہ شخص اتنی گرمی نہ دکھاتا۔ اے ایس آئی کے انداز پر وہ چراغ پا ہو گیا۔ پھر بھڑک کر بولا ”ہاں، زینہ اسی گھر میں رہتی ہے۔ میری گھروالی ہے۔ اب آپ بتائیں، کس سلسلے میں اس سے ملنے آئے ہیں.... اور اس سے پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ ہیں کون اور کہاں سے آئے ہیں؟“

اب میں نے اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا، میں نے کہا ”ہم لالہ موسیٰ سے آئے ہیں۔ میں وہاں کے ایک تھانے کا انچارج ہوں۔ ملک صفدر حیات میرا نام ہے اور یہ میرا ساتھ اسٹنٹ سب انسپکٹر احمد حسن ہے۔“

جب اسے پتہ چلا کہ ہمارا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے تو وہ قدرے نرم پڑ گیا مگر اس کے لہجے کا اوکھا پن پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ برہمی سے بولا ”اچھا تو تھانے دار صاحب، آپ میری بیوی کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ کیا قصور کیا ہے اس نے؟“

میں نے اس کے طنزیہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”ضرورت پڑی تو گرفتار بھی کر کے لے جائیں گے۔ فی الحال تو ہم ایک کیس کے سلسلے میں تھوڑی سی پوچھ گچھ کر رہے

ہے۔“

”کون سا کیس، کیسی پوچھ گچھ؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا ”اس کی ساری تنہا ہو چکی تھی۔ وہ راہ راست پر آگیا تھا۔“

اے ایس آئی نے مزید خوف زدہ کرنے کے لئے کہا ”یہ تو سب تھانے جا کر پتہ چلے گا“

وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال ”ہفتہ، تین تاریخ کو جمیل اختر یہاں آیا تھا؟“

”جمیل.... کون جمیل؟“ وہ کثرت زدہ انداز میں بولا۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا ”زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے زینہ کے روالے۔ قانون سے غلط بیانی کر کے تم بری طرح بھنسن جاؤ گے۔“

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لجاجت سے بولا ”معاف کر دیں جناب،“

میں نے اسی لہجے میں اپنا سوال دہرایا ”جمیل اختر.... تمہاری سالی کا لڑکا جمیل اختر تین سالہ یہاں آیا تھا؟“

”جی آیا تھا۔“ اس نے جواب دیا پھر تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا ”کیا ہوا اسے۔“

میں نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے بتایا ”جمیل اختر کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کا لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ہمیں ملی ہے۔ ہم اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔“

جب تک میں اپنی بات ختم کرتا، وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتا رہا۔ میرے

نہ ہوتے ہی وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا ”یہ تو ہونا ہی تھا جناب!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے چونک کر پوچھا ”کیا ہونا تھا؟“

اس نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر ایک

درا سا سر کا اور وہاں ایک عورت کی جھنک دکھائی دی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس عورت

گھول میں حیرت کا تاثر ابھرا۔ اس نے دروازے کا پٹ پورا کھول دیا بھٹک کر ”کیا بات

جب حسین، تم کن لوگوں سے بات کر رہے ہو؟“

یقیناً زیب النساء عرف زینہ ہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو طالب حسین کہہ کر

تین گھنٹے کی طویل نشست میں میرے ترش و تلخ اور سخت و سنگین سوالات کے جواب  
میں مقتول جمیل اختر کی خالہ زہین اور خالو طالب حسین نے جو تفصیلات مجھے بتائیں، اس  
سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔



جمیل اختر یتیم پیدا ہوا تھا!

اس کی پیدائش سے دو ماہ قبل اس کا باپ چوہدری امانت علی کرنٹ لگنے سے ہلاک ہو  
باتھا۔ جمیل کے ساتھ ہی اس کی بد قسمتی بھی پیدا ہوئی تھی۔ ابھی اس کی عمر پورے چار  
ماہ بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی والدہ سعیدہ خاتون بھی نمونیا کا شکار ہو کر اس سے ہمیشہ  
لے کے لئے جدا ہو گئی۔ چوہدری امانت علی اور چوہدری نواز علی صرف دو بھائی تھے۔  
نواز علی بڑا تھا۔ ان کے باپ یعنی مقتول جمیل اختر کے دادا نے مرنے سے پہلے پوری  
زمین و جائداد دونوں بیٹوں میں مساوی تقسیم کر دی تھی اس لئے باپ کی موت کے بعد  
ان میں زمین و جائداد کے بٹوارے پر سر پھٹول نہیں ہوئی۔

نواز علی شروع ہی سے شہری زندگی کا خواہاں تھا مگر جب تک باپ زندہ تھا، اسے یہ  
انگھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مگر اب اس کے لئے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اس نے پہلی  
سات میں اپنے حصے کی زمین بیچ اور موضع کڑیا نوالہ کو خیر باد کہہ کر لالہ موسیٰ آگیا۔ اسے  
موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ لالہ موسیٰ میں اس نے سب  
صاف ستھرے علاقے میں رہائش اختیار کی اور غلہ منڈی میں دکان حاصل کر کے  
موت کا کاروبار شروع کر دیا۔ اب وہ چوہدری نواز علی سے رانا نواز علی بن گیا تھا۔  
نواز علی دکان پر بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا جہاں جلی حروف میں ”رانا نواز علی اینڈ سنز“ لکھا  
تھا۔ نواز علی کے دو بیٹے تھے۔ رانا فیاض احمد اور رانا ریاض احمد۔ یہ دونوں بھائی جمیل  
سے بڑے تھے۔ جمیل کی پیدائش پر ریاض احمد ایک سال کا ہو چکا تھا اور بڑا بھائی فیاض  
ریاض احمد سے تین سال بڑا تھا۔

کڑیا نوالہ میں جب امانت علی حادثاتی موت کا شکار ہوا تو نواز علی نے اپنی بھائی کے  
ہاتھ رکھ کر کہا ”تم یہ نہ سمجھنا کہ اب تم تنہا ہو گئی ہو۔ میں ہوں نا۔ تمہیں فکر کی  
ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میری مانو تو تم بھی شہر میں آ جاؤ۔ زمینیں کسی کو ٹھیکے پر دے  
ڈیں۔ اب اس گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے۔ جسے کھیتی باڑی کا شوق تھا جب وہ ہی نہیں  
تم یہاں رہ کر کیا کرو گی۔“

مخاطب کیا تھا۔ ہمارے سامنے کھڑے ہوئے شخص یعنی طالب حسین نے ہاتھ میں پکڑا ہوا  
بھاری بھر کم تھیلا زہین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ لو سودا۔۔۔ اور تم اندر جاؤ۔“  
وہ اندر جانے کے بجائے وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے تھیلے کا منہ کھول کر دیکھ  
گئی۔ تھوڑی سی چھان پچھک کے بعد اس نے تیز لہجے میں شوہر کو ڈانٹ پلائی ”یہ تم پھر وہی  
صابن اٹھا لائے ہو۔ کم بخت گھنے کا نام نہیں لیتا، بالکل پتھر ہے۔ میرے تو ہاتھ رہ گئے  
ہیں۔“

”میں نے کہا نا، تم اندر جاؤ۔“ طالب حسین نے اسے جھڑکا مگر صاف ظاہر ہو رہا تھا وہ  
مصنوعی جھڑک تھی۔ زہین کے طرز گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گھر میں اسی کی  
حکمرانی تھی اور طالب حسین محض ایک دبو شوہر تھا۔  
”اندر تو میں چلی ہی جاؤں گی، پر یہ لوگ کون ہیں؟“ زہین نے تحکمانہ انداز میں  
دوبارہ ہمارے بارے میں دریافت کیا۔

طالب حسین نے جھلا کر کہا ”یہ پولیس والے ہیں۔ تمہارے بھانجے کو کسی نے قتل کر  
دیا ہے۔ یہ لالہ موسیٰ سے تفتیش کرنے تمہارے پاس آئے ہیں۔“  
”ہائے میں مر گئی۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی ”جمیل اختر کو کسی نے قتل کر دیا؟“  
”اور۔۔۔ اور دیکھ لیا تم نے؟“ طالب حسین نے دل کا غبار نکالتے ہوئے کہا ”تم اسے  
جو پٹیاں پڑھا رہی تھیں، اس کا نتیجہ تو یہی نکلتا تھا۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔ میں جانتا  
ہوں، وہ نام نہاد چوہدری۔۔۔ نہیں، وہ رانا نواز علی کس قماش کا آدمی ہے۔ پر تمہاری  
موت ماری گئی تھی۔“

”تایا۔۔۔ سگے تایا نے معصوم بھتیجے کو قتل کر دیا۔ ہائے وے میرا ربا۔“ وہ سینے کی  
کرتے ہوئے بولی، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ”تھانے دار صاحب، آپ نے رانا نواز علی  
گرفتار کر لیا ہے نا؟“

”یہ رانا نواز علی کون ہے؟“ میں نے طالب حسین سے دریافت کیا۔  
اس نے جواب دینے سے پہلے گلی میں جمع ہونے والے افراد کو دیکھا۔ ہماری اس  
کے دوران میں ہمارے آس پاس کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ طالب حسین نے مجھے مخاطب  
کرتے ہوئے کہا ”ملک صاحب، اندر بیٹھک میں آ جائیں۔“ پھر اس نے زہین کو دروازے  
میں سے اندر دھکیلتے ہوئے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم طالب حسین  
کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی امانت علی کو عارضی طور پر دے دیا تھا کیونکہ اس وقت اس کے ہاتھ اچھے نہیں تھے۔ جمیل ہر طرح سے اپنے تایا کا احسان مند تھا۔ یہ احسان مندی اس نے بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے ہوئی جا رہی تھی کہ جمیل اختر کو حقیقت سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نوازش علی نے خاندان کے لوگوں کی ساتھ زیادہ میل جول نہیں لیا تھا۔ ویسے بھی جو چند رشتے دار تھے، وہ کڑیاں والہ ہی میں تھے۔ نہ وہ خود کسی سے ملنے آتا تھا اور نہ ہی دوسروں کا اپنے گھر آنا پسند کرتا تھا۔ بس سال میں ایک بار مزارع کے پاس آکر زمینوں سے ہونے والی آمدنی جیب میں بھر کر واپس آ جاتا۔ واضح رہے کہ یہ واقعات ان دور کے ہیں جب برصغیر کی تقسیم کا عمل ابھی واقع نہیں ہوا تھا۔ البتہ تحریک پاکستان ریل پر تھی۔ جمیل اختر نے پرائمری کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ خدا واد مملکت پاکستان کے مہمان ہوا۔

بہن کی وفات کے بعد زینب النساء نے پوری کوشش کی تھی کہ معصوم بھانجے کو وہ پانچ پاس جہلم لے جائے مگر ایک تو نوازش علی نے ریپڑ ڈال دیا تھا کہ اپنے بھتیجے کی صحیح نش و نما کر سکتا ہے، اپنے بھائی کی اولاد پر صرف اور صرف اسی کا حق ہے۔ دوسرے اب النساء کے شوہر طالب حسین نے بھی اس موقع پر اپنی بیوی کی حمایت کے بجائے امانت علی کی تھی۔ وہ نوازش علی کو سخت ناپسند کرتا تھا اور اگر زمین نے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ بالوالہ قطعی نہ آتا۔ زمین کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طالب حسین نے مرگ لے کر میں نوازش علی کو یہ کہتے سنا تھا کہ جمیل کی ماسی محض اس لئے اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے کہ اس کی زمین و جائداد کو ہڑپ کر سکے۔ طالب حسین جیسے خود دار شخص کے ذہن میں ایسے بچے ہونے یہ الفاظ کسی ایٹم بم سے کم نہ تھے۔

زینب النساء نے بعد میں بھی اپنے بھانجے سے میل ملاپ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے اس نے کئی پھیرے لالہ موسیٰ کے بھی لگائے تھے۔ لیکن نوازش علی اور اس کے بچوں نے ایسا روکھا پھیکا رویہ اپنایا تھا کہ اس نے آنا جانا کم کر دیا تھا پھر یہ آمد و رفت کے ساتھ ساتھ ختم ہی ہو گئی۔ نوازش علی نے جمیل کے ذہن میں زینب النساء کے کس مقدار میں زہر پکایا تھا، یہ بات زینب النساء نہیں جانتی تھی تاہم جب بھی جمیل اس کا سامنا ہوتا، جمیل کے رویے میں ایک واضح سرد مہری اور نفرت کی آمیزش اسے محسوس ہوتی تھی۔ ان دونوں میں کبھی اتنی تفصیلی بات نہیں ہوئی تھی کہ زینب النساء اسے نوازش علی کا اصلی چہرہ دکھا سکتی۔ وہ اپنی خالہ سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں تھا چہ جائیکہ

سعیدہ خاتون اپنے جھنڈے کی شاطرانہ ذہنیت کو بخوبی سمجھتی تھی۔ اس نے گاؤں چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب، آپ کی مخلصانہ پیشکش کا بہت بہت شکریہ مگر میں یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ امانت علی اپنی زمینوں کو چھلتا پھوٹا دیکھنا چاہتے تھے۔ میں ان کی اس خواہش کو ضرور پورا کروں گی۔ زراعت کا سارا کام میں اپنی گھرائی میں کرواؤں گی۔“

نوازش علی نے مختلف راگ سنا کر بھائی کو رام کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی نیت کو سمجھتی تھی اس لئے اس کے دام فریب میں نہ آئی۔ جمیل اختر کی پیدائش کے بعد بھی وہ مینے دو مینے میں گاؤں کے چکر لگاتا اور ہر مرتبہ سعیدہ خاتون کو قائل کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ گاؤں کی یہ بور اور تکلیف دہ زندگی ترک کر کے اس کے پاس لالہ موسیٰ آجائے مگر سعیدہ ہر بار بڑی خوب صورتی سے اسے ٹال جاتی۔

نوازش علی اپنے چھوٹے بھائی کی زمینوں پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ پھر قدرت نے اسے اپنی کینٹکی کے انظار کا یہ موقع فراہم کر دیا۔ اچانک نمونیا کا شکار ہو کر سعیدہ چل بسی۔ اب جمیل اختر اس دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ نوازش علی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوراً لڑا لالہ پہنچ گیا۔ اپنی بھالی کی تکفین و تدفین کے بعد اس نے یتیم دیبر جمیل اختر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر بیٹا کہہ کر اسے گود میں اٹھایا اور کافی دیر تک پیار کرتا رہا۔

ساڑھے تین چار سال کے جمیل اختر کی چھوٹی سی دنیا میں ماں کی رحلت سے جو غلا پیدا ہوا تھا، وہ تو نہ بھر سکا مگر نوازش علی کی شفقت اور محبت نے اس کی دھارس بندھائی۔ اس کا معصوم ذہن اس شفقت اور محبت کے کھوکھلے پن سے نا آشنا تھا۔ وہ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ قریبی رشتے دار بھی محبت کے نام پر کس طرح دھوکا دیتے ہیں۔ وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ اس کا تایا بہت اچھا تھا اور اس سے بڑی محبت سے پیش آ رہا تھا۔ چہن کو محبت سوا کسی اور چیز کی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔

دوسرے ہی روز نوازش علی نے اپنے مرحوم بھائی کی زمین اور جائداد کے تمام حصے سمیت زمینوں کو ٹھیکے پر ایک مزارع کے حوالے کیا اور جمیل اختر کو لے کر لالہ موسیٰ کے ساتھ اپنے تایا زاد بھائیوں کے ساتھ پل بڑھ کر اور کھیل کود کر بڑا ہونے لگا۔ اس کے ساتھ اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جس وقت جمیل کی والدہ کا انتقال ہوا تھا، وہ زمین و جائداد کے معاملات کا شعور نہیں رکھتا تھا۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ اس کے معصوم ذہن میں بات بشادی گئی کہ گاؤں کی زمینیں وغیرہ سب کچھ نوازش علی کا ہے جو شہر آتے ہوئے

اس سے اس حساس موضوع پر کھل کر بات ہو سکتی۔ مایوس ہو کر زینب النساء ہمت ہار بیٹھی۔

جیل اختر اپنے تایا زاد بھائیوں کو بڑے بھائی اور ان کی ماں ناہید بیگم کو اپنی ماں ہی سمجھتا تھا البتہ دوسری جانب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ لوگ اس کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتے تھے لیکن جیل نے کبھی ان کے رویے کا برا نہیں منایا تھا اور ہمیشہ ان کی ہر زیادتی کو ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ ہاں یہ تھا کہ اس کا تایا نوازش علی اس کا بڑا خیال رکھتا تھا اکثر تو وہ اپنے ننگے بیڑوں کو بھی جیل کی حمایت میں ڈانٹ دیتا تھا۔ جیل کے لئے یہ صورت حال خاصی حوصلہ افزا تھی۔ تایا کا وجود اس گھر میں اس کے لئے غنیمت تھا۔ اس کی دانت میں تایا نے اسے انتہائی نازک وقت میں سارا دے کر اس پر جو احسان کیا تھا وہ ساری عمر ان کی خدمت کر کے بھی نہیں اتار سکتا تھا۔ اپنی تائی اور تایا زاد بھائیوں کے رویے نے البتہ اس کے دل میں بل ڈال دیا تھا جو عین قدرتی بات تھی۔

جیل میٹرک میں پہنچا تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچ بھی نہیں تھا۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا طوفان بھی آ سکتا ہے کہ جس کے نتیجے میں اسے مجبور ہو کر گھر چھوڑنا پڑ جائے۔ وہ واقعہ ہی ایسا تھا اور خاص طور پر گھر کے افراد کا رد عمل اتنا شدید تھا کہ وہ دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ اتنا ضدی تھا۔ اس نے ایک بار فیصلہ کر لیا کہ اب اس گھر میں نہیں رہے گا۔ بس پھر آخری وقت تک وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔

رانا فیاض احمد اور رانا ریاض احمد اس وقت کالج میں تھے۔ جیل میٹرک میں تھا۔ اس اسکول گھر سے بہت قریب تھا۔ ایک روز خلاف معمول وہ اسکول سے جلدی گھر آ گیا۔ اچانک اسکول میں اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت تک اس کے تایا زاد بھائی کالج سے واپس نہیں آئے تھے۔ ویسے بھی دو بجے تک آتے تھے اور انہیں صرف گیارہ ہی بجے تھے۔ اس وقت اس کا تایا نوازش علی بھی دکان پر ہوتا تھا۔ وہ گھر کے داخل ہو کر سیدھا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے کمرے سے پہلے تایا کی کمرہ تھا۔ وہ اس کمرے کے پاس سے گزرا تو اچانک زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اندر سے سرگوشیوں میں بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک آواز تو اس کی تائی ناہید بیگم کی ہی تھی مگر دوسری آواز اس کے لئے نامانوس تھی اور وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ اس وقت بخار جیل کا برا حال کر رکھا تھا مگر کمرے کے اسرار نے اس کی سماعت کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

اپنی مردانہ آواز آئی ”یہ میرا وہم نہیں ہے ناہید۔ میں نے کسی کے قدموں کی واضح باز سنی ہے۔ کوئی گھر میں داخل ہوا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا ”تم نے اپنی دروازہ بند نہیں کیا تھا؟“

”وہ تو میں کبھی بھی نہیں کرتی۔“ ناہید بیگم نے جواب دیا ”اس طرح خواہ مخواہ شک پڑتا ہے۔ ویسے تم بے فکر رہو۔ کوئی بھی نہیں ہو گا۔ بچے دو بجے سے پہلے آتے نہیں ہیں نوازش تو شام کو ہی آئے گا۔“

”میں بے فکر کیسے ہو جاؤں۔ میں نے خود کسی کے چلنے کی آواز سنی ہے۔“ ناہید بیگم نے ناراضگی سے کہا ”تم مرد ہو کر اس قدر خوف زدہ ہو۔ پریشان تو مجھے ہونا ہے۔ تم اس وقت میرے گھر میں ہو۔“

یہ تمام گفتگو سرگوشیوں میں ہو رہی تھی مگر جیل ذہنی طور پر اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ سرگوشیوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا وہ تائی ذلت آمیز اور روٹنے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اسے اپنی تائی سے اس درجے پرست کی توقع بہر حال نہیں تھی۔ اس کا دماغ پھوٹے کی طرح دکھنے لگا۔ اندر سے آنے والی روشنی نما آواز نے اس دیکھتے ہوئے دماغ پر ایک ہتھوڑا برسایا۔

”بات مرد اور عورت ہونے کی نہیں ہے ناہید اور نہ ہی میں بزدل ہوں۔ اگر میں ہلک ہوتا تو یوں دن دھاڑے تم سے ملنے نہ آتا۔ بس میں ذرا محتاط رہنے کا عادی ہوں اور بس بھی احتیاط کی تاکید کرتا ہوں۔“

”تم بھی ایک ضدی ہو۔“ ناہید نے جھٹلا کر کہا ”جب تک اپنی بات منوا نہیں لو گے، میں نہیں چھوڑو گے۔ لو میں دیکھ کر آتی ہوں۔ تم اس.....“ اس کے بعد سرگوشی نما آواز وہم ہو گئی۔ شاید جیلے کا باقی حصہ اشاروں کی زبان میں ادا کیا گیا تھا۔

اس کی تائی باہر آرہی تھی، اس نے سوچا وہاں سے ہٹ جائے تاکہ تائی کو شرمندگی کا نشانہ نہ کرنا پڑے۔ ذہن میں پیدا ہونے والے دوسرے خیال نے پہلے خیال کی تردید کی۔ تائی کا خیال زیادہ مضبوط اور توانا تھا، میں نے ان کے ظلم و ستم بہت سہ لئے ہیں۔ یہی موقع ہے۔ مجھے یہاں سے نہیں ہٹنا چاہئے۔ چور کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آنا چاہئے۔ اگر تائی کوئی کمزوری میرے ہاتھ آ جائے گی تو میں بوقت ضرورت اسے دبا سکوں گا۔ وہ میرے قہر کوئی ناروا سلوک نہیں کر سکے گی، یہ سب سوچ کر وہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور ناہید نے جھانک کر راہ داری میں دیکھا پھر جیل پر نظر پڑتے

وہ غصے میں لال چلی ہوتے ہوئے گرجی ”تیری یہ ہمت دو نکلے کے انسان۔ ہمارے  
نکلوں پر پلا اور ہمیں ہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔“  
”میں نے اگر اس گھر کے کھڑے کھائے ہیں تو محنت بھی کی ہے۔“

”تو احسان فراموش ہے۔ جس تھالی میں کھایا، اسی میں جمید کر ڈالا۔“ اس کا مصنوعی  
نہہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

جیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”میں لاکھ احسان فراموش سہی مگر  
تمہاری طرح بے حیا نہیں ہوں۔ میں نے خود تمہیں کسی مرد کے ساتھ سرگوشیاں کرتے سنا  
ہے۔“

”وہ کوئی... تیری ماں کا خصم ہو گا، تیرا باپ ہو گا۔“ وہ دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے  
ہوئے چلائی پھر جیل کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی ”جا، جا کر خود دیکھ لے کمرے کے  
اندر۔ کون ہے تیری ماں کا یار دہاں پر چھپا ہوا؟“

جیل نے اس موقع کو ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا اسے اس پر  
کمال یقین تھا۔ پھر ناہید بیگم نے اس کی ماں کو اتنی گالیاں دے ڈالی تھیں کہ اس کے سینے  
میں تائی کے خلاف دلی نفرت کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ وہ بے دھڑک کمرے میں داخل ہو گیا پھر  
تلاشی نظروں سے ایک ایک جگہ کو دیکھنے لگا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ بندہ، نہ بندے  
کی ذات۔ اس نے پانگ کے نیچے اور الماریوں کے پیچھے بھی جھانک کر اچھی طرح دیکھ لیا مگر  
جس کی اسے تلاش تھی وہ نظر نہ آیا۔ اب ایک ہی امکان باقی تھا کہ تائی نے اسے دوسرے  
دروازے سے نکال دیا تھا۔ اس کمرے میں آنے جانے کے لئے دو دروازے موجود تھے۔

جیل کی ناکاکی پر ناہید شیرنی بن گئی اور اس نے جیل کی سات پشتوں کو مغالطت میں  
ترس دیا۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ ریاض احمد اور فیاض احمد کالج سے لوٹ آئے۔ پہلے تو  
ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ گھر میں کون سی قیامت برپا ہے۔ پھر ناہید نے آنسو بہاتے  
ہوئے بیٹوں کو جیل کے ”کارنامے“ سے آگاہ کیا۔ وہ سنتے ہی جیل پر ٹوٹ پڑے۔

جیل اگرچہ عمر میں ان سے چھوٹا تھا مگر صحت اور توانائی میں کہیں زیادہ تھا۔ اس نے  
ہر لحاظ اور مردت کو بالائے طاق رکھ کر ان دونوں بھائیوں کی مرمت شروع کر دی۔ وہ دو  
تھے، پھر اس وقت جیل بخار میں بھی پھنک رہا تھا اس لئے اسے بھی خاصی چومیں آئیں مگر  
اس نے جواباً اپنے تیا زاد بھائیوں کی بڑی قابل دید اور قابل داد گت بنائی تھی۔ پٹے پٹے  
چھوٹا بھائی موقع سے فرار ہو گیا۔ وہ سیدھا نوازش علی کی دکان پر پہنچا اور باپ کو ساری

ہی وہ ٹھنک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے  
خود کو سنبھالا اور کمرے سے باہر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی ”تم آج اتنی جلدی کیے  
مئے؟“

جیل نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”کیا تیا اس وقت اندر کمرے  
میں موجود ہیں؟“

”نہیں تو۔“ وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں جلدی سے بولی ”تمہیں تو پتہ ہے، وہ اس وقت  
دکان پر ہوتے ہیں۔“

جیل نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے کہا ”میں نے آپ کے کمرے  
میں کسی کی آواز سنی ہے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جیل۔“ وہ شرمندہ ہونے کی بجائی ڈانٹ ڈپٹ پر از  
آئی ”تمہیں ہوش بھی ہے، کیا کہہ رہے ہو؟“

”پوری طرح ہوش ہے، تائی جان۔“  
جیل کا خیال تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ بری طرح گھبرا جائے گی اور منت

ساجت پر اتر آئے گی مگر ہوا اس کے الٹ۔ ناہید بیگم نے غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔  
”تو نے میرے کمرے میں کسی غیر مرد کی آواز سنی ہے؟ حرام زاوے، مجھ پر بہتان لگاتا

ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ پھر وہ جیل کا منہ نوچنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے  
حملہ آور ہوئی۔ وہ بلند آواز میں اس لئے بول رہی تھی کہ اندر موجود شخص باہر کی صورت

حال سے آگاہ ہو جائے۔  
جیل نے اپنی جگہ سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ”میں نے جو کچھ سنا ہے وہ تمہارا جان

کو بھی بتاؤں گا۔“  
”مجھے دھمکی دیتا ہے سور کا ختم۔“ وہ چیخ کر بولی ”میں تیری بوٹی بوٹی کٹاؤں گی تیرے

تیا سے۔ آج ہی دھکے دے کر گھر سے نہ نکلوا یا تو میرا نام بھی ناہید نہیں ہے۔“  
جیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”مجھے اب اس گھر میں رہنے کا زیادہ شوق نہیں ہے

جہاں بے غیرتی کے کھیل کھیلے جاتے ہوں۔“  
”بے غیرت تو تیری ماں۔“ وہ باقاعدہ کوسنوں پر اتر آئی۔

”خبردار! جو میری ماں کا نام لیا۔“ جیل نے درشت لہجے میں کہا ”میں تمہاری زبان کھینچ  
لوں گا۔“

صورت حال سے آگاہ کیا۔

دکان گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد رائا نوازش علی اپنے مضروب بیٹے کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت تک جمیل نے مار مار کر فیاض احمد کا حال کر دیا تھا اور وہ فرش پر نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ شوہر پر نظر پڑتے ہی ناہید بیگم نے ماتم کے انداز میں خود کو پٹینا اور رونا شروع کر دیا۔ ریاض احمد مختصراً باپ کو چکا تھا۔ اب ناہید بیگم نے ایک ایک کی چار بنا کر شوہر کے سامنے دکھڑا دیا تو نوازش علی غیرت کو ابلال آگیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بے دریغ جمیل پر ٹوٹ پڑا۔

لاٹوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے اس نے جمیل کی ہڈی پیل ایک کر دی۔ وہ غلوں سے مار کھا رہا تھا مگر حیرت انگیز طور پر اس نے تپا کے سامنے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ تپا نے ہمیشہ اس کی حمایت کی تھی۔ وہ تپا کے لئے اپنے دل میں نواز کے بجائے محبت کے جذبات رکھتا تھا۔ جب نوازش علی مار مار کر تھک گیا اور بری طرح ہانپنے لگا تو اس نے ایک ٹھڈا رسید کرتے ہوئے جمیل سے کہا۔

”تالاق چلو اٹھو، اور اپنی تائی سے معافی مانگو۔“

ایک بدکردار عورت سے معافی مانگنا اس کی غیرت کو گوارا نہ ہوا۔ وہ تن کر کھڑا ہوا اور خوں خوار نظروں سے ناہید بیگم کو گھورنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے نفرت چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک ایسی عورت سے کس طرح معافی مانگ سکتا تھا جس نے کر تو ت سے وہ واقف ہو گیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس عورت نے اس کی نامیت ہی غلیظ گالیاں بھی دی تھیں۔

”آپ دیکھ رہے ہیں، یہ کس طرح مجھے گھور رہا ہے۔“ ناہید بیگم نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے سسے ہوئے لہجے میں کہا ”اے اللہ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک یہاں چلا جائے۔“ نوازش علی نے حکمانہ انداز میں بھیجے سے پوچھا ”تم نے معافی نہیں مانگی ابھی تک؟“ ”اب معافی کی کیا ضرورت رہی ہے۔“ وہ خواب ناک لہجے میں بولا ”فیصلہ تو ہو چکا ہے۔“

جان۔

”کیسا فیصلہ؟“

جمیل نے نوازش علی کی جانب دیکھتے ہوئی ٹھوس انداز میں کہا ”یہی کہ اب اس گھر ہم دونوں میں سے کوئی ایک رہے گا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا ”اور“

”مجھے ہی جانا ہو گا۔ آپ اپنی بیگم کو تو جانے نہیں دیں گے۔“

”تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

نوازش علی نے کچھ کتا چاہا تو جمیل نے اسے ٹوک دیا۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہے تپا جان۔ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ میں آج تک آپ کا بہت احترام کرتا آیا ہوں مگر آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ مجھے آپ سے ایسی ناانصافی کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم آپ میری بات تو سنتے۔ پھر کوئی فیصلہ کرتے۔ اگر میں قصور وار ہوتا تو آپ چاہے میری جان بھی لے لیتے مگر میں اب تک نہ کرتا لیکن آپ نے تو قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔۔۔۔۔ اچھا، خدا حافظ۔“

پھر وہ واقعی وہاں سے چلا گیا۔ جس گھر میں اس کا بچپن گزرا تھا، وہ پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے گیارہ بارہ سال وہاں گزارے تھے، جس گھر کے در و دیوار سے اسے محبت ہو گئی تھی، جو اس کے لئے زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ایک مہربان ساتبان ثبت ہوا تھا، جمیل نے اس گھر اور گھر کے کینوں کو چھوڑ دیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔



”مجھے یہ ساری باتیں خود جمیل اختر نے بتائی تھیں۔“ زہین نے تفصیلات کو سمیٹتے ہوئے کہا ”کوئی سات ماہ قبل اچانک ہماری اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے اپنے تپا کا گھر چھوڑے سات سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔“

”وہ آپ لوگوں کو کہاں ملا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

طالب حسین نے بتایا ”ہم منٹو پارک لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہیں، وہ بھی نظر آگیا۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ خاصا تبدیل ہو گیا تھا مگر زہین نے اسے فوراً پہچان لیا تھا اور وہ مجھ سے دیکھتے ہی ہماری طرف چلا آیا تھا۔“

”پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ گہرات اپنے گھر لے گیا۔ وہ بھڑی گلی کے ایک مکان میں کرائے پر رہ رہا تھا۔ ہم نے اسے اپنا ایڈریس بھی لکھ کر دیا کیونکہ ہماری رہائش تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے ہم کہیں اور رہتے تھے، اب یہاں مشین محلہ نمبر دو میں رہتے ہیں۔“ زہین نے بتایا۔

”اس کے بعد وہ ہمارے گھر آنے لگا۔ مہینے میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتا تھا۔“ طالب حسین نے کہا ”اور جب بھی آتا، زہین کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا کھڑے رہتا تھا۔ اسی کھڑے پھر نے اس بے چارے کی جان لے لی۔ جانے کیسی کیسی پٹیاں پڑھاتی رہی ہے



مفروضے کے مطابق نوازش علی نے بھائی کی زمینیں اپنے نام منتقل کرانے کے لئے کوئی گڑبڑ کر رکھی تھی تو جیل کو سوائے مشکلات کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

”وہ بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔“ طالب حسین نے بتایا ”زہین سے اس نے کہا تھا کہ عدالت میں جانے سے پہلے وہ ایک مرتبہ اپنے تایا سے ملے گا۔“

”مگر میں اس کے لئے راضی نہیں تھی۔ اس طرح اس کا تایا ہوشیار ہو جاتا۔ میرا موقف یہ تھا کہ بے خبری میں اسے عدالت میں گھسیٹا جائے۔ گزشتہ ہفتے کو وہ ہمارے یہاں آیا تھا۔ میں پوری رات اسے یہی بات سمجھاتی رہی۔ دوسرے روز دھپہ کا کھانا کھا کر وہ جانے لگا تو میں نے ایک مرتبہ پھر اسے تاکید کی کہ سیدھا گھر جائے۔ اور یہ کہ لالہ موسیٰ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے میری بات ماننے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر اللہ جانے وہ لالہ موسیٰ نوازش علی کے پاس کیوں چلا گیا۔“

میں نے پوچھا ”تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہارے یہاں سے سیدھا لالہ موسیٰ ہی گیا تھا؟“

وہ گڑبڑ اگنی پھر سنبھل کر بولی ”آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ اس کی لاش لالہ موسیٰ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ملی ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا پھر پوچھا ”جیل نے تمہیں یہ تو بتایا ہی ہو گا کہ نوازش علی کا گھر چھوڑنے کے بعد اس نے اتنا عرصہ کہاں گزارا تھا؟“

”وہ لالہ موسیٰ سے سیدھا راولپنڈی چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ عرصہ ایک ہوٹل میں برتن اٹھتا رہا۔ پھر حسن ابدال کی طرف نکل گیا۔ وہاں بھی دل نہیں لگا تو گجرات چلا آیا۔ پانچ سال سے وہ وہیں تھا۔ پنکھوں کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا اور بھڑی مگلی۔“

میں نے ”زہین کی بات قطع کرتے ہوئے باری باری دونوں میاں بیوی کو دیکھا پر پوچھا ”آپ کو یقین ہے کہ جیل اختر کا قتل رانا نوازش علی ہی نے کیا ہے؟“

”مجھے تو پکا یقین ہے جناب۔“ زہین نے جلدی سے کہا۔

طالب حسین بولا ”اگر اس نے خود قتل نہیں کیا تو کسی سے کروایا ضرور ہو گا۔ لالہ موسیٰ میں جیل کا کوئی اور دشمن نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”مقتول جیل اختر کی لاش لالہ موسیٰ کے سرکاری اسپتال کے مرده خانے میں رکھی ہے۔ اگرچہ اس کا اصل وارث نوازش علی ہی ہے لیکن اگر وہ کسی طرح بھی اس قتل میں ملوث ثابت ہو جاتا ہے تو پھر لاش اس کے حوالے نہیں کی جاسکتی۔“

اے۔“

”لو جی، کر لو گل۔“ زہین ہاتھ نچا کر بولی ”میں نے کیا پٹیاں پڑھانا تھیں۔ بولا کے لئے آواز اٹھانا کون سی بری بات ہے۔ میں نے کیا غلط کیا جو جیل کو اصل حالات سے باخبر کر دیا۔“

”اپنی ”محنت“ کا نتیجہ بھی دیکھ لو پھر“ طالب حسین نے کہا ”جوان جہان گیا ہے۔“

میں نے ان کی باہمی تکرار میں مداخلت کرتے ہوئے ”زہین سے پوچھا“ تم نے ان حالات سے جیل کو باخبر کیا تھا؟“

وہ بولی ”او جناب“ میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کا تایا بہت مکار ہے اور بے ایمان ٹھہرے۔ اس کی بیوی اور اولادیں جن زمینوں کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں وہ سب کچھ دراصل اسی کا ہے۔ اسے اپنے حق کے حصول کے لئے لڑنا چاہیے۔ وہ عدالت میں کیس کر دے۔ میں خود گواہی دوں گی اس کی حمایت میں۔ اسے کسی پریشانی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پھر اس نے تمہاری تجویز پر عمل کیا؟“

زہین نے بتایا ”پہلے تو اسے میری بات کا یقین ہی نہیں آیا۔ میں ایک بار اسے ساتھ لے کر کڑیاں والہ بھی گئی تھی اور وہاں کے دیرینہ رہائشیوں سے اس بارے میں ان کے سامنے پوچھا تھا۔ انہوں نے بھی میری بات کی تصدیق کی تھی۔ بس ایک مزارعہ! شخص تھا جو اپنی ہی رائی کا رہا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ وہ زمینیں رانا نوازش علی کی ملکیت ہیں اور امانت علی کا اس سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی مدد خاطر وہ زمینیں اسے دے رکھی تھیں ورنہ ان کا اصلی مالک نوازش علی ہی تھا۔ میں نے جب اختر کو سمجھایا کہ یہ سب اس کے تایا کی چال ہے۔ امانت علی کی زمینوں کے کاغذات کے قبضے میں تھے۔ اس نے یقیناً ان کاغذات میں کوئی گڑبڑ کی ہو گی۔ اگر جیل عدالت دروازہ کھٹکھٹائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا ”تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے اس بات کی سچائی ثابت کر کے لئے۔ عدالت ثبوت کے بغیر کارروائی نہیں کرتی۔“

”ثبوت تو کوئی نہیں ہے جناب“ پر پورا پنڈ گواہی دے سکتا ہے اس بات کی۔“ گواہی سے زیادہ اہمیت دستاویزی ثبوت کی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا ”مگر تمہارا“

بعد رانا نوازش علی کی طرف مڑ کر کہا ”میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“  
 ”حکم کریں آپ، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
 بولا ”آپ بیٹھیں تو سہی۔“  
 میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”وہ ضروری باتیں سب کے سامنے نہیں  
 ہو سکتیں۔“

میری بات کا مطلب سمجھ گیا، فوراً بولا ”اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ ہم اندر چل کر بیٹھتے  
 ہیں۔“  
 دفتر سے ملحقہ ایک اور کمرہ تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو دفتر میں ہی چھوڑا اور نوازش  
 علی کے ساتھ اندرونی کمرے میں آگیا۔ کمری کی سیٹنگ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ آرام  
 کرنے کا کمرہ تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ جنازی سائز پینٹ بچھا ہوا تھا۔ دوسری جانب صوفے  
 لگے ہوئے تھے جن کے آگے ایک میز بھی موجود تھی۔ ہم صوفوں پر بیٹھ چکے تو نوازش علی  
 نے پوچھا ”ملک صاحب، پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ ٹھنڈا پیئیں گے یا گرم۔ ویسے موسم تو گرم  
 کا ہی ہو رہا ہے۔ چائے منگواؤں یا کستوری والا دودھ۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“  
 ”کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”اس وقت میں آن  
 ڈیوٹی ہوں۔“

وہ سمجھ کر رہ گیا پھر بولا ”جیسے آپ کی مرضی۔ خیر آپ بتائیں، کس سلسلے میں میرے  
 پاس تشریف لائے ہیں؟“  
 میں نے کہا ”آپ جمیل اختر کو تو جانتے ہوں گے؟“  
 ”کون جمیل اختر؟“  
 اس کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا کر گزر گیا، میں نے کہا ”وہی جمیل اختر جو آپ  
 کے چھوٹے بھائی امانت علی کی اکلوتی اولاد تھا اور آپ اسے کڑیا نوالہ سے لے کر اپنے گھر  
 آئے تھے؟ کچھ یاد آیا؟“  
 وہ سنبھل کر بیٹھ گیا پھر بولا ”ہاں، وہ میرا بھتیجا ہے لیکن بہت جذباتی اور بے وقوف  
 ہے۔“

”میں نے سنا ہے، وہ کچھ عرصہ قبل گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا؟“  
 ”ہاں ہاں، میں نے اس کو تلاش کرنے کی بھی بہت کوشش کی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔“  
 نوازش علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”حالانکہ میری دکان کا مال پورے ملک میں جاتا ہے۔ میں

اس صورت میں آپ جمیل کی لاش حاصل کرنا چاہیں گے تو ہم اپنے طور پر.....“  
 ”ابن جلدی سے بولی ”نہیں جناب، آپ لاش ہمیں دیں گے۔ ہم یہاں اپنے قبرستان  
 میں اسے دفن کریں گے۔“  
 دو چار رسمی سوالات پوچھنے کے بعد ہم واپس لالہ موسیٰ آگئے۔



اگلے روز میں نے اے ایس آئی احمد حسن کو ساتھ لیا اور غلہ منڈی پہنچ گیا۔ مجھے اس  
 تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لئے جان پہچان بھی ابھی محدود تھی۔  
 نوازش علی کی دکان ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بہت بڑی دکان کی  
 پیشانی پر ”رانا نوازش علی اینڈ سنز“ کا بورڈ آویزاں تھا۔ نیچے لکھا تھا ”گندم، چاول، گڑ اور تمام  
 دالوں کے تھوک بیوپاری۔ ظاہر ہے، اتنی بڑی غلہ منڈی میں وہ پرچون کی دکان تو کھول نہیں  
 سکتا تھا۔

دکان خاصی بڑی تھی جس کے سامنے والا حصہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کچھ  
 حصے میں اناج کا گودام تھا جہاں فرش سے چھت تک بوریاں ایک دوسرے کے اوپر لدی ہوئی  
 تھیں۔ دکان کے دفتر والے حصے میں چند افراد موجود تھے جن میں رانا نوازش علی نمایاں نظر  
 آ رہا تھا۔ دکان کے باہر دو ٹرکوں پر مال لادا جا رہا تھا۔ مزدور اپنی پیٹھ پر اناج کی بوریاں اٹھا کر  
 ٹرکوں میں چڑھا رہے تھے۔

ہم پر نظر پڑتے ہی نوازش علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ قد آور اور قابل رشک صحت  
 مالک تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے لگ بھگ لگایا۔ کپڑیوں سے اس کے ہاتھ  
 میں سفیدی جھلکنے لگی تھی مگر مجموعی طور پر وہ چاق و چوبند اور فٹ نظر آتا تھا۔ میں نے ایک  
 بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی پہلے وہ چونکا تھا پھر اس کے چہرے  
 مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”آئیے آئیے تھانے دار صاحب۔“ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا  
 اپنے سامنے خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”تشریف رکھیں جناب۔“  
 میں نے کہا ”ہم تشریف رکھنے نہیں آئے رانا صاحب۔“ پھر تنقیدی نظروں سے دفتر  
 جائزہ لیا۔ ایک کونے میں کوئی مٹی ٹائپ مینس میز پر مختلف قسم کی فائلیں سجائے حساب  
 کتب میں مصروف تھا جو ہمیں دیکھتے ہی کلام چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ باقی دو افراد ملاقاتی نہ  
 آتے تھے۔ ہو سکتا ہے، وہ نوازش علی کی ”پارٹیاں“ ہوں۔ میں نے بغور ہر چیز کو دیکھنے

نے گرفتاری دے رہے ہیں یا ہمیں اپنا طریقہ اپنانا پڑے گا۔“  
میرا تجربہ تھا کہ رانا نوازش جیسے بااثر اور طاقت ور لوگ خود ایسے کام نہیں کرتے بلکہ اپنے ملازمین یا کرائے کے بندوں سے کام لیتے ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ ذرا دھمکا کر رانا نوازش کی سے اصلیت اگلا لوں مگر وہ قتل والی بات سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گیا۔  
”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“ وہ غصے سے بولا ”آپ کو کسی نے میرے خلاف غلط

میں نے کہا ”حقیقت آپ کو بھی معلوم ہے اور میں بھی اپنی تفتیش سے سمجھ چکا ہوں۔ بس چند کڑیاں باقی ہیں“ وہ آپ ملا دیں۔ آپ کی اطلاع کی لئے بتا دوں کہ زیب النساء نے مجھے سارے حالات سے آگاہ کر دیا ہے، میں کل ہی جہلم اس سے مل کر آیا ہوں۔“  
”اچھا وہ لالچی عورت۔“ اس نے حقارت سے ایک طرف تھوک دیا ”اس نے آپ کو بڑے خلاف بھڑکایا ہے؟“

”میں کسی کے بھڑکانے میں نہیں آتا ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”اپنی تفتیش پر بھروسہ کرتا ہوں، اور میری تفتیش مجھے سمجھا رہی ہے کہ قاتل آپ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔“

”تھانے دار صاحب، یہ دھمکی آپ کسی اور کو جا کر دیں۔ میں ایسی دھمکیوں سے رنے والا نہیں ہوں۔“ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا ”میں اس شہر کا ایک معزز اور باری آدمی ہوں۔ پشاور سے کراچی تک میری ایک ساکھ ہے۔ آپ ذرا سوچ سمجھ کر بات کریں۔“

”قاتلوں کے ساتھ میں کسی رو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا ”دومنٹ کے نوٹ فیملہ کر لیں۔ اپنے قدموں سے چل کر تھانے جانا ہے یا ٹانگیں۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حالت اس وقت کیے کے قاتل تھی۔ زندگی میں کسی نے اس سے اس لہجے میں بات نہ کی ہوگی، وہ تمللا کر ”میرا نام نوازش علی ہے۔ میری رگوں میں راجپوت خون دوڑ رہا ہے۔ آپ مجھ سے متھا کر بہت بچھتا میں گے ملک صاحب۔“

میں نے اسی لہجے میں جواب دیا ”راجپوت خون پر فخر کرنے کا آپ کا حق ہے، مگر کسی بے گناہ کی جان لینے کا حق آپ کو نہیں ہے۔“ پھر میں نے آواز دے کر اے ایس آئی کو

نے تمام دکان داروں اور ٹرک ڈرائیوروں کو بھی کہہ رکھا ہے کہ آتے جاتے آنکھیں کھول کر رکھیں اور جیسے ہی جمیل نظر آجائے اسے فوراً لے کر میرے پاس آئیں۔“

اس کے لہجے کا کھوکھلا پن بتا رہا تھا کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے طنز سے اس میں کہا ”آپ تو اس کی گمشدگی سے بہت پریشان ہوئے ہوں گے۔“  
”کیا پوچھتے ہیں ملک صاحب۔ میں نے جمیل کو ڈھونڈنے کے لئے کون کون سا طریقہ اختیار نہیں کیا۔“ پھر وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا ”آپ نے مجھے جو کچم بتا ہے، اس میں کوئی ہیر پھیر تو نہیں ہے؟“  
”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ ناگواری سے بولا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں رانا صاحب۔“ میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ گزشتہ اتوار چار دہرے کو دوپہر کے بعد جمیل اختر آپ سے ملنے آیا تھا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“  
”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تیز لہجے میں بولا ”آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ میں نے تو جمیل کو آٹھ سال سے دیکھا بھی نہیں۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”اور..... اسی رات یعنی چار دہرے کسی نے جمیل اختر کو قتل کر کے ریلوے لائن کے پاس پھینک دیا تھا۔ اس وقت اس کی لاش سرکاری اسپتال میں رکھی ہے۔“

اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آکر چلا گیا، پلکیں جھپکائے بغیر بولا ”قاتل کو گرفتار کر لے آپ نے؟“

”اسی لئے ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔  
”جی، میرا قاتل سے کیا تعلق واسطہ؟“

”آپ سے زیادہ واسطہ اور کس کا ہو سکتا ہے رانا صاحب!“ میں نے کہا ”آپ نے خود اسے قتل کیا ہے یا کسی اور سے کروایا ہے، یہ تو آپ ہی بتائیں گے۔“

”آپ مجھ پر قتل کا الزام لگا رہے ہیں؟“  
”اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے میں نے بہت سا مواد جمع کر لیا ہے۔ آپ شرانہ

اندر بلا لیا۔ وہ اندر آیا تو میں نے پوچھا ”باہر کیا پوزیشن ہے احمد حسن؟“  
”تھوڑی بلچل ہے ملک صاحب۔“

میں نے اسے بلچل کی وضاحت کرنے کو کہا، اس نے بتایا ”ملک صاحب“ آپ کے اندر آتے ہی وہ منشی ٹائپ شخص اٹھ کر باہر چلا گیا تھا پھر اس نے ٹرکوں کے پاس کھڑے ایک تو منند شخص کے کان میں کچھ کہا۔ بات سننے کے بعد اس شخص نے مشکوک نظروں سے اندر دفتر میں مجھے دیکھا۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ منشی واپس آیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد باقی دو افراد بھی اٹھ کر دفتر سے نکل گئے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کہیں نزدیک ہی ٹھلنے گئے ہوں۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا ”یہ اپنے رانا صاحب تعاون کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کو تھانے لے جانا پڑے گا۔“

نوازش علی میرے تیوروں سے سمجھ گیا تھا کہ میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں، قدرے نرم پڑتے ہوئے اس نے کہا ”جناب“ میں تو قانون سے ہمیشہ تعاون کرتا آیا ہوں۔ آپ اس تھانے میں نئے آئے ہیں اس لئے....“  
”ہتھکڑی نکالو احمد حسن۔“ میں نے نوازش علی کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے اے ایس آئی کو حکم دیا۔

نوازش علی لجاجت سے بولا ”آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ملک صاحب۔ آپ چاہیں تو ہمارے درمیان دوستی ہو سکتی ہے۔ میں یاروں کا یار ہوں۔ آپ کی ہر خدمت کو تیار ہوں۔“

پھر اس نے مجھے ایک گھڑی رشوت کی پیش کش کی۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ جیل اختر کو اسی نے قتل کروایا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو حکم دیا ”گرفتار کر لو اسے۔“  
اے ایس آئی ہتھکڑی لے کر نوازش علی کی جانب بڑھا تو اس نے رشوت کی رقم دینی کرتے ہوئے کہا ”اگر یہ بھی کم ہوں تو میں....“

میں نے کڑک کر کہا ”تم نے سنا نہیں احمد حسن، فوراً گرفتار کر لو اسے۔“  
نوازش علی کو اپنی دولت پر بڑا مان تھا۔ میرے لہجے کی سختی برقرار رہی تو اس کا سارا مان خاک میں مل گیا۔ اس کے چہرے پر شدت توہین کی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر وہ مجھ سے اپنے تعلقات کا رعب جمانے کے لئے اوپنی اوپنی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کی کسی بھی بات سے مرعوب ہوئے بغیر کہا ”رانا جی عزت اور ذلت صرف اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔“

اپنے اونچے تعلقات کی دھمکیاں تم کسی اور کو دینا۔ میں ہمیشہ اپنا استغنی جیب میں رکھتا ہوں۔“

اے ایس آئی نے میرے حکم کی تعمیل میں نوازش علی کو آہنی زپور پہنا دیا تو پہلی مرتبہ مجھے اس کے چہرے پر فکر کے سائے نظر آئے۔ وہ میرے گھٹنوں کو چھو کر رو دینے والے انداز میں بولا ”ملک صاحب“ اس غلہ منڈی میں میری بڑی عزت ہے۔ لوگ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ میں تو جیتے جی مارا جاؤں گا۔ نہ مر سکا تو کسی کو منہ مارنے کے قابل نہیں رہوں گا۔ میں آپ کے ساتھ تھانے چلنے کو تیار ہوں مگر ہتھکڑی قبول دیں۔ بس میرا آپ سے اتنا سا سوال ہے۔“

اس وقت ہم دونوں اکیلے ہی تھے۔ اے ایس آئی میرے اشارے پر منشی کو گرفتار کرنے بیرونی دفتر میں جا چکا تھا۔ منشی کی ذات بھی حک سے پاک نہیں رہی تھی۔ اے ایس آئی نے اس کی جس حرکت کا ذکر کیا تھا، میری نظر میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ رانا نوازش علی کی حالت سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت اگر اس کے سامنے مناسب چارہ پھینکا جائے تو وہ بہ آسانی نکل لے گا۔ اور بہت سی کام کی باتیں اگل دے گا۔ میں نے ایک آزمودہ حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا ”رانا صاحب“ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ جیل اختر آپ کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا۔ اس لئے اب بھی آپ کے پاس وقت ہے۔ آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کر کے اپنی پوزیشن صاف کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے چونک کر حوصلہ افزا نظروں سے مجھے دیکھا ”آپ.... آپ تو مجھے جیل اختر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر چکے ہیں۔ میں اپنی پوزیشن کس طرح صاف کر سکتا ہوں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”آپ اصل قاتل کی نشان دہی کر کے اپنے لئے سلطانی گواہ بننے کی راہ تو ہموار کر سکتے ہیں؟“

”خدا کی قسم، آپ یقین کریں۔ میں قاتل کے بارے میں کچھ نہیں....“  
میں نے اسے ٹوک دیا۔ شکار چارے پر منہ مارنے کو تیار تھا اس لئے میں نے ڈھیل دینے ہوئے کہا ”مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ جیل اختر کے قاتل سے واقف نہیں ہیں۔“  
میں نے دانستہ جموٹ بول کر اس کا اعتماد حاصل کرنے اور اسے مزید گھمنے کی کوشش کی ”اب آپ مجھے یہ تو بتا سکتے ہیں کہ چار دسمبر کو بعد از دوپہر کیا واقعات پیش آئے تھے؟“  
الٹانک وہ انتہائی تھکا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے کندھے جھک گئے۔ اس وقت وہ مجھے

بجڑے میں پھنسے ہوئے ہے بس چوہے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا جال آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے کہا ”میں آپ کو آخری موقع دے رہا ہوں رانا صاحب۔ آپ مجھے حقیقت حال بتا کر اپنی گردن بچا سکتے ہیں۔“

اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر وہیں صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے باہر دفتر میں آکر ایسے ایسے آئی سے کہا کہ وہ منشی کو لے کر تھانے چلا جائے۔ مجھے ابھی تھوڑی دیر یہاں رکنا پڑے گا۔ اے ایس آئی فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں اندر آکر رانا کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر او اس نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے کہا ”شروع ہو جائیں رانا صاحب۔ وقت بہت کم ہے۔ میں تھانے میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”میرا تو خیال ہے، تھانے ہی چلتے ہیں۔ وہاں زیادہ مناسب طور پر بات ہو سکے گی۔“

”نہیں نہیں، میں آپ کو سب کچھ نہیں بتا دوں گا۔“ وہ پہلو بدل کر ہتھکڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا ”آپ اسے تو کھول دیں ملک صاحب۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔“

میں نے اپنی ذمہ داری پر اس کی فرمائش پوری کر دی۔ وہ کلاہیوں کو اچھی طرح ملنے کے بعد بولا ”ملک صاحب، آپ کا اے ایس آئی میرے منشی کو گرفتار کر کے لے گیا ہے۔ میری دکان میں اس وجہ سے سنسنی پھیل گئی ہو گی۔ باہر ٹرکوں پر مال لوڈ ہو رہا ہے۔ کئی افراد یہاں موجود ہیں۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے درکرز کو صورت حال کی وضاحت کر دوں۔ پھر ہم اطمینان سے دفتر میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“

میں نے پوچھا ”منشی کی گرفتاری کے بارے میں آپ لوگوں کو کیا بتائیں گے؟“ وہ ایک آنکھ دبا کر بولا ”آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس کی گرفتاری کے لئے خود پولیس بلوائی ہے۔ وہ حساب کتاب میں مگڑبو کر رہا تھا۔“ ایک لمحے کو اس نے رک کر کہا ”اور یہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہے۔ میں اس کی طرف سے اس سلسلے میں مشکوک تو ہوں۔“

میں نے اسے اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیرونی دفتر میں آنے سامنے بیٹھے تھے۔ اس وقت ہمارے سوا وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ رانا نوازش علی نے دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد ایک ملازم کو

بات کر دی تھی کہ ادھر کسی کو آنے نہ دیا جائے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ دروازے میں کچھ شیشے سے میں باہر کا منظر واضح طور پر دیکھ سکتا تھا جہاں ٹرکوں پر لوڈنگ کا کام جاری تھا۔ ”چار دسمبر کو اتوار تھا۔ اتوار کو ہم چھٹی کرتے ہیں اس لئے دکان بند ہوتی ہے۔“

بازش علی نے معلومات اگلتے ہوئے بتایا ”حسب معمول اس روز بھی دکان بند تھی لیکن پھر کے بعد مجھے مجبوراً دکان کھولنا پڑی۔ کوٹلی (آزاد کشمیر) سے ایک پارٹی کا فون آیا تھا کہ فوراً فوراً حور پر دو ٹرک گندم اور ایک ٹرک گڑ چاہئے۔ کاروبار میں دوسری پارٹی کی ضرورت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مجھے دکان کھولنا پڑی۔ میرے پاس ذاتی تین ٹرک ہیں جن میں سے ایک ٹرک اس وقت دکان پر موجود نہیں تھا۔ بہر حال میں نے کسی نہ کسی طرح ایک ٹرک اور چند مزدوروں کا انتظام کیا اور جلدی جلدی ٹرکوں پر مطلوبہ مال بار کرانے لگا۔“

اس نے سانس لینے کے لئے ایک مختصر وقفہ کیا پھر بات جاری رکھی ”کوئی ساڑھے تین بجے کے قریب جمیل اختر کو میں اپنی دکان پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں اسے تقریباً آٹھ سال سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ تبدیل تو ہو گیا تھا تاہم میں نے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگائی۔ اب وہ تیس چوبیس سال کا ایک کزبل جوان تھا۔ میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہو گیا مگر اس کے رویے میں مجھے سرد مری اور غصیلے پن کا احساس ہوا پھر جلد ہی اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ اس نے مجھے وہ تمام باتیں بتائیں جو اس کی خالہ زہین نے میرے خلاف اس کے ذہن میں بھر دی تھیں۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں سیدھے اور ٹھکانہ طریقے سے اس کا حق اس کے حوالے نہیں کروں گا تو وہ عدالت سے رجوع کرے گا۔“

”میں نے سمجھانے والے انداز میں نہایت ہی نرم لہجے میں کہا ”برخوردار، تمہیں است اور دشمن کی پہچان نہیں ہے۔ تمہاری ماسی تمہیں بہکا رہی ہے۔ دراصل وہ اپنی بیٹی بڑی شادی تم سے کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے جھوٹ بول رہی ہے کہ کڑیاں والہ کی اراضی ہمارے والد مرحوم کی ہے۔ اس نے تو تمہاری والدہ کی وفات پر بھی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی پوری کوشش کی تھی مگر میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ جب تمہارے والد کا نقل ہوا، اس وقت تم ابھی اس دنیا میں آئے بھی نہیں تھے۔ پھر چار سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ تمہاری والدہ چل بسیں۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اس وقت تمہاری عمر اتنی نہیں تھی کہ زمین و جائداد کے معاملات کو سمجھ سکتے۔ بعد میں تو میں

نے کا ایک معزز شہری بتایا۔۔۔ تم اس تایا کو آنکھیں دکھا رہے ہو۔  
 ”میں اس تایا کو آنکھیں دکھا رہا ہوں جس نے بری طرح بے عزت کر کے مجھے گھر  
 لے کر مجبور کر دیا اور۔۔۔ اور جو میرے والد مرحوم کی تمام زمین و جائداد پر قبضہ کر

میں نے اس پر بھی سخت رویہ اختیار نہیں کیا اور کہا ”گلتا ہے تمہاری ماسی کوئی گہری  
 کرتے کر رہے ہے اور گاؤں والوں کو بھی اس نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔“  
 اتنے سارے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے۔“ وہ پاؤں پیچ کر بولا ”میں اب یہاں سے  
 جا پڑاری کے پاس جاؤں گا“ پھر تحصیل دار کے پاس۔۔۔ اور جہاں جہاں بھی ضروری ہوا  
 ہوں گا مگر آپ کی باتوں میں نہیں آؤں گا۔ اب یہ تو مجھے پتہ چل گیا ہے کہ آپ سیدھے  
 ریتے سے میرا حق واپس نہیں کریں گے۔“

اتنا کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا اور کہا ”تم ایک پڑھے  
 لکھے اور سمجھ دار انسان ہو۔ میں اپنی بات کی سچائی کے لئے تمہیں وہ تمام کاغذات اور  
 ثبوتات دکھا سکتا ہوں جو مجھے کڑیا نوالہ کی زمینوں کا مالک ثابت کرتی ہیں۔ پھر تو تمہارا  
 نام دور ہو جائے گا نا؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر بولا ”ہاں“ دکھائیں مجھے وہ دستاویزات۔ وہ دیکھنے کے بعد ہی  
 انکی فیصلہ کروں گا۔“

میں نے کہا ”تم آرام سے دفتر میں بیٹھو۔ ذرا یہ کام ختم ہو جائے پھر میں تمہیں اپنے  
 نوکمر لے چلوں گا اور تمام دستاویزات نکال کر تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔“

”میں اس گھر میں ہرگز قدم نہیں رکھوں گا۔“ وہ بھڑک کر بولا ”آپ شاید بھول گئے  
 مگر میں ماضی کا وہ شرمناک واقعہ نہیں بھول سکتا۔ نہیں بھول سکتا میں وہ دن۔“

وہ خلاصہ جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا اور نرم لہجے میں کہا ”  
 ہے، تم وہاں نہیں جانا مگر یہاں دفتر میں تو آرام سے بیٹھو۔ ٹرک روانہ ہو جائیں تو میں  
 جا کر وہ کاغذات لے آؤں گا۔ اب تو خوش ہو؟“

”اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی کرسی پر ملک صاحب جہاں  
 وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں باہر جا کر کام کی نگرانی کرنے لگا۔ مغرب کی اذان تک  
 لم سے فارغ ہو گئے تو میں کاغذات وغیرہ لینے گھر چلا گیا مگر جب میں واپس آیا تو جمیل  
 اہل سے جا چکا تھا۔ میرے بیٹے فیاض احمد نے بتایا کہ وہ دھمکی دے کر گیا ہے کہ

نے تمہیں سب کچھ بتا ہی دیا تھا کہ وہ زمینیں دراصل میری ہی تھیں جو میں نے تمہارے  
 والد کو ٹھیکے پر کاشتکاری کے لئے دی ہوئی تھیں۔“

وہ پوری بات سننے کے بعد بولا ”یہ سب کچھ تو آپ میرے ذہن میں سالوں سے  
 رہے ہیں۔“

”میں نے تمہیں وہی بتایا ہے۔۔۔ اور بتاتا رہا ہوں“ جو حقیقت ہے۔“  
 وہ برہمی سے بولا ”آپ اور آپ کی اولادیں تو میرے والد کی زمینوں کی کھائی پر

لوٹتے رہے اور میں اس گھر میں ایک نوکر کی حیثیت سے زندگی گزارتا رہا لیکن اب حقیقت  
 مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔“

میں نے کہا ”تمہاری ماسی کا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ نہیں چاہتی کہ تم دوبارہ میرے  
 پاس آ جاؤ۔۔۔ اور ہاں، تم اتنے سال تک کہاں رہے ہو؟ معمولی سی بات پر ناراض ہو کر کوئی  
 یوں چلا جاتا ہے۔ تم تو تصور نہیں کر سکتے، میں تمہارے لئے کتنا پریشان رہا ہوں۔ کیا اب  
 تک تم اپنی ماسی کے پاس تھے؟“

میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا ”آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“  
 ”کیسا فیصلہ؟“

”مگر کا معاملہ گہری میں منٹ جائے گا یا مجھے مقدمے بازی کرنا پڑے گی۔“  
 میں نے فیسے کو ضبط کرتے ہوئے کہا ”یہ مقدمے بازی کی راہ بھی تمہیں تمہاری ماسی  
 نے دکھائی ہو گی؟“

”آپ اس کو چھوڑیں، میری بات کا جواب دیں۔“  
 میں نے کہا ”تمہاری بات کا جواب صرف اتنا سا ہے کہ تمہاری ماسی تم سے کوئی ہلالی

دشمنی نکالنا چاہتی ہے اور تم اس کا آلہ کار بننے کے لئے اندھے ہو گئے ہو۔“  
 ”ایک ماسی ہی کی بات نہیں ہے۔“ وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا ”کڑیا نوالہ کے

لوگوں کا بھی یہی خیال ہے وہ زمینیں میرے والد مرحوم کی ہیں جن پر آپ سناپ بن کر بیٹھے  
 ہوئے ہیں۔“

اس کا لہجہ اندر سے کھولا رہا تھا مگر میں جواباً طیش میں نہیں آتا چاہتا تھا۔ بلکہ میں  
 کوشش کر رہا تھا کہ اس کی ماسی کے سحر کا کوئی ٹوڑ کر سکوں۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا  
 ”برخوردار“ تم تو بزرگوں کا احترام بھی بھول گئے۔ یہ تم اپنے تایا سے کس انداز میں بات کر  
 رہے ہو۔ وہ تایا جس نے تمہیں ایک باپ بن کر پالا۔ کھلا پلا کر جوان کیا۔ پڑھا لکھا کر اس

عدالت ہی سے رجوع کرے گا۔“

رانا نوازش علی بات ختم کر چکا تو میں نے کہا ”جب وہ دستاویزات دیکھنے پر آمادہ ہوئے تھے تو پھر چلا کیوں گیا؟“

”رب جانے ملک صاحب!“ نوازش علی نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا ”گنگا ہے“ میں نے اسے میرے خلاف کرنے کے لئے کوئی ایسا تعویذ گھول کر پلا دیا تھا کہ اس کا باغی بننا اٹ گیا تھا۔ مجھے تو وہ کوئی پاگل ہی نظر آ رہا تھا۔“

مجھے دال میں کچھ کالا محسوس ہوا۔ میں نے پوچھا ”رانا صاحب، جب آپ کانڈرات گھر گئے تو دکان میں کون کون تھا؟“

”اللہ آپ کا بھلا کرے، ایک تو میرا بڑا بیٹا فیاض احمد تھا اور منشی تھا۔۔۔ اور دوسرا پانڈی (پلے دار مزدور) تھے۔“

میں نے کہا ”رانا صاحب، وہ چھٹی کا دن تھا اور آپ بچنے ہنگامی حالات کے تحت دکان کھولی تھی۔ منشی اس دن کیسے وہاں پہنچ گیا؟“

”منشی کا گھر ادھر منڈی کے نزدیک ہی ہے۔“ نوازش علی نے بتایا ”میں نے آنے ہوئے راستے میں سے اسے بھی لے لیا تھا۔ پانڈی وغیرہ تو ادھر منڈی میں ہی پہنچے وقت وغیرہ) پر بیٹھے مل جاتے ہیں۔ ویسے میں نے احتیاطاً اپنے گھریلو ملازم شیرو کو بھی ساتھ لے لیا تھا تاکہ کوئی دشواری پیش نہ آئے۔“

میں نے پوچھا ”شیرو آپ کے گھر میں کس قسم کی ملازمت کرتا ہے؟“

”وہ جی میرا ڈرائیور ہے۔ اس کے علاوہ فارغ وقت میں گھر کے اوپری کام بھی کرتا ہے۔“

”رانا صاحب، آپ نے بتایا ہے کہ جب آپ دستاویزات وغیرہ لے کر واپس دکان پہنچے تو جمیل دہاں سے جا چکا تھا۔ اس وقت دکان میں اور کون کون تھا؟“

”یہ سوال آپ پہلے بھی پوچھ چکے ہیں۔“ نوازش علی نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کو جواب دینے میں کوئی اعتراض ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا ”پہلے دالے سوال اور اس سوال میں تمہارا فرق ہے۔ پہلے میں نے پوچھا تھا، گھر جاتے وقت دکان میں کون کون تھا۔ اب پوچھ رہا ہوں، جب آپ کی واپسی ہوئی تو دکان میں کون کون موجود تھا۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا ”پانڈی تو اس وقت تک رخصت ہو چکے تھے۔“

فیاض احمد، منشی اور شیرو وہیں پر موجود تھے۔“

میں نے سمجھتے ہوئے لمبے میں سوال کیا ”شیرو تو آپ کا ڈرائیور ہے۔ آپ اس کے گھر چلے گئے تھے؟“

”وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ گھر سے دکان پر آنے جانے کے لئے میں گاڑی استعمال کرتا۔ فاصلہ ہی کتنا ہے۔ آخر۔ ویسے بھی اتنی چھل تھی تو کرنی ہی چاہئے۔ صحت اچھی ہے۔“

میں نے پوچھا ”منشی تو اس وقت تھامے میں ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ چار دسمبر کو لوڈنگ کے والے مزدوروں اور آپ کے ڈرائیور شیرو سے ابھی میں مل سکتا ہوں۔۔۔ اور وہ آپ کا صاحب زادہ فیاض احمد کدھر ہے؟“

”لوڈنگ والے بندے تو ہم نے اپنا کام چلانے کے لئے ادھر ادھر سے پکڑے تھے۔ وہ اسے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات تو ممکن نہیں ہو سکتی اور فیاض احمد اس وقت گھر پر ہو گا۔ وہ کل ہی لاہور سے آیا ہے۔ دونوں بھائی ادھر بڑے کالج میں پڑھتے ہیں اور ہوٹل میں رہتے ہیں۔ باری باری گھر کا چکر لگا لیتے ہیں۔“ ایک لمبے کو رک کر اس نے دفتر کے دروازے سے باہر جھانکا پھر بولا ”شیرو ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھا۔ اب نظر نہیں آ رہا۔ آپ ٹھہریں، میں اسے ڈھونڈواتا ہوں۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے دفتر کے باہر جا کر ایک مزدور کو کچھ ہدایات دیتے پھر اندر آ گیا۔ اس نے مذکورہ مزدور سے جو بات کی تھی وہ میں نے بھی سنی تھی، اس نے واقعی شیرو کو تلاش کرنے کی بات کی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس مزدور نے آکر بتایا کہ شیرو آس پاس میں بھی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے، گھر کی طرف چلا گیا ہو!“ نوازش علی نے قیاس آرائی کی۔

میرے ذہن میں اسے ایسے آئی کی فراہم کردہ اطلاع محفوظ تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ دیر کے لئے منشی نے دفتر سے باہر جا کر ایک قدر اور شخص سے پراسرار انداز میں نوکمر پھر کر تھی۔ مجھے شک تھا کہ وہ شخص شیرو ہو سکتا تھا۔ نوازش کے بیان کے مطابق جمیل اختر اس کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا تو اس وقت دکان پر اہم افراد، منشی، شیرو اور نوازش کا بیٹا فیاض احمد موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ تینوں افراد جمیل کے قتل کا معاملہ کرنے میں بہت ”کام کے بندے“ ثابت ہو سکتے تھے اور اس کیس کا مافی ”روشنی“ دلال سکتے تھے۔ میں نے تینوں کو مشتبہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر

رکھ لیا اور رانا نوازش علی سے کہا۔

”رانا صاحب‘ زمینوں کی وہ مالکانہ دستویزات میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس کے چہرے پر اس نوعیت کی گھبراہٹ نمودار ہوئی جیسے کسی چور کی چوری پکڑ جانے پر اس کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر نوازش علی نے یہ قتل نہیں بھی کروایا تو اس نے زمینوں کے معاملے میں ضرور کوئی بڑا گھپلا کیا ہو گا۔ وہ جب خاصی دیر تک مضطرب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا تو میں نے کہا۔

”دستویزات دکھانے میں کوئی قباحت ہے کیا؟“

وہ جلدی سے بولا ”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل وہ کانڈزات یہاں نہیں ہیں۔ گھر پر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں، ایسی اہم چیزوں کو تو دفنوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ یہاں تو ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے ساتھ گھر چلتا ہوں۔“ میں نے کہا ”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جناب۔ چلیں، ابھی چلتے ہیں۔“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زمین کی ملکیت کے کانڈزات دیکھنے کی بات میں نے ایسے ہی کر دی تھی۔ دراصل میں

اس کے گھر اس لئے جانا چاہتا تھا کہ شہر وہیں مل سکتا تھا اور نوازش علی یہ تو بتائی چکا تھا کہ اس کا بیٹا فیاض احمد لاہور سے آیا ہوا ہے اور اس وقت گھر پر ہی ہے۔ ایک مشکوک فرد

نشی اس وقت تھانے میں تھا۔ باقی دونوں افراد کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت مجھے رانا نوازش علی کے گھر جانے پر اکسارہی تھی۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو پھر نشی نے جس نہ

آؤر غومند شخص سے سرگوشی کی تھی، وہ شہر وہیں تھا جو وہاں سے فوراً غائب ہو گیا تھا اور مجھے کامل یقین تھا کہ وہ کوئی سنسنی خیز اطلاع دینے فیاض احمد کے پاس گیا تھا۔

ہم دونوں ایک ساتھ دفتر سے باہر نکلے۔ رانا نوازش علی نے چند لوگوں کو کام کے بارے میں کچھ احکامات جاری کئے پھر ہم پیدل ہی اس کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں رانا نوازش علی کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس مرتبہ اس نے بعد اصرار مجھے کستوری والا دودھ پلا ہی دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اندر سے ایک

فائل اٹھا لیا۔ فائل کو وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”یہ فائل میں نے بالکل الگ ہی رکھا ہوا ہے۔ آپ دیکھ کر اپنی تسلی کر لیں۔“

میں نے فائل کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس میں لگے ہوئے تمام کانڈزات پاکستان

سے پہلے برٹش گورنمنٹ کے جاری کردہ تھے اور اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ

میں کوئی نوازش علی کا مالک و مختار رانا نوازش علی ہی تھا۔ ان کانڈزات کی صداقت کے

میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد کتنے ہی عیار لوگوں نے

میں کی زمینوں پر اپنی ملکیت ثابت کرنے کے لئے اوتھے چھنڈے اپنا کر جعلی

دستاویزات تیار کروا لی تھیں۔ ایسے بہت سے لوگ وقتاً فوقتاً قانون کی گرفت میں بھی

آئے تھے لیکن بیش تر عیش کر رہے تھے۔ یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ رانا نوازش علی

بیش تر میں ہوتا ہو۔ مختلف کانڈزات پر برٹش عدالت کے فیصلوں کی مہریں بھی ثبت

ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ٹھیکے داری کا معاہدہ بھی تھا جس کے مطابق یہ زمینیں جن کا مالک

رانا نوازش علی تھا امانت علی کو کاشت کاری کی غرض سے دی گئی تھیں۔ اس معاہدے پر

فائل جیل اختر کے مرحوم والد امانت علی کے دستخط بطور مزارع ثبت تھے۔

میں نے فائل واپس کرتے ہوئے نوازش علی کو ایسا تاثر دیا جیسے میں اس کی طرف سے

نہیں ہو گیا ہوں۔ یہ بہت ضروری تھا کیونکہ ابھی مجھے اس کے فرزند ارجمند پر ہاتھ ڈالنا

میں دوستانہ لہجے میں بولا ”رانا صاحب، آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا بیٹا فیاض احمد آج کل

لاہور ہے۔ وہ ابھی تک نظر نہیں آیا۔ کیا گھر میں نہیں ہے؟“

”نظر تو وہ مجھے بھی نہیں آیا۔“ اس نے کہا ”ٹھہرس، میں اس کی ماں سے پوچھتا

ہوں۔“

وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں گیا، تھوڑی دیر بعد واپس آکر بتایا ”وہ کچھ دیر پہلے

آکر چلا گیا ہے۔“

مجھے اچانک خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے تیز لہجے میں پوچھا ”آپ نے تو بتایا تھا

کہ کل ہی لاہور سے آیا ہے پھر اتنی جلدی واپس کیسے چلا گیا۔ اور وہ بھی آپ کو بتائے

بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی؟“

”بت تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ملک صاحب!“ وہ مضطرب نظروں سے مجھے دیکھتے

ہوئے بولا ”میری بیوی نے بتایا ہے کہ کوئی ضروری فون لاہور سے آیا تھا اس لئے اسے جانا

پڑا۔“

میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے میرا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے

اسے پوچھا ”فیاض احمد لاہور میں کس کالج میں پڑھتا ہے؟“

نوازش علی نے مجھے اس کے کالج کا نام اور کلاس وغیرہ کے بارے میں بتایا، میں نے



پوچھا ”آپ کا ڈرائیور شیرو کدھر ہے؟“  
”ابھی ادھر صحن میں تھا۔“

”میں اسے تھانے لے کر جا رہا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اس کا بیان بھی ضروری ہے، بلائیں اسے۔“

نوازش علی نے پوچھا ”اس کے بیان کی کیا ضرورت ہے؟“

”بڑی سخت ضرورت ہے رانا صاحب!“ میں نے قطعیت سے کہا ”نشی کے ساتھ اس سے بھی پوچھ سکتے ہو۔“ ان لوگوں نے آخری مرتبہ مقتول کو زندہ دیکھا تھا۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا تو ان کا بال بھی بکا نہیں ہو گا۔ جس معمول کے چند سوالات کرنا ہیں جیسا کہ آپ سے کہنے ہیں۔“

میں نے رانا کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد اس کے بیٹے کی باری آنے والی ہے۔ اس طرح وہ فیاض احمد کو مطلع کر سکتا تھا مگر مجھے امید تھی کہ وہ اس کے باوجود بھی اپنے بیٹے کو خبر ضرور کرے گا۔ وہ خلاصا ہوشیار اور کائیاں قسم کا آدمی نظر آتا تھا مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، کم از کم فی الحال کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فیاض احمد اس وقت میری دسترس سے دور تھا۔ اس کی گرفتاری کے لئے عدالت سے وارنٹ گرفتاری حاصل کرنا پڑتا کیونکہ وہاں کلچ میں بغیر وارنٹ اس کی گرفتاری میں مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ اس وقت عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ دوسرے روز اتوار تھا۔ اب یہ معاملہ پیر، دسمبر کو ہی نمٹایا جاسکتا تھا۔

میں نے شیرو کو ساتھ لیا اور تھانے واپس آگیا۔ اسے میں نے گرفتار نہیں کیا تھا اس لئے وہ خلاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے اطمینان کی ایک وجہ رانا نوازش کی وہ تسلیاں بھی تھیں جو اس نے وقت رخصت اسے دی تھیں۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے شیرو کو ایک خوف ناک حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”بہادر علی، اسے ذرا تھانے کے ادب آداب تو سکھاؤ۔“

شیرو، بہادر علی کو دیکھتے ہی سسم گیا۔ وہ شکل۔ پورا جلاوٹ نظر آتا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ اس نے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے شیرو کی جانب ہاتھ بڑھایا پھر مجھ سے کہا ”تسی فکر ہی نہ کرو سرکار۔“ میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا ہوں۔“

شیرو خود بھی خلاصا صحت مند اور قد آور تھا مگر بہادر علی اس پر سوا سیر نہیں بلکہ ڈنڈہ سیر تھا۔ بہادر علی نے اسے بازو سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا پھر خوف ناک لہجے میں پتکارا۔

جلو سورا جی، آگے لگو۔“

شیرو میری جانب دیکھ کر منمنایا ”تھانے دار صاحب، آپ نے تو کہا تھا کہ معمولی

سوالات ہی پوچھیں گے۔ یہ حوالدار صاحب مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”سوالات بھی تم سے پوچھیں گے شیر خان کے مامے۔ پہلے تھوڑی سیر شیرو تو کر لو۔“ میں نے حوالدار کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بہادر علی نے اسے کالر سے پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے کہا ”ذرا چھری کے نیچے دم تو لو باگڑ بے کی اولاد۔ ابھی تو ہم نے تمہاری بہت خدمتیں کرنا ہیں۔“

شیرو نے تھوڑا پس و پیش کیا مگر بہادر علی اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر نشی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ نشی کمرے میں داخل ہوا تو اس کے پیچھے پیچھے اسے ایس آئی احمد حسن بھی آگیا۔ نشی کی حالت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب تک اس کی خاصی خاطر مدارات ہو چکی تھی۔ میں نے اسے ایس آئی کو لہجے کوئی ہدایت نہیں کی تھی مگر تھانے کی ”روایتی مہمان داری“ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

وہ سر جھکا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا تو میں نے اسے ایس آئی سے پوچھا ”احمد حسن، تم نے اس کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟“

”نہ ملک صاحب! میں نے تو اس سے بات تک نہیں کی۔ کوئی سوال نہیں پوچھا“ وہ نشی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”آپ تصدیق کر لیں چنب۔“

نشی پینتیس چھتیس سال کا ایک دبلا پتلا اور کمزور سا شخص تھا۔ اسے ایس آئی کے جواب پر اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا اور رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے اس نے مجھے بتایا ”تھانے دار صاحب، انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔“

اسے ایس آئی نے اس کی گردن میں ایک جھانچڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”مار تو اب شروع ہو گی بچو۔ لگ پتا جائے گا نشی حق کی اولاد۔“

وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ میں نے اسے ایک دھکا مارا ”اوائے کیا زنانوں کی طرح لوسے ہمارا ہے۔ اگر تو نے رونا بند نہ کیا تو کھل اوجھڑ کر رکھ دوں گا۔“

اس نے فوراً آنکھیں خشک کیں اور خوف زدہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اس نے جواب دیا ”بشیر احمد۔“

منع کر رکھا ہے۔ اگر جواب دینے کا مؤذ نہیں ہے تو میں تمہیں اے ایس آئی کے حوالے کرتا ہوں۔“

اس نے اچانک میز کے نیچے گھس کر میری ٹانگیں پکڑ لیں پھر زار و قطار رونے لگا۔ اے ایس آئی نے بمشکل اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ وہ آنسوؤں کے درمیان کپکپاتی ہوئی آواز میں گویا ہوا ”پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ رانا صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے پھر میں آپ کو پوری تفصیل سناؤں۔“

”اوئے ہم تیری بے بے کے نوکر ہیں؟“ اے ایس آئی نے گرج کر کہا ”ہم ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اے ایس آئی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کمرے سے نکل گیا تو میں نے منشی بشیر احمد سے کہا ”بیٹھ جاؤ۔“

وہ میرے بدلتے ہوئے رویے پر ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سامنے ہنسی ہوئی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بہ نسبت نرم لہجے میں کہا ”تم نے سنا نہیں بیٹھ جاؤ۔“

وہ ہنستے ہوئے بیٹھ گیا پھر حیرت آمیز سوالیہ نظروں سے میری جانب نکتے لگا۔ اس کی نگاہوں میں الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ میں نے آگے کو جھکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”منشی بشیر احمد میں جانتا ہوں۔ تم ایک شریف آدمی ہو اور تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے مگر جرم کی پردہ پوشی کرنا بھی ایک سنگین جرم ہوتا ہے۔“ میں نے ایک لمحے کو توقف کر کے اس کی آنکھوں میں اپنی بات کا رد عمل تلاش کرنے کی کوشش کی پھر اند میرے میں ایک تیر چلا دیا ”بشیر احمد میں نے ایک پولیس پارٹی رانا فیاض احمد کی گرفتاری کے لئے لاہور روانہ کر دی ہے اور شیرد بھی اس وقت حوالات میں بند ہے۔ شیرد نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ ہار دسمبر اتوار کی شام دکان میں کیا واقعات پیش آئے تھے۔ اب تم مزید جھوٹ بولو گے تو نوڈ کو جیل جانے سے نہیں بچا سکو گے۔ اور رانا صاحب کی دھمکی کی تم پرواہ نہ کرو۔ میں سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ سارا الزام شیرد پر ڈال دوں گا۔ اب سوچ لو“

”ابول کر جان چھڑانا چاہتے ہو یا ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑنا چاہتے ہو؟“

اپنی بات ختم کر کے میں اسے گھورنے لگا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ میرے جھاننے لگا آگیا۔ پھر تھوک نکل کر بولا ”جب شیرد نے سب کچھ اگل دیا ہے تو باقی کیا بچا ہے۔“

”نورز توقف کر کے اس نے کہا“ ”پر تمہارے وار صاحب“ میرا نام نہیں آتا چاہئے۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر اسے یقین دلایا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر مجھے ساری کتھا سنا دی۔

”ہاں تو بشیرے کیا ارادہ ہے۔ جو میں پوچھوں، سچ بتاؤ گے یا پھرنے۔“

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا سرکار۔“ اس نے میرا جملہ کھل ہونے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میں نے تمہارے دارانہ لہجے میں پوچھا ”صبح دکان پر تم نے شیرد کے کٹن میں کیا بات کہی تھی؟“

شیرد کا نام سن کر وہ چونکا ”او جناب۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو۔۔۔“

اے ایس آئی نے اس کی کمر پر لات رسید کی ”اوئے کیا وہ تو؟ وہ تو لگا رکھی ہے۔ تم نے سنا نہیں، ملک صاحب کیا پوچھ رہے ہیں۔“

”ملک صاحب!“ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔“

میں نے اٹھ کر اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا ”بے قصور کے گھوڑے میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دے ورنہ مار مار کر دھوں (دھلاؤں) نکال دوں گا۔“

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اے ایس آئی نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا ”ملک صاحب، یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا۔ اسے میرے حوالے کر دیں۔ میں اس کی زبان خود کھلاؤں گا۔“

”چھوٹے رانا صاحب مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔“ وہ منت آمیز لہجے میں گھکیا۔

”اوئے کون چھوٹے رانا صاحب۔“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا ”انہوں نے کس بات سے تمہیں منع کر رکھا ہے؟“

وہ میری آنکھوں میں تشدد کے لہراتے سائے دیکھ کر لرز کر رہ گیا ”میری جان کا سوال ہے جناب۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”بچے تمہارے تو اب یتیم ہو کر ہی رہیں گے منشی بشیرے۔“ اے ایس آئی نے قاتلانہ انداز میں اسے گھورا ”یہاں سے زندہ جاؤ تو رانا کے ہتھے چڑھو گے۔ ہم تو مار کر یہیں تمہارے کے احاطے میں دفن کر دیں گے۔ نہ کوئی قبر بنے گی نہ پتہ نشان۔“

”ہائے دے میرا سونپا رہا میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“ وہ چمت کی جانب دیکھتے ہوئے فریاد کنل ہوا۔

میں نے کہا ”تم نے ابھی بتایا نہیں کہ کون سے رانا صاحب نے تمہیں کچھ بتانے سے

میں نے حوالدار کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا ”منشی بشیر احمد کو شیرو والی حوالات میں بن کر دو اور شیرو کو میرے پاس لے آؤ۔“ حوالدار اسے لے کر جانے لگا تو میں نے پیچھے سے کہا ”منشی کو اب بالکل ہاتھ نہیں لگنا۔“ منشی بے مصلحت ہو کر اس کے ساتھ چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد حوالدار شیرو کو لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اے ایس آئی احمد حسرت بھی آ گیا۔ شیرو کا حلیہ بتا رہا تھا کہ اس کی خاصی.... گت بنائی گئی تھی۔ وہ میرے سامنے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک طرف حوالدار بہادر علی اور دوسری جانب احمد حسن جم کر کھڑے ہو گئے۔ میں کچھ دیر تک خاموش نظروں سے شیرو کو گھورتا رہا۔ کمرے میں میب سناٹا چھایا ہوا تھا پھر اس سناٹے میں میری آواز گونجی۔ میں نے حوالدار اور اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ لوگوں کو ایک مختصر سی کہانی سناتا ہوں جس کا انجام آپ شیرو کی زبانی سنیں گے۔“

وہ دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے مگر شیرو بے چینی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے رویے پر کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں آنے سے پہلے منشی بشیر احمد کو حوالات میں بند ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا ہو گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر منشی کی سنائی ہوئی کہانی کی روشنی میں کہنا شروع کیا۔

”چار دسمبر، بروز اتوار، چھٹی کا دن، غروب آفتاب کے بعد گلہ منڈی کی ایک دکان پر چار افراد ایک شخص کا انتظار کر رہے تھے جو کسی قسم کی کوئی دستاویزات گھر سے لانے کے لئے گیا تھا۔۔۔ شاید میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔۔۔ دراصل ایک شخص محو انتظار تھا جو مذکورہ دن سہ پہر کو وہاں پہنچا تھا۔ پھر اچانک شہر شخص اور دکان کے مالک کے بیٹے میں کسی بات پر تلخ کلامی شروع ہو گئی جو ہاتھ پائی تک جا پہنچی۔ واضح رہے کہ وہاں موجود چار افراد میں ایک شخص یہی دکاندار کا بیٹا تھا اور جس سے اس کی لڑائی ہو رہی تھی وہ کسی دوسرے شہر سے وہاں پہنچا تھا۔ ان کی کلام گفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی دیرینہ چپقلش تھی۔ باقی دو افراد میں سے ایک اس دکان کا منشی اور دوسرا مالک دکان کا ملازم خاص تھا۔ چلیں، یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ گھر جانے والا شخص ہی اس دکان کا مالک تھا۔“

میں نے لحاظ تو تف کر کے شیرو کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے تھکر کی مہر مٹا چھائی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”پھر ایک موقع پر یہ دن

شہر سے آنے والا شخص دکان وار کے بیٹے پر بھاری پڑنے لگا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بے کئے ملازم خاص کے حق نمک نے جوش مارا اور وہ اپنے مالک کی مدد کو لپکا۔ اس نے اپنے مالک کے اوپر چھائے ہوئے شخص کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دبانا شروع کر دی۔ شاید کوئی حساس رگ دب گئی کہ اس شخص کی گردن ایک جانب کو ڈھلک گئی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ابھی تک مالک دکان واپس نہیں آیا تھا۔ ان تین افراد نے کسی نہ کسی طرح بے ہوش ہونے والے شخص کو گھسیٹ کر گودام میں رکھی ہوئی انتاج کی بوریوں کے پیچھے چھپا دیا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گئے تو مالک دکان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں دکان دار کا بیٹا ان دونوں کو اپنی مرضی کا بیان رٹوا چکا تھا۔ اور دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی زباں سے نکالا تو ان کی خیر نہیں ہوگی۔“

میں نے بات ختم کر کے شیرو کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ”باقی کی کہانی یہ سنائے گا۔“

”میں.... میں.... مجھے کچھ پتہ نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ قسطوں میں ہلکاتے ہوئے بولا۔ خوف نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس کا انگ انگ خزاں ریدہ پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔

”اس کو چیرا لگاتے ہیں جتلب۔“ حوالدار بہادر علی نے خوف ناک انداز میں کہا ”پھر اس کا ایک ایک اعضا پکار اٹھے گا۔ ہمیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔“ اے ایس آئی احمد حسن نے کہا ”میرے خیال میں اس کی شلوار میں چوہے چھوڑ کر پانچوں کا منہ باندھ دیتے ہیں۔ پھر زبان تو کیلی۔۔۔“

اے ایس آئی جملہ اوجھڑا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ میں نے غضب ناک لہجے میں پوچھا ”کیوں لوئے رانا کے پالتو کتے! کون سا طریقہ ٹھیک رہے گا؟“

وہ خدا اور رسول کی قسمیں کھانے لگا اور رو رو کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اس کے مگرچھ کے آنسوؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے سر راتی ہوئی آواز میں کہا ”حرام کے ختم۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔ تمہارے باپ منشی بھرنے ہمیں سارا واقعہ سنا دیا ہے میں نے تمہاری ماں کے یار رانا فیاض کی گرفتاری کے لئے پولیس پارٹی بھی روانہ کر دی ہے۔ اب تم سیدھے سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے۔۔۔ اب بھی وقت ہے، مجھے بتا دو۔ بے ہوش ہونے کے بعد جیل اختر کے ساتھ کیا کیا گیا تھا اور

وہ ادھر ریلوے لائن کے پاس کس طرح پہنچا؟“ پھر میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ”تم پولیس کے رگڑے میں آ چکے ہو۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے سچ بولا تو میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

وہ عجیب لہجے میں بولا ”آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔“

”اوتے سوچنا کیا ہے لکڑی کے باندر۔ جو سچ ہے، ابھی بتا دو۔“ میں نے اسے جھڑکا۔  
حوالدار نے کہا ”ملک صاحب‘ لالٹوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ یہ سوچنے کی مہلت حاصل کر کے کوئی نئی کہانی گھڑنا چاہتا ہے۔ شاید اسے اپنے ولی نعمت کا اختیار ہے۔ میں تو کہتا ہوں‘ آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔ پھر دیکھیں کس طرح فر فر آپ کے سوالوں کے جواب دے گا۔“

”کیوں اوتے ڈشکرے‘ کیا ارادہ ہے؟ رانا نوازش علی سے کسی مدد کی توقع مت رکھنا۔ اس کا تو اپنا بیٹا پھائے لگنے والا ہے۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں پوچھا۔  
منشی مجھے بے قصور نظر آ رہا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ رانا نوازش علی قتل کی اس واردات سے آگاہ نہیں تھا ورنہ وہ میرے سوالات کی پکڑ میں آ جاتا منشی کی زبانی مجھے جو حالات معلوم ہوئے تھے وہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ رانا نوازش علی کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔ قاتل دونوں میں سے کوئی ایک تھا۔ رانا فیاض احمد یا شیرو۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول جمیل اختر کی موت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ رانا فیاض اور جمیل کے درمیان جھگڑا شام چھ بجے کے قریب ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جمیل کو بے ہوش کرنے کے بعد جب اناج کی بوریوں کے پیچھے چھپایا گیا تھا تو اس وقت وہ زندہ تھا۔

میں نے شیرو کو سوچنے کی مہلت دینے کے بجائے حوالدار بہادر علی کے حوالے کر دیا۔ وہ خوش خوشی اسے لے کر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پوچھ گچھ کے کمرے کی طرف سے مجھے شیرو کے بلبلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اس کی دل دوز چیخوں میں تیزی آتی گئی۔ دس منٹ بعد ادھر سے آواز آنا بند ہو گئی اس کے ایک منٹ بعد حوالدار نے آکر مجھے بتایا ”ملازم ہر قسم کے ”تعاون“ کے لئے ”تیار“ ہو چکا ہے۔ آپ کا حکم ہو تو حاضر کروں!“

میں نے پوچھا ”بہادر علی کیس چیرا تو نہیں لگا دیا اس کو؟“

”نہیں جناب‘ آپ کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم تو نہیں اٹھایا جاسکتا۔“ حوالدار نے کہا ”بس ذرا کرسی کے پایوں والا کلیہ آزمایا تھا۔“

”ٹھیک ہے‘ لے آؤ اسے۔“ میں نے کہا۔

پلک جھپکتے میں حوالدار نے شیرو کو پیش کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ فضا میں اٹھائے اس طرح اوپر نیچے جھٹک رہا تھا جیسے کوئی پرندہ پرواز کے لئے پر تول رہا ہو۔ اس کی حالت خاصی قابلِ رحم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں میں مایوسی بکھورے لے رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی ”محنت“ سے حوالدار نے اس کی ”کلیا پلٹ“ دی تھی۔ پولیس والوں کی زبان میں اس کی جیس بول گئی تھی۔ میں نے کڑے تیوروں سے اس کو گھورتے ہوئے غضب ناک لہجے میں پوچھا ”کیوں لوئے بے دم کے شیر‘ کوئی کسریاتی ہے ابھی یا سچ بتانے کا ارادہ کر لیا ہے تم نے؟“

وہ مرل سی آواز میں بولا ”تھانے دار صاحب‘ نوکر تو مالک کے غلام ہوتے ہیں۔ ان سے مالک جو کہتا ہے‘ وہ وہی کرتے ہیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے رانا کا پالتو کہتا تھا۔ کہنے کا تو کام ہی مالک کے پاؤں چاٹنا اور اس کے سامنے دم ہلانا ہوتا ہے جناب! میں نے بھی دی کیا‘ جو میرے مالک نے چاہا۔ میں تو ایک موہو تھا جناب۔ میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔“

”اس کا فیصلہ کرنے کے لئے میں یہاں بیٹھا ہوں کہ کون قصور دار ہے اور کون بے قصور۔ پھر کیس تو ابھی عدالت میں بھی جائے گا۔ باقاعدہ فیصلہ تو دیں ہو گا۔ تم بس اتنا بتاؤ کہ چار دسمبر کی شام جب تم اور جہارے مالک رانا فیاض احمد نے بے ہوش جمیل اختر کو گودام کی بوریوں کے پیچھے چھپا دیا تھا تو اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”اس کے بعد ہم دکن بند کر کے بوئے رانا صاحب (رانا نوازش علی) کے ساتھ گھر چلے گئے تھے۔“ حوالدار کے دعوے کے مطابق شیرو ریکارڈ کی طرح بتنے لگا ”پھر جب سب لوگ سو گئے تو رانا فیاض نے مجھے ساتھ لیا اور ہم دکن پر آ گئے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے اور چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ اتنی خاموشی اور سناٹا تھا کہ ہم گاڑی لے کر گھر سے نکلے تو کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ ہم نے دکن کھولی۔ جمیل اختر کو حسب معمول گھسیٹ کر بوریوں کے نیچے سے باہر نکالا اور گاڑی کی ڈکی میں ڈال کر ریلوے لائن کی جانب روانہ ہو گئے۔ گلیاں سنسن تھیں اور ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ ریلوے لائن کے قریب پہنچ کر ہم نے گاڑی روکی اور جمیل اختر کو ڈکی سے باہر نکل لیا۔ اس وقت جمیل کے جسم میں جنبش دہا ہوئی۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ رانا صاحب نے تشویش ناک نظروں سے مجھے دیکھا اور حکم دیا کہ۔۔۔ پھر میں نے اپنے مالک کے حکم پر خاصی دیر تک پوری قوت سے جمیل اختر کا گھاٹے لکھا اور اس وقت چھوڑا جب وہ ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا۔ پھر ہم اسے ریلوے کی پٹری پر لے کر واپس آ گئے‘ رانا صاحب کا خیال تھا کہ سب یہی سمجھیں گے کہ وہ ٹرین کے حادثے

## بعد از وقت

ایک نرس شناس اور ایمان دار پولیس افسر کی پیشہ ورانہ زندگی میں بعض اوقات ایسے حالات بھی آتے ہیں جب اسے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے پل صراط سے گزرتا پڑتا ہے۔ اس کے لئے یہ کڑی آزمائش کے لمحات ہوتے ہیں۔ اس بات میں دو رائے نہیں ہیں کہ سخت سے سخت ترین اور انتہائی اصول پسند پولیس افسر بھی بہر حال ایک انسان ہوتا ہے۔ بعض مواقع پر چاہے لمحاتی طور پر ہی سہی، وہ عجیب سی کشش کا شکار ہو جاتا ہے اور ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب ملزم اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو یا اسے ملزم سے کوئی جذباتی لگاؤ ہو یا رشوت کی پرکشش پیشکش بھی تفتیش کی راہ میں روک ٹاٹ ہو سکتی ہے یا کسی با اختیار و صاحب اقتدار شخصیت کا ”آرڈر“ نما دباؤ۔ لیکن حقیقی معنوں میں ایک نرس اور دیانت دار پولیس افسران مشکلات کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ اپنے فرض کو جذبات سے منسوب نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کی بجائے اس کے لئے راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں میں ڈالتا ہے۔۔۔ اور ایسے ہر امتحان میں سرخرو ہو جاتا ہے۔

منگل کے روز میں تھانے پہنچا تو معلوم ہوا کہ دھوبی گھاٹ کے پاس کسی کی لاش ملی ہے۔ اطلاع دینے والا ایک غریب صورت دھوبی تھا جو علی الصبح اپنے کام پر نکلا تھا۔ اس نے اپنے گدھے پر میلے کپڑوں کے گنجر۔۔۔ لاد رکھے تھے اور اس کا کتا بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دھوبی گھاٹ سے کوئی پچیس تیس گز پہلے کتے نے اچانک بھونکنا شروع کر دیا پھر اس بہت دوڑ لگا دی جدھر جھڑپیاں تھیں۔ بحالت مجبوری دھوبی کو رکنا پڑا۔ کتا جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر رک گیا پھر اس کے بھونکنے کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دھوبی نے جھاڑیوں کے قریب جا کر دیکھا تو وہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی اس کے بعد دھوبی سیدھا تھانے چلا آیا۔

لاش کی اطلاع ملتے ہی میں نے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ دھوبی کی اطلاع درست تھی۔ جھاڑیوں کے پاس واقعی ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ ایک مردانہ لاش تھی۔ پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس بیس سال لگایا جو بعد میں صحیح ثابت

میں ہلاک ہوا ہے۔

شیرو اقبال جرم کر چکا تھا۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ پیر کے روز میں نے عدالت سے جا کر رانا فیاض احمد کا وارنٹ گرفتاری حاصل کیا اور اسے ایس آئی اے احسن کی زیر نگرانی ایک پولیس پارٹی متعلقہ لاہور کے بڑے کالج روانہ کر دی۔ شام تک رانا فیاض گرفتار ہو کر میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ رانا نوازش علی اس سے پہلے بھی تھانے کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ بیٹے کی گرفتاری کے بعد تو وہ تھانے میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔

اس مرتبہ اس نے مجھے اپنے تعلقات کی دھمکیاں نہیں دیں، نہ ہی میری بیٹی اتروانے کا دعویٰ کیا۔ پوری صورت حال اس پر عیاں ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کمزور پوزیشن سے بھی واقف تھا اور میری سخت گیری سے بھی۔ پھر اس کے تاز و نعم میں پلے ہوئے صاحب زادے نے محض لاٹوں، گھونٹوں اور ٹھانچوں کے طفیل ہی سب کچھ قبول کر لیا تھا اس لئے رانا نوازش علی کوئی ایسی راہ نکالنا چاہتا تھا کہ میں کمزور کیس بناؤں تاکہ اس کے لاڈلے کو کم سے کم سزا ہو۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کرنے کی کوشش کی مگر میں نے نہایت سختی کے ساتھ اس کی پیشکش ٹھکرا دی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں ایک لاکھ کی رقم کوئی معمولی بات نہ تھی۔ آج کل جو مزدور تین، ساڑھے تین ہزار روپے ماہانہ کماتا ہے، اس دور میں اسے پچیس تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

میں نے حقارت سے نوازش علی کو دیکھتے ہوئے کہا ”زانا“ تم ایک ظالم اور غاصب شخص ہو۔ جس معصوم اور یتیم و سیر یتیم کی زمین و جائداد کو تم نے اپنے ہتھکنڈوں سے ہڑپ کر لیا، آج وہ دولت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ تم اپنی دولت و جائداد کو بھی داؤ پر لگانا تو پھر بھی تمہارا بیٹا بیچ نہیں سکے گا، بے گناہ جیل اختر کا خون رنگ لا کر رہے گا۔“ آپ یقین نہیں کریں گے مگر خدا گواہ ہے، اس کے بعد رانا نوازش علی باقاعدہ میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور آنسوؤں سے روتے ہوئے میری منت سماجت کرنے لگا مگر میرے پاؤں استقامت میں ذرا سی بھی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ میں نے رانا فیاض احمد اور اس کے نمک خواہ شیرو کے خلاف قتل عہد کا پرچہ کٹ کر انہیں حوالہ عدالت کر دیا۔

ظلم اور شرک اللہ کے نزدیک انتہائی نا پسندیدہ عمل ہیں۔ ظالموں اور مشرکوں کے لئے اللہ کا درد ناک عذاب ہے۔ اللہ کی رسی اگر دراز ہے تو لامسی بے آواز۔ اس لامسی حرکت میں آنے سے پہلے ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور حسب توفیق عمل بھی کرنا چاہئے۔

ہوا۔ مرنے والے کی عمر آتیس سال تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ شرٹ کا رنگ آسانی تھا۔ اس کے پاؤں میں ہانا کی سینڈل تھی۔ شکل و صورت سے وہ معقول آدمی نظر آتا تھا۔ اس کی وضع قطع سے آسودگی ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرے، کندھے اور سر پر چوڑوں کے نشانات نمایاں نظر آ رہے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ فرش زمین پر چٹ پڑا تھا اور اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔

ظاہر تھا اسے قتل کیا گیا تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، اس نے پہلے مقتول کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ بعد ازاں اس کے سینے میں خنجر گھونپا تھا۔ مقتول کی گردن، چہرے اور سر پر گتے والی ضربات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ”کارنامہ“ کسی کند آلے کی مدد سے سرانجام دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کسی لاشی یا ڈنڈے وغیرہ سے تاہم ان چوڑوں سے خون نہیں نکلا تھا البتہ مقتول کے سینے میں، جہاں خنجر دستے تک گڑا تھا، وہاں سے خاصی مقدار میں خون نکلا تھا جو اس کی شرٹ کو بھگونے کے بعد کچی زمین میں جذب ہو چکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مقتول کو قید حیات سے آزاد ہوئے پانچ چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا، یہ سانحہ رات بارہ بجے کے بعد پیش آیا تھا۔

اب موقع پر دس بارہ افراد جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سب کی موجودگی میں لاش کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اس کی جامہ تلاشی لی۔ مقتول کی جیبوں سے کوئی قابل ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اس بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی۔ مقتول اپنے ظاہری طبع سے ٹھیک ٹھاک نظر آتا تھا مگر اس کے پاس سے نہ تو کوئی نقدی نکلی تھی اور نہ ہی اس کی کلائی پر گھڑی نام کی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر جو اندازہ قائم کیا، وہ یہ تھا کہ وہ بد نصیب کسی چور ایچے یا اٹھائی گیرے کا نشانہ بن گیا تھا۔

میں نے بغور جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سکون ہی سکون نظر آتا تھا، کسی بھی افراطی کے آثار مفقود تھے۔ اس بات نے مجھے ذہنی طور پر الجھا دیا۔ اگر وہ بد نصیب واقعی کسی لیرے کے ستم کا نشانہ بنا تھا تو یقینی طور پر اس نے اپنے ہچاؤ کے لئے مزاحمت تو کی ہو گی لیکن لاش کے آس پاس ایسی علامات نظر نہیں آ رہی تھیں جو اس قسم کے واقعات کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ممکن ہے اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا ہو اور بعد میں یہاں لا کر پھینک دیا گیا ہو لیکن فوری طور پر ایک دوسرے خیال نے پہلے خیال کی تردید کر دی۔ مقتول کے سینے میں ترازو خنجر اور وہاں سے ہونے والا خون

اخراج یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اسی جگہ موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں نے جائے واردات کا تفصیلی نقشہ تیار کیا۔ اس دوران میں سرکاری فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے مقتول کی تصویر بناتا رہا۔ یہ سب کچھ ضابطے کی کارروائی کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک تھنے میں یہ کارروائی مکمل ہوئی تو میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ضلع اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد موقع پر موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا لیکن اس پوچھ گچھ کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ وہاں پر موجود کوئی بھی شخص مقتول سے واقف نہ تھا۔ جس دھوبی نے تھانے میں اطلاع دی تھی، اس کا نام محمد صادق تھا۔ میں نے اس سے بھی کافی سوال کئے۔ وہ بے چارہ جو کچھ جانتا تھا، وہ تھانے میں بیان کر چکا تھا۔ وہ دھوبی گھاٹ سے نزدیک ہی ایک بستی میں رہتا تھا۔

دو کانسیل لاش کے ساتھ اسپتال چلے گئے تھے۔ تین موقع پر موجود تھے۔ میں ان کے ساتھ نزدیکی بستی میں گیا اور مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کی مگر کوئی کارآمد بات معلوم نہ ہو سکی جو تفتیش میں معاون ثابت ہوتی۔ دو گھنٹے کی ددڑ دھوپ کے بعد میں واپس تھانے آ گیا۔ دوسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کیمیکل ایگزامنر کی لیبارٹری رپورٹ بھی منسلک تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتول کی موت کا تعین رات دو اور تین بجے کے درمیان کیا گیا تھا یعنی اس وقت پندرہ اگست کی تاریخ کا آغاز ہو چکا تھا۔ مقتول کے جسم پر ضربات کے چھوٹے بڑے آٹھ نشان پائے گئے تھے۔ تاہم مقتول کی موت سینے میں اترنے والے خنجر کے سبب واقع ہوئی تھی۔ جس کے اجل آفریں پھل نے دل کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ ایک چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ مقتول کی موت بے ہوشی کے عالم میں ہوئی تھی۔ یعنی نزاع کے وقت وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے بھی ہوتی تھی جس کے مطابق مقتول کے معدے میں خواب آور دوا کی آمیزش پائی گئی تھی۔ یہ ایک اہم اطلاع تھی۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت میں اسے کوئی اہمیت دی جاتی تھی۔ اب سب سے اہم مرحلہ مقتول کی شناخت کا تھا۔ اب تک کی پوچھ گچھ سے تو یہی معلوم ہوا تھا کہ کوئی بھی مقتول سے واقف نہیں تھا۔ فوٹو گرافر نے مقتول کی تصویروں کے پرنٹ تیار کر لئے تھے۔ میں نے اپنے تھانے کے چند ہوشیار قسم کے کانسیبلوں کو وہ تصویریں دے کر حکم دیا کہ وہ پورے علاقے میں اس کے بارے میں معلومات اکٹھا کریں۔ ایک تصویر میں نے اپنے پرس میں بھی رکھ لی۔

اس تلاش کا آئندہ دو روز تک جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو میں نے اسپتال کے مرد خانے سے مقتول کی لاش منگوا کر جبینز و تکفین کے لئے ایک مذہبی ادارے کے سپرد کر دی۔ ہم نے سینکڑوں افراد کو مقتول کی تصویریں دکھائیں لیکن کوئی اسے شناخت نہ کر سکا۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مقتول اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ کسی دوسرے شہر سے یہاں آیا تھا۔ اس بات کے پیش نظر میں نے اپنی تفتیش کا رخ اسٹیشن کے نزدیک واقع ہوٹلوں کی جانب موڑ دیا۔ ایسی ہی ایک کوشش کے دوران میں مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دے گئی۔

ریلوے اسٹیشن کی دوسری جانب واقع ایک ہوٹل والے نے مقتول کی تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد پہچان لیا تھا۔ اس وقت میں سادہ لباس میں تھا۔ ہوٹل کے مالک نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا ”کیوں جناب؟ آپ اس بندے کے بارے میں کیا جانا چاہتے ہیں؟“

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا ”میں مقامی تھانے کا انچارج ہوں۔“

”اوہ! تھانے دار صاحب۔“ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”ست بسم اللہ جناب! آئیں آئیں“ تشریف رکھیں۔“ اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا پھر خود بھی کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر میرے پاس آگیا۔

وہ ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا جیسا کہ عام طور پر اسٹیشنوں پر ہوتے ہیں۔ نیچے ایک وسیع ہال تھا جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے یعنی اس ہوٹل میں مسافروں کے قیام و طعام کا مکمل انتظام موجود تھا۔ ہوٹل کے مالک کا نام رفیق باجوہ تھا۔

ہم بیٹھ چکے تو اس نے میرے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ آرڈر دیتا میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا ”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔“

”پھر بھی جناب“ تھوڑی بہت خدمت خدمت کا موقع تو دیں۔“ وہ بڑے انکسار سے بولا ”موسم بہت گرم ہے۔ میں آپ کے لئے دودھ سوڈا بنواتا ہوں۔“

میں نے کہا ”دودھ سوڈا ادھار رہا باجوہ صاحب! اس وقت سب سے بڑی خدمت تو یہ ہوگی کہ آپ مجھے اس شخص کے بارے میں کچھ بتائیں۔“ میں نے مقتول کی تصویر کی جانب

اشارہ کیا ”آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”میں اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ چند روز پہلے یہ میرے ہوٹل میں قیام کر چکا ہے۔“ رفیق باجوہ نے بتایا ”پھر اچانک غائب ہو گیا۔ بغیر کچھ بتائے۔ اس کے اس طرح چلے جانے پر رفاقت علی بھی حیران تھا۔“

”کون رفاقت علی؟“

”اس کا کوئی جاننے والا تھا جناب!“ رفیق باجوہ نے جواب دیا ”منیر حسین نے بتایا تھا کہ اس کا دوست ہے اور یہیں لائل پور (فیصل آباد) میں رہتا ہے۔“

میرے استفسار پر رفیق باجوہ نے اپنی بات کی وضاحت کی ”ملک صاحب“ آپ نے جس بندے کی تصویر مجھے دکھائی ہے، اس کا نام منیر حسین ہے۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے پرتشویس لہجے میں پوچھا ”خیر تو ہے جناب! کیا ہو گیا ہے اس بندے کو؟“

”کسی نے منیر حسین کو قتل کر دیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پاٹ لہجے میں کہا۔

”چچ!؟“ رفیق باجوہ نے افسوس ناک انداز میں سر ہلایا پھر پوچھا ”یہ کب کی بات ہے؟“

میں نے بتایا ”پندرہ اگست کو اس کی لاش دھوبی گھاٹ والی جھاڑیوں کے پاس سے ملی ہے۔ کسی نے اس کے دل میں خنجر گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا ہے۔“

رفیق باجوہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ”بے چارہ.... قسمت کا مارا“ خدا جانے کون تھا!

میں نے رفیق باجوہ سے پوچھا ”منیر حسین آپ کے ہوٹل میں کب آیا تھا؟“

وہ اٹھ کر کاؤنٹر پر گیا پھر وہاں رکھے رجسٹر کے صفحات الٹ پلٹ کرنے کے بعد واپس میرے پاس آیا اور بتایا ”منیر حسین بارہ اگست کی شام کو میرے ہوٹل میں آیا تھا۔“

میں نے کہا ”آپ کے رجسٹر میں یہ بھی درج ہو گا کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور لائل پور میں اسے کیا کام تھا؟“

”.... ملک صاحب، ہم مسافروں سے اتنی تفصیلی باتیں نہیں پوچھتے اور نہ ہی مسافر ایسی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔“ رفیق باجوہ نے بتایا ”یہاں تو مسافروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ روزانہ بیس مسافر آتے ہیں تو پندرہ جاتے ہیں، دس آتے ہیں تو بیس نکلیں چلے جاتے ہیں۔ ہم رجسٹر میں صرف مسافر کا نام اور آنے جانے کی تاریخ درج کرتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

پھر منیر حسین نے تو ایک ہفتے کا کرایہ ایڈوانس دیا تھا۔

میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے“ اسے انیس اگست تک یہاں قیام کرنا تھا!“

”میرا بھی یہی خیال تھا لیکن وہ چودہ اگست کو گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا۔“ رفیق باجوہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”حالانکہ ایسا تو ہوتا ہے کہ مسافر اپنے پروگرام میں تبدیلی کر لیتے ہیں اور مقررہ وقت سے پہلے بھی ہوٹل چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس صورت میں وہ باقاعدہ ہمیں مطلع کرتے ہیں۔ یوں منیر حسین کی طرح اچانک غائب نہیں ہو جاتے۔“

میں نے پوچھا ”باجوہ صاحب“ آپ نے بتایا ہے کہ رفاقت علی نای ایک شخص آپ کے ہوٹل میں مقتول منیر حسین سے ملے آتا تھا اور منیر حسین اسے اپنا دوست بتاتا تھا۔ آپ کو پتا ہے، رفاقت علی یہاں کس جگہ رہتا ہے؟“

”نہیں جناب! مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”رفاقت علی“ آخری مرتبہ یہاں کب آیا تھا؟“

کچھ دیر سوچنے کے بعد رفیق باجوہ نے جواب دیا ”اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب“ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چودہ اگست کو وہ دونوں ایک ساتھ ہی ہوٹل سے نکلے تھے۔ رفاقت علی قریب قریب روز ہی منیر حسین سے ملے آتا تھا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر واپس چلا جاتا تھا۔ منیر حسین جب بھی ہوٹل سے باہر جاتا تو رات دس بجے سے پہلے واپس آ جاتا تھا لیکن چودہ اگست کو وہ واپس نہیں آیا۔ میں نے سوچا، شاید وہ رفاقت علی کے پاس ٹھہر گیا ہو گا لیکن دوسری صبح جب رفاقت علی نے یہاں آ کر منیر حسین کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا کہ وہ گزشتہ رات واپس نہیں آیا تھا۔ اس پر رفاقت علی نے اپنی حیرت کا اظہار کیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا، بے وقوف، پاگل۔“

”اس کے بعد آپ نے رفاقت علی کو نہیں دیکھا۔“

”نہیں جناب!“ اس نے قطعیت سے جواب دیا ”نہ اس ہوٹل میں اور نہ ہی کہیں

کسی گلی یا بازار میں۔“

تفتیش کی راہ میں مجھے روشنی کی جو ننھی سی کرن دکھائی دی تھی، وہ اب معدوم ہو گئی تھی۔ میری پوری توجہ اس وقت رفاقت علی پر گئی ہوئی تھی۔ اگر رفاقت علی کا کوئی سراغ مل جاتا تو حالات کے اسرار سے پردہ اٹھ سکتا تھا مگر رفاقت علی تک کس طرح پہنچا جائے؟ میری سمجھ میں سردست نہیں آ رہا تھا البتہ ایک بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ مقتول منیر حسین اس شہر کا باسی نہیں تھا اور یہ بات بھی قرین قیاس تھی کہ وہ یہاں کسی خاص مقصد

کے لئے آیا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا، الجھتا چلا جا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے رفیق باجوہ سے کہا۔

”میں وہ کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں مقتول منیر حسین ٹھہرا ہوا تھا۔“

اس نے جواب دیا ”ٹھہرس جی“ میں ذرا پتہ کرواتا ہوں۔ اس کمرے کا مسافر اس وقت کمرے میں موجود ہے یا باہر نکلا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا ”کیا وہاں کوئی اور مسافر ٹھہرا ہوا ہے؟“

”ظاہر ہے ملک صاحب! میرا تو یہ روزی کا وسیلہ ہے۔ میں ہوٹل کے کمروں کو خالی تو نہیں رکھ سکتا۔ منیر حسین نہیں، کوئی اور سہی۔“ رفیق باجوہ نے بھاری آواز میں کہا۔ ”ویسے میں اصول کا بہت کھرا ہوں۔ میں نے انیس تاریخ تک کمرہ نمبر تیرہ کسی دوسرے مسافر کو نہیں دیا کیونکہ میں منیر حسین سے ایک ہفتے کا کرایہ وصول کر چکا تھا۔“

میں نے پوچھا ”منیر حسین آپ کو اطلاع دیے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کے سامان کے ساتھ آپ نے کیا کیا؟“

”سامان!“ رفیق باجوہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ”وہ خالی ہاتھ آیا تھا جناب.... اور خالی ہاتھ ہی چلا گیا۔ وہ جتنے دن میرے ہوٹل میں رہا، میں نے اسے ایک ہی پتلون قمیص میں دیکھا تھا۔“

رفیق باجوہ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ کسی بھی مرحلے پر مجھے محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی بات کو چھپانے کی یا حقیقت کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب ایک ہی صورت باقی تھی کہ اگر وہ حقائق کو چھپانے کے لئے کسی داؤ بیچ سے کام لے رہا تھا تو وہ بہت بڑا اداکار تھا ویسے مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ میرے خیال میں موجودہ صورت حال میں مقتول کے کمرے کا جائزہ لینا فضول ہی تھا۔ ہوٹل کے مالک کے بقول، مقتول کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کے بارے میں کوئی کارآمد معلومات حاصل ہو سکتیں۔

میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”باجوہ صاحب“ آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ امید ہے، آپ آئندہ بھی....“

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”میں آپ کا خادم ہوں جناب۔ غریب نواز ہوٹل کو آپ اپنا ہی سمجھیں۔ آپ جس قسم کا تعاون چاہیں گے، میں اس کے لئے شب و روز تیار ہوں۔“



”فی الحال تو آپ بس اتنا کریں۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا ”کہ جیسے ہی رفاقت علی کا کوئی آتا پتا معلوم ہو، فوری طور پر مجھے مطلع کریں۔ مجھے امید ہے کہ..... رفاقت علی، منیر حسین کے قتل کے معے کو حل کرنے کے لئے مفید ثابت ہو گا۔“

”میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں بخوبی سچو گیا ہوں، آپ کیا چاہتے ہیں۔“

میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا ”لیکن اس سلسلے میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ باجوہ صاحب! کسی کو اس معاملے کی ہنک بھی نہیں پڑنا چاہئے اور نہ ہی کسی کو یہ بات معلوم ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں حتیٰ کہ آپ کے عملے کو بھی کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

رفیق باجوہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر بہ عینہ عمل کرے گا۔ میں اس سے ہاتھ ملانے کے بعد ہوٹل سے نکل آیا۔



دوسرے روز دوپہر کے بعد رفیق باجوہ تھانے میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چورہ سال کا ایک ملازم صورت لڑکا بھی تھا۔ میں نے رفیق کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بیٹھنے کے بجائے اپنے ساتھی لڑکے سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں بولا ”جیرے، توں باہر جا کے برآمدے میں بیٹھ۔ جب میں بلاؤں تو اندر آنا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی جیرا نامی لڑکا کمرے سے نکل گیا۔ رفیق باجوہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پرجوش لہجے میں گویا ہوا ”ملک صاحب، ایک بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا ہوں۔“

”کیا رفاقت علی کا کوئی سراغ مل گیا؟“

وہ اندرونی خوشی کو دہاتے ہوئے بولا ”رفاقت علی کو گولی ماریں جناب! میں تو اس سے بھی زیادہ اہم بات آپ کو بتانے آیا ہوں۔“

میں ہمد تن گوش ہو گیا ”کیس، میں سن رہا ہوں۔“

”مجھے پتہ چل گیا ہے، منیر حسین کس چکر میں لائل پور آیا تھا۔“ وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

”کس چکر میں؟“

رفیق باجوہ نے دھیمی آواز میں بتایا ”وہی ازلی چکر ہے جناب..... عورت کا چکر۔“

”بھارت میں نہیں ڈالو رفیق۔ جو جانتے ہو، کھل کر بتاؤ۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”وہی بتا رہا ہوں ملک صاحب۔“ وہ بھی جواب میں سنجیدہ ہو گیا ”منیر حسین، گھنٹہ گھر بازار کی رہائشی ایک عورت کے پیچھے یہاں آیا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوری دلچسپی سے رفیق باجوہ کی بات سننے لگا۔ اس نے واقعی ایک اہم انکشاف کیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ملک صاحب، یہاں گھنٹہ گھر بازار میں فضل کریم بھی ایک شخص رہتا ہے۔ ادھر مین بازار میں اس کی جوتوں کی دکان ہے۔ ”فضل شو“ کے نام سے۔“

”نک پتہ چلا ہے کہ منیر حسین، فضل کریم کی بیوی زاہدہ کے پیچھے یہاں آیا تھا۔“

میں نے سوال کیا ”باجوہ صاحب، آپ کو یہ ساری باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟“

”وہ لڑکا، جسے میں نے باہر بیٹھنے کو کہا ہے، وہ میرے ہوٹل کے باورچی خانے میں کام کرتا ہے۔“ رفیق باجوہ نے بتایا ”اس کا نام نذیر عرف جیرا ہے۔ مقتول منیر حسین نے جیرے کے ہاتھ ایک رقعہ زاہدہ کو بھجوا دیا تھا۔ جیرے نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ دوسرے روز کوئی لک بھگ چار بجے زاہدہ، منیر حسین سے ملنے ہوٹل میں بھی آئی تھی۔ میں اس وقت کسی کام سے گیا ہوا تھا اس لئے میں زاہدہ کو ہوٹل میں داخل ہوتے اور نکلتے دیکھ نہ سکا ورنہ کل ہی آپ کو بتا دیتا۔“

رفیق باجوہ کی فراہم کردہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے جیرا نامی اس لڑکے کو فوری طور پر اندر بلا لیا۔ وہ شاید تھانے میں پہلی مرتبہ آیا تھا اس لئے خاصا سہا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے نرم لہجے میں اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بدستور کھڑا رہا اور کبھی مجھے اور کبھی رفیق باجوہ کو سراہندہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”اوائے تم نے سنا نہیں، ملک صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟“ رفیق باجوہ نے اسے دہکا مارا۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا ”جناب، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں بے قصور ہوں۔“

مجھے اس کی حالت پر رحم آئے لگا، میں نے کہا ”اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو تمہیں گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ اور جو میں پوچھوں، اس کا سیدھا سچا جواب دو۔“

وہ جھجکتا ہوا بیٹھ گیا پھر مرل سی آواز میں بولا ”ہجھیں جی۔“

میں نے پوچھا ”مجھے پتہ چلا ہے کہ کرا نمبر تیرہ کے مسافر نے تمہیں کوئی رقعہ دیا تھا؟“

”جی جناب۔“ وہ دزدیدہ نظروں سے رفیق باجوہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

رفیق نے اسے ڈانٹا ”میری طرف کیا دیکھ رہے ہو، ملک صاحب کو جواب دو۔“

عربی گھات کی جھاڑیوں کے پاس پڑی ملی تھی۔

ان تمام تاریخوں اور دنوں کے حساب کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے جبرے سے سوال کیا ”تم نے بتایا ہے کہ مقتول منیر حسین نے تمہیں اتوار کے دن وہ رقعہ دیا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ اس نے رقعہ دیتے وقت تم سے کیا کہا تھا؟“

ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ رفیق باجوہ کی زبانی جبرے کو معلوم ہو چکا تھا کہ منیر حسین کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بے پناہ خوف زدہ ہونے کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ پولیس کہیں اسے قتل کے الزام ہی میں نہ دھرلے لیکن میری تجربے کا گاہک بتا رہی تھیں کہ جبرے کا قتل کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی تحقیق ضروری تھی۔ بالواسطہ نہ سہی، بلاواسطہ ہی کوئی اہم بات معلوم ہو سکتی تھی۔

جبرے نے جواب دیا ”جناب منیر حسین نے رقعہ دینے سے پہلے مجھ سے ایک اور کام بھی کروایا تھا۔“

”وہ کیا؟“

”اس نے مجھے مین بازار کی ایک دکان کا پتہ سمجھا کر کہا تھا کہ میں وہاں جاؤں اور یہ دیکھ کر آؤں کہ وہاں کوئی چھوٹے قد کا ایسا بندہ موجود ہے جس نے عینک لگا رکھی ہو اور اس کی داڑھی بھی ہو۔“ جبرے نے ایک ہی سانس میں معلومات کا خزانہ اگل دیا۔ میں نے ٹھوس کیا، آہستہ آہستہ اس کا خوف زائل ہو رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”منیر حسین نے مجھے جس دکان پر بھیجا تھا وہ جو توں کی دکان ہے۔ فضل شوز۔“

وہ رکا تو میں نے سوال کیا ”پھر کیا ہوا؟“

”منیر حسین نے جس شخص کو دیکھنے مجھے بھیجا تھا، وہ واقعی دکان میں موجود تھا۔ میں نے مدتی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ دکان کا مالک تھا کیونکہ وہ وہاں موجود گاہکوں سے جو توں کی رقم لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈال رہا تھا۔ میں نے واپس آ کر منیر حسین کو رپورٹ دی۔ اس کے بعد ہی اس نے مجھے گھنٹہ گھر بازار کے ایک مکان کا پتہ بتایا اور ہدایت کی کہ میں وہ رقعہ زاہدہ نامی عورت کے ہاتھ میں دے کر فوری طور پر واپس آ جاؤں۔“

میں نے پوچھا ”کیا تمہیں معلوم ہے، اس رقعے میں کیا لکھا ہوا تھا؟“

یہ سوال میں نے ضمنی طور پر کیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”جناب! وہ رقعہ ایک لفافے میں بند تھا۔ اگر بند نہ بھی ہوتا تو میں یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہوا تھا کیونکہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔۔۔ مجھے بس سو تک تنہی آتی ہے یا پھر کیزوں کوڑوں کی شکل میں اپنا

”جناب! مجھے تھانے دار صاحب سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ان کی مونچھیں بہت خطرناک ہیں اور وہ مجھے گھور کر بھی دیکھ رہے ہیں۔“ جبرے نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے خوف کا اظہار کیا۔

رفیق نے سخت لہجے میں کہا ”اُسے کھوتے دے پڑ، جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رقعے والی پوری بات ملک صاحب کو بتاؤ۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

”اچھا جی جاتا ہوں۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مگر نمبر تیرہ کے مسافر نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا اور گھنٹہ گھر کا ایک پتہ بھی سمجھایا تھا پھر مجھے وہ رقعہ پہنچانے کے لئے دس روپے کا ایک نوٹ بھی دیا تھا۔ کام بہت آسان تھا اس لئے میں نے فوری طور پر حامی بھری اور وہ رقعہ اس پتے پر پہنچا دیا۔“

مقتول نے ایک معمولی رقعے کی ترسیل کے لئے بچے کو رشوت دی تھی۔ اس سے اس رقعے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ دس روپے کو قارئین معمولی رقم نہ سمجھیں۔ یہ جس زمانے کا ذکر ہے، اس دور میں دس روپے اچھی خاصی رقم شمار ہوتی تھی۔ اس وقت ایک عام مزدور کو آٹھ آنے دہائی ملتی تھی اور ایک کلرک کی تنخواہ پچاس ساٹھ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بظاہر ایک معمولی اور بے ضرر سے کام کے لئے جبرے کو اتنے پیسے مل گئے تھے جو کم و بیش ہوٹل کی پندرہ دن کی تنخواہ کے برابر تھے۔

میں نے نذیر عرف جبرے سے پوچھا ”منیر حسین نے تمہیں وہ رقعہ کب دیا تھا؟“

”اپنے آنے کے دوسرے دن جناب!“ جبرے نے بتایا ”مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس دن اتوار تھا۔“

رفیق باجوہ نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول منیر حسین اس کے ہوٹل میں بارہ اگست کی شام کو وارد ہوا تھا یعنی ہفتے کے روز۔ جبرے کے بیان کے مطابق اس نے رقعہ اتوار یعنی تیرہ اگست کو زاہدہ نامی کسی عورت کو پہنچایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے رفیق ہی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بقول جبرے، اس سے اگلے روز کم و بیش چار بجے زاہدہ ہوٹل میں منیر حسین سے ملنے بھی آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے، وہ چودہ اگست بروز پیر ہوٹل میں آئی تھی۔ جب کہ ہر ہوٹل غریب نواز گیا تھا تو رفیق باجوہ نے پورے یقین سے بتایا تھا کہ چودہ اگست کی شام منیر حسین اور اس کا دوست رفاقت علی ایک ساتھ ہوٹل سے نکلے تھے جس کے بعد منیر جبرے کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس کے دوسرے دن یعنی منگل پندرہ اگست کو اس کی لاش

نام لکھ لیتا ہوں۔“

”تم نے زاہدہ نامی اس عورت کو رقعہ دیا تو یہ بتایا تھا کہ وہ رقعہ کس نے بھیجا تھا؟“  
جیرے نے نفی میں سر ہلایا ”نہیں جناب“ منیر حسین نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس عورت سے کوئی بات نہ کروں۔ بس رقعہ اس کے ہاتھ میں رکھ کر واپس لوٹ آؤں۔“  
”اور تم نے ایسا ہی کیا؟“

”جی!“

لفظ ”جی“ اس کے منہ سے اس طرح خارج ہوا تھا جیسے وہ میرے جملے کا مفہوم نہ سمجھ پایا ہو۔ رفیق باجوہ نے کہا ”ملک صاحب“ میں نے اپنے طور پر جو معلومات اکٹھا کی ہیں ان کے مطابق زاہدہ نامی وہ عورت فضل شوز والے پست قامت مولوی فضل کریم کی بیوی ہے۔ گھنٹہ گھر بازار میں ان کا پختہ مکان ہے اور ان کے تین بچے بھی ہیں۔“  
”بہت خوب!“ میں نے سرائے والے انداز میں کہا ”باجوہ صاحب“ آپ غلط فیلڈ میں چلے گئے ہیں۔ آپ کو تو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہئے۔ کھوج کا کام بہت اچھا کر لیتے ہیں آپ۔“

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا پھر بولا ”اب میرے لئے کیا حکم ہے جناب؟“  
میں نے کہا ”آپ مجھے فضل کریم کے گھر کا پتہ بتادیں یا پھر راہ نمائی کے لئے جیرے کو یہاں چھوڑ جائیں۔ اب آپ کا کام ختم اور میرا کام شروع ہو گا۔“  
”میری غیر موجودگی میں تو یہ بے چارہ خوف سے ہی کانپتا رہے گا ملک صاحب۔“ رفیق باجوہ نے جیرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں آپ کو فضل کریم کی دکان اور مکان دونوں کا پتہ بالتفصیل لکھ کر دے دیتا ہوں۔ جیرے کو آپ جانے ہی دیں تو اچھا ہے۔“  
میں نے جیرے کو جانے کی اجازت دے دی۔ رفیق باجوہ نے دونوں بچے ایک کاندھ پر لکھ کر مجھے دیئے۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے اس کی یاد دہانی کے لئے کہا ”رفاعت علی کو بھول نہیں جانا۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے جناب۔ آپ فکر نہ کریں۔“

رفیق باجوہ کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی سکندر علی کو ساتھ لیا اور فضل کریم کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ فضل کریم کی دکان پر جاؤں لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ فضل کریم کی غیر موجودگی میں زاہدہ کو گھیرنا زیادہ مناسب تھا۔

جب ہم مطلوبہ مکان پر پہنچے تو دن کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے اور ابھی دھوپ اپنے جوں پر تھی۔ میری دستک کے جواب میں ایک بچہ دروازے پر آیا۔ اس نے دروازے کا ایک پت کھول کر باہر جھانکا۔ وہ چھ سات سال کا ایک معصوم بچہ تھا۔ میری وردی پر نظر پڑتے ہی وہ تیز آواز میں چلایا ”امی! امی! پولیس آئی ہے۔“ اس کے بعد وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

”میں سوچ میں پڑ گیا“ کہیں کوئی گڑبڑ نہ.... ہو جائے۔ سکندر علی نے میری تشویش کو محسوس کرتے ہوئے کہا ”ملک صاحب“ ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہمیں یہاں سادہ لباس میں آنا ہائے تھا۔“  
”غلطی تو واقعی ہوئی ہے۔“ میں نے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ”اب اس غلطی کو بھٹانا پڑے گا۔“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ دروازے کی اوٹ میں مجھے کسی کی آمد محسوس ہوئی پھر ایک مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”کیا بات ہے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟“  
وہ یقینی طور پر زاہدہ ہی ہو سکتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں ایک ہی عورت کا وجود پایا جاتا تھا۔ اس کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت تھی۔ وہ بچہ جو ہمیں دیکھ کر چلاتا ہوا اندر بھاگا تھا اس وقت بھی دروازے کا پت تھامے کھڑا تھا شاید ماں کی موجودگی میں اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

میں نے ہنسنے لگا صاف کیا پھر کہا ”فضل کریم کا گھر یہی ہے؟“  
”جی یہی گھر ہے لیکن وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“ اس نے شائستہ لہجے میں جواب دیا ”لوہر مین بازار میں ان کی دکان....“  
”ہمیں فضل کریم سے نہیں بلکہ تم سے کام ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”یقینی طور پر زاہدہ ہو، فضل کریم کی بیوی!“  
اس نے ایک لمحے کے وقفے سے جواب دیا ”آپ کا اندازہ درست ہے لیکن مجھ سے پوچھو کیا کام ہے؟“

”وہ اتنا ضروری کام ہے کہ گلی میں کھڑے کھڑے بتایا نہیں جا سکتا۔“ میں نے پراسرار لہجے میں کہا ”کیا گھر میں بیٹھے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟“  
”دیکھیں“ میں فضل کریم کی غیر موجودگی میں آپ کو گھر کے اندر نہیں بلا سکتی۔“ وہ جز بہ جز کہہ کر بولی ”آپ ایسا کریں کہ مغرب کے بعد آ جائیں۔ جب تک فضل کریم بھی آ جائیں

نہیں جانتی۔“

”ابھی جان لو گی۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”چودہ اگست کو سہ پہر چار بجے تم اپنی غریب نواز کے کمرانمبر تیرہ میں کیا کرنے گئی تھیں؟“

”ہوش غریب نواز... کمرانمبر تیرہ... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ زاہدہ نے آداری سے کہا پھر پوچھا ”آپ تو مجھے کسی پیارے کی موت کی خبر سنائے آئے تھے۔ اب اپنی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔“

میں نے ساٹ آواز میں کہا ”منیر حسین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے بجائے الجھن آمیز تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں بھی الجھن نمایاں تھی ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ بار بار کس منیر حسین کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں کسی منیر حسین کو نہیں جانتی۔ یقینی طور پر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی بی بی بلکہ ہم تمہاری غلط فہمی دور کرنے آئے ہیں۔“ سکندر علی نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ”ملک صاحب کی باتوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ ہم تمہیں تھانے لے جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

تھانے کے ذکر پر وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے بولی ”میں نے کیا جرم کیا ہے۔ آپ مجھے خواہ مخواہ تھانے کیوں لے جائیں گے؟“

”جرم تو تھانے چل کر معلوم ہو گا بی بی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”ابھی تو تم یہ ہاؤک منیر حسین تم سے کس سلسلے میں ملنے آیا تھا؟“

اس دوران میں زاہدہ کے تینوں بچے بھی وہاں آ گئے تھے۔ جن کی عمریں علی الترتیب چھ، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ ان کے نام مجھے بعد میں معلوم ہوئے۔ بڑے بیٹے کا نام طارق محمود، اس سے چھوٹے کا نام عارف محمود اور سب سے چھوٹی بچی کا نام عابدہ پروین تھا۔ وہ تینوں ککر ککر کبھی ہمیں اور کبھی اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ زاہدہ کے لئے کھڑے رہنا لگن نہیں رہا تھا اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

میں نے کہا ”بی بی، تم جتنی دیر کرو گی، تمہاری مصیبت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اگر تمہارا شوہر آگیا تو پھر تمہارا راز، راز نہیں رہے گا۔ تمہاری ازدواجی زندگی داؤ پر لگ جائے

گے۔“

میں نے کہا ”جو بات تم سے کرنے آیا ہوں، فضل کریم کی موجودگی میں اس کا تذکرہ مناسب نہیں رہے گا۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ اس کے سوال میں تشویش پنہاں تھی۔

”میں ایک انتہائی اہم اطلاع تمہیں دینے آیا ہوں۔“

”کیسی اطلاع؟“

میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”وہ اطلاع تمہارے کسی پیارے کی موت سے متعلق ہے۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ اس کی منہ سے بے ساختہ نکل گیا پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے حسین و جمیل زاہدہ کھڑی تھی۔ وہ پرکشش چہرے کی مالک ایک بھرپور عورت تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی خیمہ زن تھی۔ اس نے لکنت آمیز آواز میں کہا ”میں... آپ کے لئے... بیٹھک کھولتی... ہوں۔“

دوسرے ہی لمحے ہم فضل کریم کی سچی سچائی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اور سکندر علی ایک صوفے پر بیٹھے تھے جب کہ زاہدہ ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے غم ناک آواز میں سوال کیا ”آپ کون سی بری خبر سنائے آئے ہیں جو فضل کریم کے سامنے نہیں سنائی جاسکتی؟“

”اطمینان سے بیٹھ جاؤ بی بی۔“ میں نے نرمی سے کہا ”اس خبر کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔ فضل کریم کا لالہ علم رہنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولی، ہر اس نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا ”چودہ اگست بروز پیر سہ پہر چار بجے تم کہاں تھیں؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ منتناقی ہوئی آواز میں بولی ”میں بیٹھ تھی... میرا مطلب ہے، میں گھر میں ہی تھی۔“

اس کے لہجے کے کھوکھلے پن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میں نے سخت انداز میں کہا ”تم جھوٹ بول کر خود کو بہت بڑی مصیبت میں پھنسا لو گی بی بی۔“

”میں نے کیا جھوٹ بولا ہے؟“ وہ مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”منیر حسین سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”منیر حسین!“ اس نے منہ کو بگاڑ کر عجیب سے لہجے میں کہا ”میں کسی منیر حسین کو

گی۔

وہ زچ ہو کر بولی ”میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کچھ نہیں کیا جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ فضل کریم مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ میں آپ سے ایک بار پھر کہوں گی، آپ کو کسی نے مس گائیڈ کیا ہے۔ میں کسی منیر حسین کو نہیں جانتی اور نہ ہی اس نام کے کسی شخص سے میرا کوئی تعلق ہے۔“

ایک لمحے کے لئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ زاہدہ کا احتجاج خاصا مضبوط تھا۔ میں نے بات کو سمجھا کر دوسرے انداز میں سوال کیا ”چلو مان لیا کہ تم منیر حسین سے واقف نہیں ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے میں یہ بات بھی تسلیم کر لیتا ہوں کہ فضل کریم تم پر بہت بھروسہ کرتا ہے۔ تم اس کی نظروں سے گرنے والا کوئی کام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ چودہ اگست کو غریب نواز ہوٹل کے کمرہ نمبر تیرہ میں تم اس شخص سے ملاقات کرنے کیوں مگنی تھیں؟“ اپنی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی میں نے جیب سے مقتل منیر حسین کی تصویر نکال کر زاہدہ کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔

اس نے نظر بھر کر تصویر کو دیکھا پھر بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا ”نصیر احمد... کیا ہوا اسے؟“

میں نے اور سکندر علی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نئے انکشاف نے ہمیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔ میں نے زاہدہ سے پوچھا ”تم اس شخص کو جانتی ہو؟“

”ہاں، اس کا نام نصیر احمد ہے۔“ زاہدہ نے جواب دیا ”لیکن آپ بتاتے کیوں نہیں اسے آخر ہوا کیا ہے؟“

میں نے انفس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”بی بی.... یہ تصویر مقتل منیر حسین کی ہے جسے چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب کسی نے قتل کر کے دھوبی گھاٹ والی جھالڑیوں کے پاس پھینک دیا تھا۔ ہم اسی قتل کے سلسلے میں تفتیش کر رہے ہیں۔“

اچانک زاہدہ کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ نجیف سی آواز میں بولی ”مگر میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟“

”تم وہ ہستی ہو جو چودہ اگست کی سہ پہر میں مقتل سے ہوٹل کے کمرے میں لی تھیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ”اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے ایک روز قبل مقتل نے تمہارے نام ایک دستی رقعہ بھیجا تھا۔ ہمارے پاس واقعاتی شادتیں اور پیام بر بھی موجود ہے۔ اگر تم نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی

کوشش کی تو تمہیں پھانسی کے پھندے سے لونی نہیں بچا سکے گا۔“

اچانک اس نے رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے وہ ایک ہی بات کی تکرار کئے جا رہی تھی۔ ”میں بے گناہ ہوں۔ میں نے نصیر کو قتل نہیں کیا۔ میرا تو خیال تھا وہ واپس لاہور چلا گیا ہو گا۔ میں کچھ نہیں جانتی اس کے ساتھ کیا ہوا۔“

ماں کی دیکھا دیکھی بچوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔ وہ بیٹھک دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن گئی۔ سکندر علی اس صورت حال سے بوکھلا گیا لیکن میں جانتا تھا کہ لوہا گرم ہو چکا تھا اس وقت چوٹ لگانا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے بہ آہستگی زاہدہ کو پکارا پھر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”دیکھو بی بی، اگر تم قانون کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو جاؤ تو میں تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ گلوگیر آواز میں بولی ”میں نے کوئی تصور نہیں کیا تھا نے وار صاحب۔ خدا گواہ ہے نصیر احمد کی موت سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔“

میں نے پکارنے والے انداز میں کہا ”اگر تم واقعی بے گناہ ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا بل بھی بیک نہیں ہو گا۔ تم سب کچھ مجھے سچ بتا دو۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اور مجھے کچھ بتانے سے پہلے تم ایک ضروری کام یہ کرو کہ خود کو سنبھالو۔ تمہاری حالت دیکھ کر بچے پریشان ہو رہے ہیں۔“

میری تسلی بخشی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے رونا بند کر دیا پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بچوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں زاہدہ سے کوئی سوال پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اپنی دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ وقت پانچ بجے کے قریب تھا۔ ابھی فضل کریم کے آنے میں قریب قریب دو گھنٹے باقی تھے۔ زاہدہ نے بتایا تھا کہ وہ مغرب کے وقت دکان بند کر کے گھر آتا تھا۔

”میں جا کر دیکھتی ہوں۔“ زاہدہ یہ کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ پھر دروازے پر کسی عورت کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ زاہدہ سے پوچھ رہی تھی ”خیر تو ہے زاہدہ۔ سنا ہے تمہارے گھر پولیس آئی تھی۔“

”وہ کسی کا پتہ پوچھ رہے تھے۔“ زاہدہ نے فوری طور پر بات بنا دی ”میں نے کہہ دیا ہمیں کچھ معلوم نہیں۔“

بچے میں کہا ”البتہ اس بات کی تم تسلی رکھو کہ اگر تم واقعی بے قصور ثابت ہوئیں تو میں تمہاری اس خواہش کا ضرور احترام کروں گا۔“  
اس نے پر امید نظروں سے مجھے دیکھا اور روہانی آواز میں کہا ”خدا کی قسم“ میں بے گناہ ہوں۔“

”اس کا فیصلہ میں تمہاری کہانی سننے کے بعد کروں گا۔“ وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔ تیری یقین دہانی پر اس نے تمام حالات تفصیل کے ساتھ مجھے بتا دیئے۔ میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو اور آپ اس کیس کو پوری طرح سمجھ سکیں۔



نصیر احمد لاہور کے علاقے بھائی گیٹ کا وٹیک تھا۔ زاہدہ کا میکا بھی بھائی ہی تھا بلکہ یہ دونوں خاندان ایک ہی گلی میں آباد تھے۔ زاہدہ کے والد سارے تھے اور خود کو بڑے اعلیٰ خاندان کا تصور کرتے تھے جب کہ نصیر احمد کا باپ منظور احمد موچی تھا۔ اپنے محلے ہی میں اس کی چھوٹی سی دکان تھی جہاں وہ دن بھر بیٹھا لوگوں کے جوتے کا ڈھنسا رہتا۔ زاہدہ اور نصیر کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ نصیر، زاہدہ سے دو سال بڑا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد نصیر نے تعلیم کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا اور ایک دفتر میں کلرک کر رہا تھا جب کہ زاہدہ نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا تھا۔

نصیر احمد اول روز ہی سے زاہدہ کو پسند کرتا تھا مگر زاہدہ نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی البتہ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ نصیر احمد اسے چاہت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دونوں خاندان چونکہ ایک ہی گلی میں تھے اس لئے دن میں کئی بار زاہدہ اور نصیر کا آمنہ سامنا ہو جاتا تھا۔ پھر ایک دوسرے کے گھر کی باتیں بھی ایک دوسرے کے گھر میں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں گھروں کے بزرگوں میں نہ تو بہت گہرا میل ملاپ تھا اور نہ ہی کوئی رنجش۔

نصیر اپنی محبت میں ثابت قدم رہا لیکن زاہدہ اسے مستقل نظر انداز کرتی رہی۔ نصیر کی ایک بات البتہ زاہدہ کو اچھی لگی تھی کہ اس نے کبھی عام عاشقوں کی طرح کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے اسے کسی الجھن یا کوفت کا سامنا ہوتا اور اس کا گھر سے لٹکانا دو بھر ہو جاتا۔ جب بھی ان کا سامنا ہوتا، نصیر انتہائی شائستگی سے اس سے ملتا اور بہت ہی مہذب الفاظ میں اسے اپنی چاہت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا۔

زاہدہ کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اس کے والد مشتاق حسین کی سخت گیری تھی۔ وہ

”کس کا پوچھ رہے تھے؟“  
”حنیف چٹائی کا۔“ زاہدہ نے بروقت ایک نام تخلیق کیا۔ میں اس کی فکارتی کو مان گیا۔

اس عورت نے جواب دیا ”یہ نام تو میں نے بھی پہلی مرتبہ سنا ہے۔ میرے خیال میں ہماری گلی میں تو اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا!“  
”میرا بھی یہی خیال ہے رحمت خالہ۔“ زاہدہ نے کہا۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس بیٹھک میں آگئی۔

میں نے کہا ”تم تو خاصی ذہین اور حاضر جواب عورت ہو۔“  
اس نے اپنی تعریف سن کر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور جگت سے بولی ”تھانے دار صاحب“ آپ کو جو پوچھنا ہے، جلدی جلدی پوچھ لیں۔ کوئی آگیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ ابھی تو میں نے رحمت خالہ کو ٹال دیا ہے۔ اگر فضل کریم کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ لوگوں کو اس کی غیر حاضری میں گھر کے اندر بٹھایا تھا تو مجھے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ اپنا کام نمٹا کر جلدی سے چلے جائیں۔“

اس کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی ترس آگیا۔ تینوں بچے اس کے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ خاموش تھے لیکن ان کی آنکھوں میں اک ان جانا خوف ہلکورے لے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ اچانک پھٹ پڑیں گے۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے زاہدہ سے سوال کیا۔ ابھی یہ بات تو ثابت ہونا باقی تھی کہ مقتول کا اصل نام کیا تھا۔ اس نے ہوٹل غریب نواز میں منیر حسین کے نام سے کمرابک کروایا تھا جبکہ زاہدہ نے اسے نصیر احمد کے حوالے سے شناخت کیا تھا۔ اصل بات کا علم زاہدہ کی روداد سننے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے زاہدہ سے پوچھا ”تم منیر حسین..... میرا مطلب ہے، نصیر احمد سے ملنے ہوٹل کیوں گئی تھیں؟“

”اس نے رقعے میں بات ہی ایسی لکھ دی تھی کہ میں مجبور ہو گئی۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا ”کیا بات لکھ دی تھی اس نے؟“  
وہ منت آمیز لہجے میں بولی ”پہلے آپ وعدہ کریں، اس کیس کے سلسلے میں کہیں بھی میرا نام نہیں آئے گا۔“

”میں ایسا کوئی وعدہ قبل از وقت نہیں کر سکتا بی بی۔“ میں نے خالص تھانے دارانہ

”تم اپنے تئیں جو چاہو سمجھ لو مگر میں نے تمہیں اپنی مجبوری بتا دی ہے۔“  
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نصیر نے کہا ”دیکھو زاہدہ“ ہم نے ایک ہی محلے کی ایک ہی گلی میں آنکھ کھولی ہے۔ ایک ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ کھیلا ہے۔ میری شخصیت کا کوئی پہلو تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تم میری ہر خوبی و خالی سے اچھی طرح واقف ہو اور یہ بھی بخوبی جانتی ہو کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ پھر تمہارا گریز میری سمجھ سے باہر ہے۔ اور ہاں، یہ بات ذہن سے نکال دو کہ میں تمہاری کیفیت سے واقف نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو تو کم از کم نفرت بھی نہیں کرتی ہو۔ مجھے تمہاری محبت، چاہت اور لگاؤ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ محبت اور چاہت کے لئے میں جو ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ پوری زندگی میں تمہاری پوجا کروں گا۔ تم میری محبت ہو، میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو۔ میں تمہارے حصول کی خاطر پوری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہوں۔“

”بات پوری دنیا سے ٹکرانے کی نہیں ہے نصیر۔“ زاہدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اپنی شان میں نصیر کا اظہار محبت سن کر خوشی سے نہال ہو گئی تھی، لیکن اس نے اپنے دلی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور متحمل انداز میں بات کر رہی تھی ”اس دنیا کو ہمارے معاملات سے کیا مطلب لیکن میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ابو کی وجہ سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ میں ان کے غصے سے پوری طرح واقف ہوں۔“

”میں پھر اپنے سوال کو دہراؤں گا زاہدہ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا ”اگر تمہارے ابو کی مجبوری آڑے نہ آئے تو کیا تم میری بے نیازی کو تیار ہو؟“

زاہدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جسم کی ایک ایک جنبش سے اس کا اندرونی اضطراب جھلک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کشمکش کا شکار ہو۔ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہنے کی ہمت اپنے اندر نہ پا رہی ہو۔ نصیر خاصی دیر تک اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے سوال کیا۔

”زاہدہ، کیا میں تمہاری خاموشی کو انکار سمجھ لوں؟“

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ”نصیر، میں اپنے ابو کا بہت احترام کرتی ہوں۔“

”اور تمہارے ابو کی خوشنودی کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ نصیر نے نیم طنزیہ لہجے میں پوچھا ”ان کے دل میں جگہ بنانے کے لئے مجھے کون سا پہاڑ کاٹنا ہو گا۔“

زاہدہ نے شکستہ لہجے میں کہا ”نصیر، تم میرے ابو کو نہیں جانتے ہو۔ وہ اپنے برابر کے یا

اپنے والد سے بہت ڈرتی تھی کیونکہ وہ ذرا ذرا سی بات پر طوفان کھڑا کر دیتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زاہدہ کے دل میں بھی نصیر کی محبت نے جڑ پکڑنا شروع کر دی لیکن اس نے کبھی نصیر کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ دونوں خاندان کبھی ایک نہ ہو سکیں گے۔ مشتاق حسین اس کے لئے ایک موچی کے بیٹے کا رشتہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ نصیر کو اپنی کم مائیگی کا احساس تو تھا مگر وہ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر دفتری باپو تو بن گیا تھا مگر اس کا کیا کرتا کہ وہ بہر حال ایک موچی کا بیٹا تھا جبکہ زاہدہ کا والد مشتاق حسب و نسب کا بڑا چرچا کرتا تھا۔ وہ ذات کا بھی تھا اور کاروبار کے لحاظ سے بھی خاصا مضبوط تھا۔ زاہدہ کے دل میں نصیر کے لئے اگر تھوڑی بہت محبت جاگی بھی تھی تو وہ اپنے والد کے خوف سے دب گئی تھی مگر دوسری جانب نصیر کا حال ہر گزرتے دن کے ساتھ بے حال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہر قیمت پر زاہدہ کو حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

ایک روز زاہدہ کالج سے واپس آ رہی تھی کہ نصیر نے اس سے راستے میں ملاقات کی ”زاہدہ!“ زاہدہ کے رک جانے پر اس نے کہا ”کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ زاہدہ نے جواب دیا۔

نصیر نے احتجاجی لہجے میں کہا ”پھر تم مجھ سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہو۔ کیا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“

”کوئی شکایت نہیں ہے۔“ زاہدہ نے مختصر سا جواب دیا۔

”تمہارا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“ نصیر نے شکایتی لہجے میں کہا ”تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں مگر تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکتا۔“

زاہدہ نے تحمل سے جواب دیا ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ دراصل میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے مجبور ہوں۔ اگر ابو کو پتہ چل گیا تو وہ میری چڑی ادھیڑ دیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے، اگر گھر والوں کی مجبوری نہ ہو تو تم مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ جڑ بڑ ہو کر رہ گئی ”نصیر، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔“

”کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے؟“ نصیر نے پوچھا۔

کوئی نقصان پہنچ جائے، یہ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔“  
زاہدہ نے پریشان لہجے میں پوچھا ”پھر بھی تمہارے ذہن میں کیا ہے، کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟“

”میں نے کہا نا، فی الحال میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا ”تمہیں رفتہ رفتہ خود بخود سب پتہ چل جائے گا۔ بس تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظروں سے زاہدہ کو دیکھنے لگا۔

”میں سمجھی نہیں، تم مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتے ہو؟“  
”اس بات کا وعدہ کہ جب تک میں تمہاری حیثیت کا نہیں ہو جاتا، تم کسی اور سے شادی نہیں کرو گی۔“

وہ پلکیں جھپکا کر بولی ”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔“  
”اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو زاہدہ۔“ نصیر نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”میں نے ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولی ”پتہ نہیں تم کیسی ابھی ابھی باتیں کر رہے ہو!“

”جو باتیں تمہیں اس وقت ابھی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں، آنے والے دنوں میں وہ سلجھ جائیں گی۔ ہر چیز روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔“ اچانک اس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا ”میں تمہارے ابو کی نظروں میں وہ مقام حاصل کر لوں گا کہ پھر انہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میری معاشرتی حیثیت کے پیش نظر کسی میں اتنی جرات نہیں ہو گی کہ وہ مجھے موچی کی اولاد کہہ کر پکار سکے۔ میں خود کو بدل کر رکھ دوں گا۔ بس تم مجھے دو سال کی مہلت دے دو۔ صرف دو سال زاہدہ۔“

وہ نتیجی نظروں سے زاہدہ کو دیکھنے لگا۔ زاہدہ نے پوچھا۔ ”تم ان دو سالوں میں کیا کرو گے؟“

”مت پوچھو۔۔۔۔۔ قبل از وقت مت پوچھو زاہدہ!“ جذبات کی شدت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی ”بس تم مجھ سے وعدہ کرو۔۔۔۔۔ پہلا اور آخری وعدہ۔۔۔۔۔ تم دو سال تک میرا انتظار کرو گی۔ میں دو سال بعد تمہیں اپنی دلہن بتا لوں گا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔“  
”تم کہیں جا رہے ہو؟“

وہ قطعیت سے بولا ”ہاں، میں بیرون ملک جاؤں گا۔ شب و روز محنت کروں گا۔ اپنے

اس سے بڑے خاندان میں میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ کبھی بھی اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ میری شادی۔۔۔۔۔“

”کسی پھینچ کرک سے ہو۔“ نصیر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”اور ایسا پھینچ کرک جو ایک موچی کا بیٹا بھی ہو؟“

زاہدہ نے زخمی نظروں سے نصیر کو دیکھا ”تم میری نیت پر شک نہ کرو نصیر۔ میں نے تمہیں حقیقت سے آگاہ کیا ہے۔“

”اور حقیقت بدل نہیں سکتی۔“ نصیر نے طنزیہ انداز میں کہا ”میں ایک موچی کی اولاد ہوں، لوگ مجھے موچی ہی کہیں گے چاہے میں پڑھ لکھ کر یا ترقی کرتے ہوئے کتنا بڑا آدمی بھی کیوں نہ بن جاؤں۔ تمہارا مطلب یہی ہی نا؟“

زاہدہ نے مصالحت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”دیکھو نصیر، میں خاندانی اونچ نیچ کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ سب انسان میری نظر میں برابر ہیں۔ کوئی پیشہ بھی کم تر نہیں ہے۔ انسان کی بڑائی کو اس کے کردار اور اعمال کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔“

”تم نے اپنے یہ روشن خیالات کبھی اپنے ابو کو بھی بتانے کی کوشش کی ہے؟“  
”پلیز طنز نہ کرو نصیر۔“ زاہدہ کا انداز گھٹکیانے والا تھا۔ ”میں لڑکی ہوں۔ اپنے ابو کے

سامنے مجبور ہوں۔ ان کے فیصلوں کے سامنے دم نہیں مار سکتی۔ ہمارے گھر میں ایک پتہ بھی ابو کی مرضی کے بغیر نہیں مل سکتا اور میں جانتی ہوں کہ وہ تم سے میری شادی کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔“

نصیر نے دو ٹوک لہجے میں کہا ”اور۔۔۔۔۔ اگر میں انہیں تیار کر لوں تو؟“  
”مگر کیسے؟“ زاہدہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ میں تمہیں ابھی نہیں بتاؤں گا۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پر خیال انداز میں بولا۔

”تم کیا کرنا چاہتے ہو نصیر؟“ زاہدہ پریشان ہو گئی۔  
وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں بولا ”میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے نصیر۔“ زاہدہ نے ہراساں نظروں سے اسے دیکھا ”تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ پل رہا ہے۔ میں ابو سے بہت محبت کرتی ہوں۔ خدا نخواستہ کہیں انہیں۔۔۔۔۔“  
”انہیں کچھ بھی نہیں ہو گا زاہدہ۔ وہ میرے مستقبل میں سر بننے والے ہیں۔ انہیں



کر جزل اسٹور کھول لیا۔ منظور احمد اس بات کے لئے بمشکل تیار ہوا تھا۔ نصیر اس کی انگوٹھی دلا دیا تھا۔ وہ اس کی خواہش کو رد نہ کر سکا۔ پھر پتہ چلا کہ نصیر ایران سے ترکی چلا گیا ہے اور اس کی ترقی بھی ہو گئی ہے۔ ڈرافٹ کی رقم بروقت مئی حتیٰ کہ ایک سال کے اندر ہی منظور احمد نے پختہ مکان بھی تعمیر کروا لیا۔ اگلے سال خبر آئی کہ نصیر احمد یونان پہنچ گیا ہے اور اس کی تنخواہ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس پر وہ اور ٹائم بھی کر رہا تھا۔ نصیر کو بیرون ملک نئے ڈیزل سال ہوا تھا کہ منظور احمد کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ اب وہ منظور موچی نہیں بلکہ معاشرے کا ایک باعزت فرد بن چکا تھا۔ اس کا جزل اسٹور دن دینی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

اس دوران میں زاہدہ کے رشتے آتے رہے اور وہ نصیر سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق اپنی تعلیم کا عذر پیش کر کے اس سلسلے کو باقی رہی۔ اس نے اپنے والد سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ گریجویشن نہ کر لے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی کہ نصیر احمد کی معاشرتی حیثیت اور رتبہ بڑی تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔ نصیر کی اس ان تھک کوشش نے زاہدہ کے دل میں اس کی محبت کو باغریز کر دیا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی کہ کوئی اس کی خاطر کتنی بڑی قربانی دے رہا تھا۔ نصیر احمد کے اس ایثار کے پیش نظر زاہدہ نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں اس سے کئے ہوئے وعدے کو نبھائے گی۔

انتظار کی مدت ختم ہونے میں ابھی دو ماہ باقی تھے۔ زاہدہ کے انگ انگ سے خوشی چپکتی تھی۔ اس کی خاطر پردیس کی صعوبتیں کاٹنے والا اب تب میں آئے ہی والا تھا۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ سب سے بڑی خوشی اسے اس بات کی تھی کہ اس نے نصیر سے کیا ہوا وعدہ نبھادیا تھا اور آنکھوں کو فرش راہ بنائے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

پھر ایک ایسی ان ہوئی ہو گئی کہ سب کچھ ٹپٹ ہو کر رہ گیا۔ اچانک نصیر احمد کا رابطہ اس کے گھر والوں سے منقطع ہو گیا۔ اس کی جانب سے خط و کتابت کا سلسلہ اور ڈرافٹ آنا بند ہو گئے۔ اس صورت حال نے نصیر کے والدین کو پریشان کر دیا۔ انہوں نے نصیر کے بارے میں معلوم کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی مگر ساری محنت رائیج ہو گئی۔ مصیبت یہ تھی کہ منظور احمد کے پاس نصیر کا ایڈریس نہیں تھا۔ یعنی تازہ ترین ایڈریس نہیں تھا۔ منظور احمد نے ایران اور ترکی کے پتوں پر خط لکھ کر نصیر احمد کے بارے میں جاننا چاہا اور آخر کار پانچ چھ ماہ کی تک و دو کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی سلامتی

آرام کا ایک ایک لمحہ توجہ دوں گا۔ مجھے بہت زیادہ دولت کمانا ہے۔ سوشل اسٹینڈ بلند کرنا ہے۔ اس معاشرے میں وہی بڑا ہے جو زیادہ دولت مند ہے۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ”وعدہ کرتی ہو تاکہ تم دو سال تک اپنی شادی کے سلسلے کو باقی رہو گی؟“

بمشکل اس کے منہ سے نکلا ”میں کوشش کروں گی۔“

”کوشش نہیں زاہدہ! تمہیں ہر صورت یہ کرنا ہو گا۔“ نصیر نے مضبوط لہجے میں اصرار کیا۔ ”کیا تم میرے لئے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتیں؟ میں نے تم سے کوئی بہت بڑی قربانی تو نہیں کر دی۔“

زاہدہ کا دل تڑپا ہوا رہا تھا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئی بولی ”ٹھیک ہے، میں دو سال تک تمہارا انتظار کروں گی۔ اس کے بعد ابو جو چاہیں گے وہی ہو گا۔“

نصیر کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کے اندر مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے اپنے منصوبے کا ابتدائی معرکہ سر کر لیا تھا۔ جانے سے پہلے زاہدہ نے کہا ”اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دانستہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا اور نہ ہی تم سے خواہ مخواہ بات کرنے کی کوشش کروں گا۔“ نصیر نے با اعتماد لہجے میں کہا ”تم بھی اپنے وعدہ پر قائم رہنا!“

اس کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی راہ پر ہو گئے۔

چند روز کے بعد پتہ چلا کہ نصیر احمد نے کلرکی چھوڑ دی ہے۔ کیوں؟ اس بارے میں کوئی حتمی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک ماہ بعد اندرون خانہ یہ خبر سننے میں آئی کہ نصیر احمد بہتر ملازمت کے سلسلے میں ایران جا رہا ہے۔ اسے ایک آئل کمپنی میں کام مل گیا تھا۔ اس نے بڑے اچھے نمبروں سے میٹرک کر رکھا تھا اور وہ بھی سائنس میں۔ پھر وہ تین چار سال تک بطور کلرک دفتری امور کا بھی حافظ ہو چکا تھا۔ اس کی تعلیم اور تجربہ کام آیا اور اسے ایک غیر ملکی کمپنی میں بہتر مستقبل کا چانس مل گیا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں میٹرک پاس آدمی کی بڑی ویلیو ہوتی تھی۔ ایسے شخص کا شمار پڑے لکھے افراد میں کیا جاتا تھا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ایم۔ اے پاس بھی ڈھنگ کی درخواست تک لکھنے سے معذور ہیں۔ جتنی ”ترقی“ ہم نے تعلیمی میدان میں کی ہے شاید ہی کسی اور شعبے میں کی ہو۔

ایران روانگی کے دو ماہ بعد ہی نصیر احمد کے ڈرافٹ آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کی حالت بدلنے لگی۔ نصیر احمد کے والد منظور احمد نے نصیر کی ہدایت پر اپنا پرانا خاندانی کام چھوڑ

کی دعا مانگنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

دوسری جانب زاہدہ کے دل پر تو ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کی بے چینی و بے قراری اتنا کو چھو رہی تھی مگر وہ بھی بے بس تھی، اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دل موس کر رہ گئی اور نصیر کی خیریت کے لئے دعائیں کرنے لگی۔

کہتے ہیں، مصیبت جب آتی ہے تو ہر طرف سے آتی ہے۔ زاہدہ نصیر کی لئے تو پریشانی تھی ہی۔ اسی دوران میں اس کے گھر پر ایک اور المیہ آن پڑی۔ مشتاق حسین بھی کی دکان میں چوری ہو گئی۔ رات ہی رات میں چور اس کی دکان کا صفایا کر گئے۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس کا ستراسی ہزار کا نقصان ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے ستراسی ہزار روپے آج کل کے پچاس لاکھ سمجھ لیں۔ اتنے بھاری نقصان نے مشتاق حسین کو چارپائی سے لگا دیا۔ پھر اسے سنبھلنے میں ایک سال لگ گیا۔

وہ سنبھل تو گیا مگر اب سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے۔ پہلے جیسی دکان داری دوبارہ چلانے میں کئی سال لگ جاتے۔ گزشتہ ایک سال کے عرصے میں وہ رشتے داروں اور کاروباری لوگوں کا مقروض بھی ہو گیا تھا۔ بہر حال اس نے اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے تو وہ اپنے مکان کو فروخت کر کے کرائے کے گھر میں اٹھ آیا۔ اس طرح قرض خواہوں کا منہ بھی بند ہو گیا اور اس نے اپنی دکان کو بھی گزارے لائق بنا لیا۔ زندگی اپنا سفر ہر حال میں جاری رکھتی ہے۔ اب وہ پہلے جیسے ٹھٹھا ہاٹ تو نہیں رہے تھے لیکن زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔

اسی دوران میں زاہدہ کے لئے لائل پور سے فضل کریم کا رشتہ آ گیا۔ مشتاق حسین کی ساری اکڑفوں نکل چکی تھی۔ اب اس کی خواہش تھی کہ جیسے بھی ہو، زاہدہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور زاہدہ سے اس کا عندیہ لیا۔ زاہدہ اپنے والد کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔ نصیر کی جانب سے وہ ابھی مایوس تو نہیں ہوئی تھی تاہم اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنے وعدے میں سرخرو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے والدین کی خواہش کے سامنے گردن جھکا دی۔

قصہ مختصر، چھ ماہ کے اندر اندر زاہدہ، فضل کریم کی بیوی بن کر لائل پور پہنچ گئی۔ پھر سات سالوں میں تین بچے پیدا کرنے اور گھرداری میں مصروف ہو کر وہ اپنے آپ کی ہو کر رہ گئی۔ اس دوران میں اسے یکے بعد دیگرے دو صدمات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ایک سال کے وقفے سے اس کے ابو اور امی کا انتقال ہو گیا۔ اب اس کی دنیا فضل کریم اور بچوں تک

مہرود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس دوران میں نصیر احمد اسے بھولے بھٹکے بھی یاد نہ آیا۔ ویسے بھی نصیر احمد کے لئے اس کی محبت میں وہ شدت نہیں تھی جو نصیر احمد اس کے لئے رکھتا تھا۔ اب خال خال ہی اس کا لاہور جانا ہوتا تھا، وہ بھی فضل کریم اور بچوں کے ساتھ۔ فضل کریم کے کچھ رشتے دار لاہور میں رہتے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار ہی ان کا چکر لگتا تھا۔

زاہدہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بڑے سکون کی زندگی گزار رہی تھی کہ ایک بھونچال نے اس کا سکون درہم برہم کر دیا۔ اس بھونچال کا نام نصیر احمد تھا جو دس سال بعد چانک ہی نمودار ہو گیا تھا۔ زاہدہ تو اسے قریب قریب بھول ہی چکی تھی۔ نصیر کی آمد نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

تیرہ اگست بروز اتوار کو جب فضل کریم حسب معمول اپنی دکان پر جا چکا تھا اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی تو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت زاہدہ کا بڑا بیٹا طارق محمود اسکول گیا ہوا تھا۔ زاہدہ نے دروازہ کھولا تو سامنے تیرہ چودہ سال کا ایک دیلا پتلا لڑکا کھڑا نظر آیا۔ اس نے زاہدہ سے پوچھا۔

”آپ کا نام زاہدہ ہے؟“

”ہاں“ میں ہی زاہدہ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ لڑکا زاہدہ کے لئے اجنبی تھا۔ اس نے پوچھا ”تم کون ہو اور میرا نام کیوں پوچھ رہے ہو؟“

لڑکے نے فوری طور پر قمیص کی جیب سے ایک خط نکال کر زاہدہ کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا ”اسے اندر جا کر اطمینان سے پڑھ لیں۔“ اتنی بات ختم کرتے ہی وہ دوڑتے ہوئے زاہدہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ زاہدہ اس سے یہ بھی نہ پوچھ پائی کہ وہ خط کس نے بھیجا تھا۔

زاہدہ نے دروازہ بند کیا اور اندر آ کر خط کھول لیا۔ ابھی تک وہ کشمکش کا شکار تھی۔ وہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ اس خط کا آخر مقصد کیا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ خط نصیر احمد کی جانب سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”زاہدہ! تمہیں یہ جان کر حیرت تو ہو رہی ہو گی کہ میں زندہ ہوں۔ تم یقین کر لو کہ میں واقعی نہ صرف زندہ ہوں بلکہ آج بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی دس سال پہلے۔۔۔۔۔ بلکہ یہ کتنا زیادہ مناسب ہو گا کہ جتنی اول دن سے کرتا تھا۔ میں اس وقت ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع غریب نواز ہوٹل کے کمرانمبر تیرہ میں ٹھہرا ہوا ہوں اور جلد از جلد تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تفصیلی گفتگو ملاقات پر ہو گی۔ ایک بات کا خیال رکھنا کہ ہوٹل کا عقبی

نصیر نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زاہدہ نے تپ کر پوچھا ”لیکن کیا؟“ وہ چند لمحے خاموشی سے زاہدہ کے چہرے کو ٹکاتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”لیکن یہ کہ.... میری محبت میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی بلکہ پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔“

زاہدہ نے سرزنش کے انداز میں کہا ”اب تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں نصیر۔“ ”کیوں؟“ وہ دنیا بھر کی اداسی کو اپنے لہجے میں سمو کر بولا۔

زاہدہ نے کہا ”کیونکہ میں اب تمہارے لئے غیر ہو چکی ہوں۔ یہاں بھی میں محض اس لئے آگئی کہ تمہیں اپنے گھر آنے سے روکنا چاہتی تھی۔ میں اپنی ازدواجی زندگی میں کسی نئی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ پلیز تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے اپنے خواب و خیال سے بال دو۔ میں اب تمہارے لئے پرانی ہو چکی ہوں۔ ماضی کو بھلا کر تم بھی کہیں شادی کر دو۔“

”ماضی کو بھلانا اتنا آسان نہیں ہے زاہدہ۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا ”اسی ماضی میں تو تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔“

”تم مجھ سے اس سلسلے میں شکوہ کرنے کا حق نہیں رکھتے ہو نصیر۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے ہر حال میں نبھایا تھا۔“ زاہدہ کے لہجے میں غصے کی آمیزش تھی۔ ”میں نے دو کے بجائے تین سال تمہارا انتظار کیا۔ تم آئے نہ تمہاری خبر کا کچھ پتہ چلا۔ میں اپنے گھر سے آزاد ہو گئی تھی۔ تمہاری شکایت بے جا ہے۔“

”میں تم سے شکایت کرنے نہیں آیا ہوں۔“ نصیر نے دکھی لہجے میں کہا ”کم از کم اتنا تو مجھ کو، میں نے اتنا طویل عرصہ کہاں گزارا۔ کن کن مصائب اور تکلیفوں سے دوچار رہا!“

”تم خود ہی بتا دو۔“ نصیر نے بتایا ”میں آج سے آٹھ سال پہلے ایک ناکروہ جرم میں جیل چلا گیا تھا۔ اپنی سزا اٹانے کے بعد ایک ماہ پہلے ہی لاہور پہنچا ہوں مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ میری تو دنیا ہی لٹ گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔“

”اوہ! بہت افسوس ہوا۔“ زاہدہ نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا پر پوچھا ”آخر ہوا کیا؟“

”ایتنے میں ایک شخص کو تین راہزنوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ تینوں مسلح تھے اور اسے مارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“ نصیر نے داستان غم سناتے ہوئے کہا ”مجھ سے اس گھرے ہوئے

راستہ استعمال کرنا اور سیدھی کرا نمبر تیرہ میں آ جانا۔ یہ رقعہ ملنے سے لے کر کل یعنی چودہ اگست کے غروب آفتاب تک تمہارا انتظار اسی کمرے میں کروں گا۔ اگر تم میرے پاس ملنے کے لئے نہ آئیں تو بحالت مجبوری مجھے تمہارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ اس صورت میں تم نتائج کا اندازہ لگا لو کیونکہ بہر حال میرے نزدیک یہ ملاقات اتنی ہی ضروری ہے جتنا ضروری زندہ رہنے کے لئے سانس لینا ہے۔ منتظر۔ تمہارا بچاری۔ نصیر احمد۔“

خط پڑھنے کے بعد زاہدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا سر گھومتے لگا۔ برسوا کی راکھ تلے دبی ایک چنگاری نے اچانک شعلہ پکڑ لیا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ کسی بھی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ نصیر احمد اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ وہ اپنی جی بمال ازدواجی زندگی میں کوئی رخصت پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ سارا دن اور آنے والی رات فیصلے کی سولی پر چڑھی رہی۔ آخر کار صبح ہونے سے پہلے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے ہوٹل میں جا کر نصیر احمد سے ملاقات کا ارادہ کر لیا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ چودہ اگست کو چھٹی تھی اور فضل کریم گھر پر ہی تھا۔ اس صورت میں اس کا گھر سے ٹکنا خاصا مشکل تھا۔ پھر تقدیر نے اسے ایک موقع فراہم کر دیا۔

محله ہی میں کسی کی میت ہو گئی۔ زاہدہ نے بچوں کو فضل کریم کے پاس چھوڑا اور فوری طور پر گھر سے نکل گئی۔ فضل کریم نے اس سے کہا تھا کہ وہ پہلے ہو کر آ جائے وہ بعد میں جنازے کے وقت شرکت کر لے گا۔ زاہدہ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور غریب نواز ہوٹل کے کرا نمبر تیرہ میں پہنچ گئی جہاں نصیر احمد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت سہ پہر قریب قریب چار کا وقت تھا۔

نصیر احمد کو پہچاننے میں اسے تھوڑی دشواری ہوئی کیونکہ وہ کافی بدل گیا تھا۔ زاہدہ کی حیرت کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا ”کیوں یقین نہیں آ رہا؟ میں وہی ہوں۔ وہی نصیر جو اس معاشرے کا معزز انسان بننے کے لئے دس سال پہلے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔“

”مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم وہی ہو نصیر۔“ زاہدہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”یہاں کیوں آئے ہو۔ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ جو کہتا ہے جلدی سے کہہ ڈالو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔“

نصیر احمد تسخیرانہ انداز میں مسکرایا پھر بولا ”میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا ہوں۔ تم اب گھر بار والی ہو گئی ہو۔ تمہارے تین بچے بھی ہیں۔ تمہارا شوہر تم سے بہت محبت کرتا ہے لیکن....“

نظروں سے گرا دوں گی۔ اپنی محبت کو رسوا کرنے کے بجائے امر کرد اور میری زندگی اس طرح کھل جاؤ جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔“

”یہ.... یہ تمہارا آخری.... فیصلہ ہے.... زاہدہ؟“ اس کا یہ سوال زمانے بھر کے کرب کا دوا ہوا تھا۔

زاہدہ کے فیصلے میں چٹان کی سی سختی تھی ”آخری اور قطعی۔“  
”فحیک۔ ہے۔“ نصیر نے فولادی لہجے میں کہا ”یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب ہم اے جہان میں ملیں گے۔“

زاہدہ جیسے چپ چاپستے وہاں پہنچی تھی دیسے ہی واپس آگئی۔  
وہ اپنی داستان ختم کر چکی تو میں نے سوال کیا ”کیا تم کسی رفاقت علی نای شخص سے نف ہو۔ وہ ہمیں لائل پور میں رہتا ہے اور مقتول نصیر احمد (اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی مقتول کا نام نصیر احمد ہی تھا اور وہ منیر حسین کے فرضی نام سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا) کا دوست بھی ہے۔ وہ اکثر غریب نواز ہوٹل میں اس سے ملنے جاتا تھا؟“

اس کا جواب نہایت مختصر تھا ”میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔“  
مجھے گمان گزرا کہ جیسے نصیر احمد نے اپنا فرضی نام منیر حسین بتایا تھا تو ممکن تھا رفاقت علی بھی کوئی فرضی نام ہی ہو لیکن اس سلسلے میں زاہدہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے دو چار رسمی سوالات اور کئے پھر لاہور میں نصیر احمد کے گھر کا مکمل ایڈریس حاصل کر لیا۔ اٹھنے سے پہلے میں نے کہا۔

”زاہدہ بی بی، تم نے جو کمائی سنائی ہے، میں اس کی تصدیق بھی کروں گا۔ اگر تمہارا غلط ہوا یا تم کسی بھی طرح نصیر احمد کے قتل میں ملوث پائی گئیں تو مجھ سے کسی روایت کی توقع نہ کرنا۔ ہاں البتہ، اگر تم واقعی بے گناہ ہو تو تم پر میں ایک حرف بھی نہیں لے دوں گا۔“

زاہدہ نے پر اعتماد لہجے میں کہا ”آپ جیسے چاہیں، اپنی تسلی کر لیں۔ جو ج تھا وہ میں نے تم کو بتا دیا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ”ان تمام واقعات کا میرے شوہر لال کہم کو پتہ نہیں چلنا چاہئے ورنہ میری گھریلو زندگی زہرناک ہو جائے گی۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی ”مجھے تمہاری پوزیشن کا احساس

بے چارے شخص کی حالت نہ دیکھی کئی اور میں نے ان لیروں کے خلاف مزاحمت لی۔ اسی چھینا جھپٹ میں ایک راہزن کی پستول سے گولی چل گئی جو اسی کے ساتھی کی کھوپڑی سے پار ہو گئی۔ وہ اپنا پستول اور زخمی ساتھی کو وہیں چھوڑ کر موقع سے فرار ہو گئے۔ اس دوران میں وہ مصیبت زدہ شخص بھی ایک بغلی گلی میں غائب ہو گیا۔ قریب ہی سے ایک پولیس کی گاڑی گزر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ پاکستانیوں کی بیرون ملک میں شہرت خاصی خراب ہے۔ مجھ پر مقدمہ چلا اور آٹھ سال کے لئے مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ میں نے کافی شور مچایا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔“

نصیر احمد کی پتا ختم ہوئی تو زاہدہ نے کہا ”میں تمہیں صبر کرنے کے سوا اور کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ اللہ تمہیں سکون دے اور تمہارے حال پر رحم کرے۔“  
”اوپر اللہ اور نیچے تم ہو زاہدہ۔“ نصیر نے خواب ناک لہجے میں کہا ”مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“

”اب کچھ نہیں ہو سکتا نصیر، وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے۔“ زاہدہ نے مرہبانہ لہجے میں کہا ”اب ہم دو مختلف راہوں کے مسافر ہیں۔“

نصیر نے امید افزا نظروں سے زاہدہ کو دیکھا پھر ملتی لہجے میں کہا ”تم چاہو تو اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں کی مشترکہ کاوشوں سے گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے۔“  
”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ زاہدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

نصیر جو کچھ کہنے یہاں تک آیا تھا وہ اس نے زاہدہ سے کہہ دیا ”ہم اب بھی ایک ہو سکتے ہیں زاہدہ، اگر تم فضل کریم سے طلاق....“

”بس اب ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا نصیر۔“ زاہدہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی  
مجھے تم سے اتنی گھٹیا بات کی توقع نہیں تھی۔“

وہ گڑگڑایا ”مجھے غلط مت سمجھو زاہدہ۔ میں تمہاری محبت سے مجبور ہوں۔“  
”اگر تمہیں مجھ سے رتی برابر بھی محبت ہی تو میرا خیال دل سے نکال دو۔“ زاہدہ نے

دو ٹوک انداز میں کہا ”ورنہ میں سمجھوں گی کہ تمہاری محبت محض ایک ڈھونگ تھی۔ تم میرے ساتھ فریب کر رہے تھے۔ تم ایک چال باز اور دغا باز شخص ہو۔“

”اتنا ظلم نہ کرو زاہدہ!“ وہ احتجاجی لہجے میں چیخا۔

زاہدہ نے معتدل انداز میں کہا ”نصیر، اگر تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو آئندہ ہم مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ اگر تم نے آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو میں تمہیں

”ہم اٹھ کر جانے لگے تو زاہدہ نے کہا ”ذرا ٹھہر جائیں، میں پہلے گلی میں جھانک کر دیکھ

لوں۔

اس نے بڑی معقول اور عقل مندی کی بات کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے آکر کہا ”آجائیں، جلدی سے۔“

اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم فوری طور پر گھر سے باہر نکل آئے۔ ہم تھانے پہنچے تو ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ قارئین! میں نے ابھی جو تفصیل بیان کی ہے، ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے میں نے انہیں ترتیب وار آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے تاکہ آپ اس کیس کے سیاق و سباق سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔



دوسرے روز میں ”ایم نذیر عنایت اللہ“ ٹرانسپورٹ سروس کی ایک بس میں بیٹھا لائل پور سے لوہے میل دور لاہور کی جانب رواں دواں تھا۔ حوالدار سلطان شاہ بھی میرے ہمراہ تھا۔ ہم دونوں سادہ لباس میں تھے۔ میں جب بھی کسی دوسرے شہر جاتا تھا تو اپنے ساتھ کسی جوئیر کو ضرور لے جاتا تھا، مقصد اس کی تربیت اور تفتیش کا طریقہ کار سمجھانا ہوتا تھا۔ وہ اکتوبر کی ابتدائی تاریخیں تھیں اور ہلکی ہلکی خنکی کا آغاز ہو چکا تھا۔ نصیر احمد کو قتل ہوئے اب ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اور قاتل کا ابھی کوئی سراغ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

لاہور پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ضلع ہیڈ کوارٹر میں اپنی آمد کی غرض و غایت بیان کی پھر بھائی گیٹ پہنچ گیا۔ متعلقہ تھانے میں جا کر میں نے وہاں کے انچارج کو بتایا کہ کس مقصد سے میں وہاں پہنچا ہوں۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ آیا اس تھانے میں نصیر احمد کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ وغیرہ درج کرائی گئی ہے یا نہیں۔ مجھے یہ سن کر بے پناہ حیرت ہوئی کہ نصیر احمد کے والدین نے ایسی کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔

یہ بات مجھے مبہم نہیں ہوئی۔ نصیر احمد بارہ اگست کو لائل پور پہنچا تھا اور اب اکتوبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ نصیر احمد نے گھر سے روانہ ہوتے وقت ضرور کوئی ایسی بات کی ہوگی کہ اس کے والدین اس کی طرف سے بے حد مطمئن تھے۔ میں نے تھانے سے نکل کر نصیر احمد کے گھر کا رخ کیا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم اس کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اندرون بھائی گیٹ کا ایک اوسط درجے کا گھر تھا۔ مکان کے اگلے حصے میں ایک جنرل اسٹور بھی موجود تھا۔ ہمیں دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جنرل اسٹور کے اندر ایک عمر رسیدہ

غصص موجود تھا جو امکان تھا، نصیر احمد کا والد منظور احمد ہو گا۔ ہم اس کی طرف بڑھ گئے۔ ”چاچا جی، نصیر احمد کا گھر یہی ہے؟“ حوالدار نے اس بوڑھے غصص سے پوچھا۔ عمر رسیدہ غصص نے نظر کا چشمہ اتار کر آنکھیں سکیڑیں پھر ہماری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا ”نصیر احمد کا گھر تو یہی ہے لیکن آپ کون لوگ ہیں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”پہچاننے کا کیا سوال ہے بزرگو، ہم آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔“ میں نے آگے بڑھ کر کہا ”ہم نصیر احمد سے ملنے آئے ہیں۔“

”میں نصیر کا باپ منظور ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا ”نصیر تو اس وقت گھر میں نہیں ہے۔“

میں نے پوچھا ”وہ کہاں گیا ہوا ہے؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟“

اب تعارف ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے کہا ”منظور چاچا، ہم لائل پور سے آئے ہیں۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں وہاں ایک تھانے کا انچارج ہوں اور یہ میرے ساتھ حوالدار سلطان شاہ ہے۔“

پولیس کا نام سنتے ہی وہ گھبرا گیا ”خدا خیر کرے، آپ کس سلسلے میں نصیر سے ملنے آئے ہیں؟“

”سلسلہ بھی بتا دیں گے بزرگو۔“ سلطان شاہ نے سخت لہجے میں کہا ”پہلے تو ایہ بتائیں کہ آپ کا پتر کیا کہاں ہے؟“

منظور احمد نے بتایا ”وہ شمالی علاقوں کی سیر کو گیا ہوا ہے۔ چند دن میں واپس آ جائے گا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے سوال کیا ”پر معاملہ کیا ہے، کچھ میرے پلے بھی تو پڑے۔“

منظور احمد کے جواب سے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ گھر میں شمالی علاقوں کی سیر کا پتر کر گیا تھا اسی لئے یہاں اس کے لئے کوئی فکر مند نہیں تھا۔ میں نے منظور احمد کو زیادہ دیر اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا۔ ”چاچا منظور، ہم نصیر احمد کے بارے میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے۔“

”ٹھہریں، اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا پھر گھر کے اندر چلا گیا۔

جزل اسٹور میں ہی سے گھر کی جانب ایک دروازہ کھلتا تھا۔ وہ وہیں سے اندر گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر کے بیرونی دروازے سے باہر آیا اور ہمیں اپنے ساتھ گھر کے اندر بیٹھک میں لے گیا۔ ہمیں اس نے بیٹھنے کے لئے کہا پھر پوچھا ”آپ کیا خبر لائے ہیں نصیر احمد کے بارے میں؟“

میں نے پوچھا ”کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ وہ شمالی علاقوں کی سیر کو ہی گیا تھا؟“  
”مجھے تو وہ یہی بتا کر گیا تھا۔“ منظور احمد نے کہا ”اسے کیا ہوا ہے“ آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟“

میں نے کہا ”منظور چاچا“ آپ کا بیٹا شمالی علاقوں کی سیر کو نہیں گیا تھا۔ وہ بارہ اگست کو سیدھا لائل پور پہنچا تھا۔“

”لائل پور۔“ منظور احمد نے زیر لب دہرایا ”پر وہ وہاں کیا لینے گیا تھا؟“  
اسی وقت ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھک میں داخل ہوئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مقتول نصیر احمد کی ماں دلشاد بیگم تھی۔ اس نے آتے ہی منظور احمد کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دروازے سے گئی ہماری گفتگو سن رہی تھی۔

”اسی کے پیچھے گیا ہو گا جس نے ہمارا گھر اجاڑ دیا ہے۔“ دلشاد بیگم نے کہا ”مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ وہ سیر کا بہانہ کر رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب کیا ہے“ حلیئے لوکے، کہیں تم زاہدہ کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟“ منظور احمد نے خیال آرائی کی۔

دلشاد بیگم نے تھوڑی دیر زاہدہ کو جلی کٹی سنانے کے بعد کہا ”وہ تو ہے ہی منحوس۔ اپنا گھر بھی اجاڑا“ دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈال گئی۔ لو کر لو گل، اس کے باپ کی دکان کو چوروں نے لوٹا“ ہزاروں روپے کا سونا لے گئے۔ پھر دونوں میاں بیوی آگے پیچھے اس دنیا سے چلے گئے۔ پھر ہمارے نصیر کو بھی در بدر خاکستر کر دیا۔ وہ اس کھوہی کی خاطر ملک سے باہر نہ جاتا تو نہ اس پر برا وقت آتا اور نہ ہمیں یہ دن دیکھنا پڑتے۔ مجھے تو اس غیبت کی صورت سے ہی نفرت ہے۔“

”خواہ مخواہ دوسروں کی برائی نہیں کرتے بھلی مانس۔“ منظور احمد نے بیوی کو روکا ”خدا ناراض ہوتا ہے۔“

وہ ہاتھ ہوا میں چلاتے ہوئے بولی ”تمہیں تو کسی چیز کا پتہ ہی نہیں ہے منظور۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہو۔ دیکھو کیسا اپنا غلام بنا کر رکھ دیا ہے میرے پڑے کو۔ دس مل

کے بعد اس کی شکل دیکھی تھی۔ ایک مہینہ بھی پورا نہیں نکا یہاں اور اسی کٹنی کے پیچھے چلا گیا ہے۔ ہم سے بہانہ کر دیا کہ سیر پائے کرنے جا رہا ہے۔“

”تم دوسروں کے لئے اپنی زبان تپاک نہ کرو۔ جو جیسا کرے گا“ اس کا نتیجہ بھی خود ہی جگتے گا۔“ منظور احمد نے سخت لہجے میں کہا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب! آپ نصیر کے بارے میں کیا خبر لائے ہیں؟“

میں نے کہا ”پہلے تم لوگ اپنی بات مکمل کر لو۔ پھر میں کچھ بولوں گا۔“  
وہ دونوں یک دم چپ ہو گئے پھر منظور احمد نے پوچھا ”نصیر احمد خیر خیریت سے تو ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے چاچا۔“ میں نے دل کڑا کر کے کہا ”نصیر احمد اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

دلشاد بیگم کے منہ سے ایک چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔ ”ہائے وے میرا رہا! میرا جوان جہان بچہ کھاگی وہ ڈائن۔ میرا ایک ہی پتر تھا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی اسے۔ وہ نہ اس ست عصی کے پیچھے جاتا نہ اپنی جان گناتا۔“ پھر اس نے باقاعدہ بین کر کے رونا شروع کر دیا۔

منظور احمد کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے تاہم اس نے اپنے غم کے اظہار کے لئے آہ و زاری کو وسیلہ نہیں بنایا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا ”یہ سانحہ کب ہوا؟“

میں نے بتایا ”نصیر احمد کو چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کی لاش پندرہ اگست کی صبح ہمیں دھوپ لگھٹ کے قریب سے ملی تھی۔“

”قاتل کا کچھ پتہ چلا؟“ منظور احمد نے قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں پوچھا۔  
میرے بولنے سے پہلے ہی دلشاد بیگم نے چیخ کر کہا ”قاتل وہی ہے چڑیل۔ اور کسی کو نصیر سے کیا دشمنی!“

میں نے منظور احمد کو بتایا ”ابھی قاتل ہمارے ہاتھ نہیں آیا لیکن امید ہے کہ وہ بہت جلد حوالات میں ہو گا۔“

”میں سچ کہتی ہوں تھانے دار صاحب۔“ دلشاد بیگم براہ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئی بولی ”آپ جلدی سے جا کر اس کمپنی کو گرفتار کر لیں بلکہ اس کے خصم کو بھی تھانے میں بند کر دیں پھر ایسی پھینٹی لگائیں کہ اس کی بوٹی بوٹی پکاراٹھے کہ قتل اسی نے کیا ہے۔“

خود وہاں چلے جائیں گے۔“

”بڑے چوک میں کھیر فالوے کی ایک ہی دکان ہے۔“ منظور احمد نے بتایا ”آپ کسی سے بھی پوچھ لیں۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دلشاد بیگم نے پوچھا ”نصیر کو دفن کہاں کیا ہے قہانے دار صاحب۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے عجیب سے لہجے میں کہا ”دفن کیا بھی ہے یا اسپتال والوں کو تجربوں کے لئے دے دیا ہے؟“

میں نے اس کے بے جا طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”فکر نہ کرو چاچی۔ تمہارے بیٹے کی لاش کے ساتھ کوئی بے حرمتی نہیں ہوئی۔ میں نے اسے ایک مذہبی ادارے کے حوالے کیا تھا۔ انہوں نے نصیر کو لائل پور کے بڑے قبرستان میں لمانت کے طور پر دفن کرا دیا تھا۔ تم چاہو تو اپنے کسی قریبی قبرستان میں اسے منتقل کر سکتی ہو۔“

اس کے بعد ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ غلام رسول فالوہ فروش کی دکان ڈھونڈنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ اچھی خاصی بڑی دکان تھی جس کے سامنے لکڑی کی بیٹھیں اور میزیں رکھی ہوئی تھیں اور کچھ گاہک وہاں بیٹھے فالوہ کھا رہے تھے۔ غلام رسول اور اس کا بیٹا آفتاب بھی وہاں موجود تھے۔ غلام رسول کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس اور بچپن کے درمیان لگایا۔ عمر سے قطع نظر وہ قلیل رشک صحت کا مالک ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ آفتاب تیس بیس سال کا ایک گہرو جوان تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں نصیر احمد کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ نصیر کی موت کی خبر سن کر انہیں دلی صدمہ پہنچا۔ میں نے غلام رسول سے کہا ”میں نے سنا ہے آپ کا بیٹا آفتاب مقتول نصیر احمد کا گہرا دوست تھا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آفتاب سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

میں اپنا تعارف کروا چکا تھا۔ غلام رسول بھی خاصا صلح جو شخص تھا۔ اس نے جلدی سے کہا ”ملک صاحب، اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آفتاب جیسے میرا بیٹا ہے ایسے ہی آپ کا بھی ہے۔ آپ پوچھیں جو پوچھتا ہے۔“ پھر اس نے آفتاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”پتر، ملک ہورائوں پچھلے کمرے وچ لے جا۔ میں ذرا ان کے لئے دو پیالی فالوے کی بناتا ہوں۔“

میں نے بعد اصرار غلام رسول کو فالوہ بنانے سے منع کر دیا اور آفتاب کی معیت میں ہم دکان کے عقبی کمرے میں آ گئے۔ کمرے کی بیشک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک

یہ ایک ماں کے جذبات تھے جس کا جوان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ زاہدہ سے متعلق دلشاد کی زہر افشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ زاہدہ وہ عورت تھی جسے پانے کی خاطر مقتول نصیر احمد گھر سے بے گھر ہو گیا تھا اور ملکوں ملکوں خاک چھانتا ہوا ایتھنز کی جیل میں پہنچ گیا تھا۔ ایک ماں نے ایسی عورت کے سبب اپنے نعت جگر سے دس سال کی جدائی برداشت کی تھی جو آگے چل کر اس کی ہو بننے والی تھی۔ حالات نے زاہدہ کو دلشاد بیگم کی ہو بننے کا موقع تو نہیں دیا تھا تاہم نصیر احمد کی موت میں وہ بلا واسطہ نفعی ہو گئی تھی۔ نصیر احمد اگر زاہدہ سے ملنے لائل پور نہ جاتا تو ممکن تھا وہ موت کے پنجوں سے محفوظ رہتا۔ میں نے دلشاد بیگم کے دوایلے کو نظر انداز کرتے ہوئے منظور احمد سے استفسار کیا ”آپ کسی رفاقت علی کو جانتے ہیں؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”یہ نصیر احمد کا کوئی دوست ہے۔ ادھر لائل پور ہی میں رہتا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ رفاقت علی نصیر احمد سے ملتا رہتا تھا۔ نصیر کی موت سے پہلے بھی ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا گیا تھا۔ اس شخص کا کچھ اتنا پتہ چل جائے تو نصیر احمد کے قتل کا معاملہ ہو سکتا ہے۔“

منظور احمد نے جواب دیا ”میں تو رفاقت علی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے، آفتاب کچھ جانتا ہو۔“

”کون آفتاب؟“ میں نے پوچھا۔

منظور احمد نے بتایا ”نصیر احمد کا لنگوٹیا یار ہے جناب۔ نصیر کا اٹھنا بیٹھنا بس اسی ایک لڑکے کے ساتھ تھا۔“

”آفتاب اس وقت کہاں مل سکتا ہے؟“

”اپنی دکان پر ہی ہو گا۔“ منظور احمد نے کہا ”ادھر بڑے چوک میں اس کے باپ غلام رسول کی کھیر اور فالوے کی دکان ہے۔ آفتاب بھی غلام رسول کے ساتھ ہی دکان پر بیٹھتا ہے۔“

میں نے سوچا، اگر آفتاب واقعی مقتول نصیر احمد کا لنگوٹیا یار ہے تو پھر اس سے خاصی معلومات افزا باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ میں نے منظور احمد سے غلام رسول کی دکان کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا ”میں خود آپ کے ساتھ چلتا ہوں جناب۔“

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا ”چاچا، تم گھر میں رہو۔ مرگ والا گھر ہے۔ آڈی گوانڈی تعزیت کے لئے آئیں گے۔ تم ہمیں غلام رسول کی دکان کا پتہ بتا دو، ہم

نصیر احمد کی سنجیدگی اور مزاج کی تبدیلی کی وجہ میرے علم میں تھی اس لئے میں نے آفتاب کو اس پہلو سے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور ضروری سوال کرنے لگا ”آفتاب“ تمہارا کیا خیال ہے۔ نصیر لائل پور کیوں گیا تھا؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جناب!“ وہ افسروگی سے بولا ”اگر میں نے سنا شروع کر دی تو آپ کو کئی دن تک ہمارا مسلمان بن کر رہنا پڑے گا۔“

میں نے کہا ”میں پوری کہانی سے واقف ہوں برخوردار۔ بس تم سے تصدیق چاہتا ہوں۔ کیا نصیر احمد زاہدہ سے ملاقات کرنے لائل پور گیا تھا؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا ”میں نے پوچھا“ کیا وہ اس سے پہلے بھی لائل پور جاتا رہا تھا۔ میرا مطلب ہے جب وہ ملک سے باہر نہیں گیا تھا اور یہیں لاہور میں کلرکی کرتا تھا۔“

اس نے میری معلومات پر حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”آپ تو بہت کچھ جانتے ہیں جناب!“

”یہ سب کچھ میرے فرائض کا تقاضا ہے۔“ میں نے کہا پھر پوچھا ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا پتہ؟“

وہ بولا ”ہاں“ وہ کبھی کبھار لائل پور کا چکر لگا لیا کرتا تھا۔ وہاں اس کا کوئی دوست رہتا تھا۔“

”اس دوست کا نام رفاقت علی تو نہیں تھا؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”بالکل یہی نام ہے جناب۔“

”کیا تم جانتے ہو رفاقت علی کیا کرتا ہے اور لائل پور میں وہ کس جگہ رہتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آفتاب نے جواب دیا ”رفاقت علی پہلے لاہور ہی میں رہتا تھا۔ اس کا گھر کرشن نگر میں تھا۔ وہ نصیر احمد کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ بعد میں رفاقت کے گھر والے کسی وجہ سے لائل پور چلے گئے۔ رفاقت کو بھی بحالت مجبوری ان کے ساتھ جانا پڑا۔ اب وہ پنجاب ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہے اور گول بازار کے نزدیک ہی اس کی رہائش ہے۔ پورا پتہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔“

”گول بازار“ کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ اس زمانے میں گول بازار کو لائل پور کے بازار حسن کی حیثیت حاصل تھی۔ آج کل کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ اس بازار کے سامنے ایک قطار میں لکڑی کے کسبن بنے ہوئے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، ان کسبنوں میں بڑائی کی دکانیں

نشست تھ تھی۔ ایک طرف پرانا صوفہ سیٹ دھرا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ لوہے کی دو کرسیاں پڑی تھیں۔

ہم بیٹھ گئے تو میں نے آفتاب سے پوچھا ”ہاں بھی جوان“ میں نے سنا ہے نصیر احمد تمہارا جگری یار تھا؟“

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”بڑا کوڑھا (کرا) بلی تھا وہ میرا۔“

”پھر تو وہ تم سے کچھ بھی نہیں چھپاتا ہو گا؟“

”آپ کا اندازہ ٹھیک ہے جناب!“ آفتاب نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا ”وہ اپنے دل کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جب تک مجھے بتا نہیں دیتا تھا“ اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔“

میں نے پوچھا ”بارہ اگست کو بھی وہ تمہیں بتا کر گیا تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟“

اس نے جواب دینے میں تامل کیا ”میں نے کہا“ آفتاب“ تمہارا دوست اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو ممکن ہے ہم بہت جلد اس کے قاتل کو گرفتار کر لیں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ نصیر کا قاتل جلد از جلد کیفر کردار کو پہنچے۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

میں نے کہا ”آفتاب! تم نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا۔“ پھر میں نے اپنا سوال دہرا دیا ”بارہ اگست کو نصیر احمد کہاں گیا تھا؟“

”اب پرانی باتیں چھیڑنے کا کیا فائدہ تھا نے دار صاحب۔ مرنے والا تو مر گیا۔“ اس کے لہجے میں یاسیت کا عنصر نمایاں تھا ”نصیر احمد نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ لائل پور جا رہا ہے اور چند روز میں واپس آ جائے گا۔“

”مگر اس نے اپنے گھر میں تو قدرے مختلف کہانی سنائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا ”ہاں“ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ گھروالوں کو وہ شمالی علاقوں کی سیر کا بتا کر گیا تھا۔ جب ایک ہفتے تک نصیر احمد کی واپسی نہیں ہوئی تو میں اس کے گھر گیا تھا۔ چاچا منظور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دو ماہ کے بعد آئے گا۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ نصیر احمد نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی تھی حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سوچا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”جب سے وہ یونان سے واپس لوٹا تھا، بدلا بدلا لگتا تھا۔ سنجیدہ اور حساس ورنہ وہ تو بہت زندہ دل تھا۔“



باغ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم اپنے تھامے پہنچے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔



میرا ارادہ تھا کہ پنجاب ٹیکسٹائل مل خود جاؤں لیکن اس روز تھامے میں ضروری نوعیت کے کچھ ایسے کام نکل آئے کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی تھامے سے باہر نہ نکل سکا۔ وہ پورا دن میں نے بہت مصروف گزارا تھا۔ تاہم میں نے یہ ڈسے داری ہیڈ کاشیبل امیرخان کے سپرد کر دی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے اندر آتے ہی مجھے سیلوٹ مارا۔ میں نے کہا۔

”امیرخان، تم دو کاشیبلوں کو ساتھ لے کر پنجاب ٹیکسٹائل مل جاؤ۔“ مذکورہ مل میرے تھامے سے زیادہ دور نہیں تھی ”وہاں رفاقت علی نامی ایک شخص کام کرتا ہے، اسے لے کر فوری طور پر تھامے آ جاؤ۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے کہا ”ذرا ہوشیاری کے ساتھ، کہیں بندہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔“

”تمی فکر ہی نہ کرو ملک صاحب۔“ امیرخان نے پر یقین لہجے میں کہا اور دوبارہ سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر امیرخان تھامے میں موجود تھا۔ وہ رفاقت علی کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے فوری طور پر انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ امیرخان نے بتایا ”ملک صاحب، بندے کو گھر سے پکڑ لایا ہوں جناب۔“

”میں نے تو تمہیں اس کے کارخانے بھیجا تھا؟“

وہ بولا ”میں پہلے تو کارخانے ہی گیا تھا مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس کی رات کی ڈیوٹی ہے۔ میں نے کارخانے کے فٹھی سے اس کے گھر کا پتہ لیا اور اب بندہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔“

رفاقت علی ستائیس اٹھائیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور ہل محقریالے تھے۔ اس نے فیروزی رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ اس کا حلیہ بتاتا تھا کہ جیسے اسے گہری نیند سے جگایا گیا ہو۔ وہ خاصا حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے امیرخان کو باہر جانے کا اشارہ کیا پھر رفاقت علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے حکم سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے تامل کے بعد میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر وہ ایک معقول اور شریف آدمی نظر آتا تھا۔ مجھے اس کے چہرے

تھیں۔ ان دکانوں کے عقبی حصے میں ایک تنگ سی گلی موجود تھی جہاں طوائفوں کے دلال گھومتے رہتے تھے تاکہ تماش بینوں اور شوقین حضرات کو سودے بازی میں آسانی رہے۔ بازار حسن میں روزانہ باقاعدہ مجرا ہوتا تھا اور وہ سب کچھ بھی.... جو ایسے مقامات سے منسوب ہے۔“

”وہ پنجاب ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہے، بس اتنا ہی کافی ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ”لائسنس پور میں ایک ہی اس ٹیم کی ٹیکسٹائل مل ہے۔ اس کے گھر کا پتہ میں خود ڈھونڈ لوں گا۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا ”آفتاب، کیا تم رفاقت علی سے مل چکے ہو؟“

”جب وہ لاہور میں تھا اور نصیر کے پاس آتا تھا تو اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔“ آفتاب نے جواب دیا۔

”رفاقت علی کیسا آدمی ہے؟“

”بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے جناب۔“ اس نے بتایا پھر پوچھا ”آپ رفاقت علی کے بارے میں اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہیں جناب؟“

آفتاب کو حقیقت بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے کہا ”رفاقت علی وہ آخری شخص ہے جس کے ساتھ مقتول نصیر احمد کو زندہ دیکھا گیا تھا۔ اگر وہ ہاتھ آ جائے تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔“

آفتاب نے پر تشویش لہجے میں سوال کیا ”کہیں آپ رفاقت علی کو نصیر احمد کا قاتل تو نہیں سمجھ رہے؟“

میں نے کہا ”اس بات کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔ اگر رفاقت علی، نصیر احمد کے قتل میں ملوث نہیں بھی ہے تو وہ اس سلسلے میں ہماری مدد ضرور کر سکتا ہے۔“

وہ پراعتماد لہجے میں بولا ”مجھے توقع نہیں ہے کہ رفاقت نے ایسی حرکت کی ہو۔ وہ اس قسم کا شخص نہیں ہے۔“

”ابھی تو تفتیش جاری ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”بہت جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ بہر حال تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔“

باہر آ کر میں نے آفتاب کے باپ غلام رسول کا بھی شکریہ ادا کیا پھر ہم دوبارہ منظور احمد کے گھر کی طرف آ گئے۔ منظور احمد کو میں نے یقین دہانی کرائی کہ بہت جلد اس کے بیٹے کا قاتل گرفتار ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم دائیں لائن پور جانے کے لئے لاری اڑے ہلائی

سکون سے نہیں بیٹھوں گا.... اور قاتل تک تم مجھے پہنچاؤ گے!“  
”میں....“ وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”ہاں“ تم رفاقت علی۔ چودہ اگست کی شام تم اس کے ساتھ ہی غریب نواز ہوٹل سے نکلے تھے۔ اسی رات نصیر احمد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ مجھے بتاؤ، تم دونوں ہوٹل سے نکل کر کہاں گئے تھے؟“

اس نے بتایا کہ وہ قریب قریب روز ہی نصیر احمد سے ملنے اس کے ہوٹل جاتا تھا جہاں وہ منیر حسین کے فرضی نام سے ٹھہرا ہوا تھا پھر اس نے مجھے نصیر احمد کے ”مشن“ کے بارے میں بالتفصیل بتایا۔ یہ ساری باتیں مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں۔ اس کا بیان ختم ہوا تو میں نے کہا ”یہ سب کچھ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ فی الحال تم مجھے یہ بتاؤ کہ چودہ اگست کی شام ہوٹل سے نکلنے کے بعد تمہاری کیا سرگرمیاں رہی تھیں۔ تم دونوں کہاں کہاں گئے تھے اور کیا کرتے رہے تھے۔ اس رات تم نے نصیر احمد کو کہاں چھوڑا تھا؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ”اگر تم سب کچھ بتا کر قانون کے ساتھ تعاون کرو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا ورنہ میں تمہیں نصیر احمد کے قتل کے الزام میں سیدھا جیل بھجوا دوں گا۔ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم وقوعہ کے دوسری روز یعنی پندرہ اگست کو بھی مقتول سے ملنے گئے تھے اور جب تمہیں پتہ چلا کہ وہ گزشتہ رات ہوٹل واپس نہیں آیا تو تم نے تبصرہ کیا تھا، بے وقوف پاگل۔ اس کے بعد تم نے ہوٹل کا رخ نہیں کیا۔ کیوں؟“

میرے سوالوں کا تسلسل ٹوٹا تو اس نے کہا ”جناب“ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ میرا خیال تھا، وہ لاہور واپس چلا گیا ہو گا کیونکہ اب اس کے پاس وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

رفاقت علی نے بتایا ”نصیر نے مجھے زاہدہ سے ہونے والی آخری گفتگو کا خلاصہ سنا دیا تھا۔ وہ بہت دل شکستہ اور مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا تھا جناب! جس عورت کی خاطر اس نے اپنی زندگی بدل ڈالی، پردیس کاٹا۔ وہ عورت کسی اور کی ہو گئی۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سوچا پھر پر خیال انداز میں بولا ”خیر اس میں زاہدہ کا بھی کیا قصور، نصیر ہی بد قسمت تھا۔ اس کا مقدر اچھا ہوتا تو وہ ایجنٹ کی جیل میں اپنی زندگی کے آٹھ قیمتی سال نہ گناتا۔ اور وہ بھی جرم بے گناہی میں۔ تقدیر کے کھیل بھی نزاع ہوتے ہیں

پر ایسا کوئی تاثر نظر نہ آیا جس سے اس کی عیاری یا مکاری جھلکتی ہو۔ جب میں خاموشی سے خاصی دیر تک اسے گھورتا رہا تو وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا تو بول اٹھا۔

”تھانے دار صاب۔“ اس نے الجھن آمیز انداز میں کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ نے مجھے تھانے کیوں بلایا ہے؟“

میں نے کہا ”بس تمہاری محبت نے جوش مارا اور میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔“

وہ میرے جواب سے مزید الجھ گیا ”جناب! کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”پریشان تو میں بھی ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور میری پریشانی صرف تم دور کر سکتے ہو۔“

”میں.....“ وہ ہکھلایا۔ ”جناب“ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“  
میں دانستہ غیر متعلق سوال کر رہا تھا تاکہ یہ معلوم کر سکوں کہ وہ اوپر سے جتنا سیدھا سا نظر آتا ہے، کیا اندر سے بھی ویسا ہی ہے۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”ہاں رفاقت علی، تمہارے سوا میری پریشانی اور کوئی دور نہیں کر سکتا۔“

”کیسی پریشانی جناب؟“ اس کی آنکھوں میں سینکڑوں غدشات کروٹیں بدل رہے تھے۔  
میں تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا پھر اچانک دھماکا خیز انداز میں کہا ”تمہارے دوست نصیر احمد کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟“

”اوہ!“ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی آماج گاہ بن گیا ”یہ کب کی بات ہے؟“ بہ مشکل اس کی زبان سے ادا ہوا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”اور تم وہ شخص ہو، قتل ہونے سے پہلے جسے نصیر احمد کے ساتھ آخری بار دیکھا گیا تھا۔“

یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ”جناب“ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“  
اس نے لرزاں لہجے میں کہا ”میں تو سمجھ رہا تھا، وہ واپس لاہور چلا گیا ہو گا.... اور اب تو اس بات کو بھی کافی دن گزر گئے ہیں۔“

”ہمت پرانی تو ضرور ہو گئی ہے رفاقت علی لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”مجھے نصیر احمد کے قاتل کی تلاش ہے، جب تک وہ مجھے مل نہیں جاتا، میں

جناب۔

میں نے کہا ”رفات علی“ تم فلسفہ اور منطق فی الحال ایک طرف رکھ دو اور مجھے بتاؤ وقوعہ والے روز تم دونوں ہوٹل سے نکل کر کدھر گئے تھے؟“

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ میں جب بھی یہ سوال کرتا تھا وہ جواب میں غیر متعلق کوئی قصہ چھیڑ دیتا تھا۔ اس بات سے میں کھنکا اور میں نے سوچا کہ یقینی طور پر کہیں نہ کہیں کوئی گریز ضرور ہے ورنہ اس کی جھجک کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ کوئی اتنا مشکل سوال تو نہیں تھا۔

رفات علی نے ایک مرتبہ پھر جواب دینے میں تامل کیا تو میں نے کہا ”مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم حوالات کی ایک رات بھی برداشت نہیں کر سکو گے۔“

میرے رعب دار اور اٹل لہجے نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے بتایا ”اس شام نصیر کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ وہ باتوں ہی باتوں میں کئی بار خودکشی کا ارادہ بھی ظاہر کر چکا تھا۔ میں نے سوچا اس کا دل بسلانے کے لئے تھوڑی تفریح کی جائے۔ وہ خلاف معمول میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا حالانکہ وہ ہوٹل سے زیادہ دیر کے لئے باہر نہیں جاتا تھا لیکن اس شام اس نے کوئی تردد نہیں کیا اور فوری طور پر ہوٹل سے نکل آیا“ وہ ایک لمحے کو رکا تو میں نے پوچھا ”تم مقتول کو کس قسم کی تفریح کرانے لے گئے تھے؟“

”میرے ذہن میں کوئی خاص پروگرام نہیں تھا۔“ اس نے بتایا ”میں نے نصیر سے کہا کہ وہ میرے ساتھ گھر چلے۔ رات کا کھانا وہ میرے گھر میں کھائے۔“

نصیر نے کہا ”یار“ مجھے بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ سینے میں سانس رک رہی ہے۔ کھلی ہوا میں چہل قدمی کرتے ہیں۔“

میں کارخانے سے سیدھا اس کے ہوٹل پہنچا تھا۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے نصیر سے کہا ”چلو، گھر نہ جاؤ۔ بازار ہی میں کھانا کھا لیتے ہیں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔

”تمہیں بھوک نہیں ہے تو یار کیا مجھے بھی اپنے ساتھ بھوکا مارو گے؟“ میں نے مذاق

کے انداز میں کہا ”میرے پیٹ میں تو چوہے فٹ بل کھیل رہے ہیں۔“

”تم کھاؤ، میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔“

میں نے ایک تانگے کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”مختصہ گھر چلتے ہیں یار“ وہاں بڑے

اچھے نکلے کباب ملتے ہیں۔“

میں دراصل یہ سب کچھ نصیر کی دل جوئی کے لئے کر رہا تھا۔ کھانا تو میں گھر جا کر بھی کھا سکتا تھا۔ وہ گہری چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ میں اس کا دل بسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مختصہ گھر چوک میں آکر ہم نے کھانا کھایا۔ نصیر نے میرے پیٹ پر دو چار لقمے ہی لئے تھے۔ ہم فارغ ہوئے تو اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

”یار رفات، فلم دیکھتے ہیں۔ میں نے راستے میں ایک سینما پر مسرت نذیر کی ایک فلم کا بورڈ لگا دیکھا تھا۔“

”مسرت نذیر“ نصیر کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔ یہ بات میں جانتا تھا لیکن اگر میں اس کے ساتھ سینما چلا جاتا تو واپسی میں آدمی رات تو ہو ہی جاتی کیونکہ وقت اتنا ہو چکا تھا کہ ہم آخری شو ہی دیکھ سکتے تھے۔ مجھے گھر والوں کو جواب دینا مشکل ہو جاتا پھر جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے نصیر کی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی حالت نے مجھے دل گیر کر دیا تھا۔ میں نے سوچا، گھر والوں سے کوئی بھی بہانہ کر لوں گا۔ چلو اگر سینما دیکھ کر نصیر ذرا سنبھل جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ سینما فلم دیکھنے چلا گیا۔

فلم ختم ہوئی۔ ہم سینما سے باہر آئے تو میں نے نصیر سے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی گھر چلے۔ رات وہ میرے گھر پر گزارے، صبح لاہور چلا جائے۔ اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ اس نے میرے ساتھ جانے کی حالی بھری۔ ہم جیسے ہی گول بازار کے قریب پہنچے، نصیر نے کہا ”یار“ آج تو ذرا موج میلا کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”میں نے مفلوک انداز میں اسے گھورا۔ وہ جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا ”یار رفات، تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ بس آج کوئی البیہ گانا سننے کی طبیعت ہے۔ صرف مجرا۔۔۔ اور کچھ نہیں۔“

مجھے اس کی حالت پر رہ رہ کر ترس آ رہا تھا۔ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ میرا لہجہ ایسا تھا کہ اس کی دل شکنی بھی نہ ہو اور میں بھی بچ جاؤں ”یار نصیر“ میں تو اب گھر جاؤں گا۔ بہت دیر ہو گئی ہے، یہ شوق تمہیں تنہا ہی پورا کرنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے یار، جیسی تمہاری مرضی۔ اب تو مجھے ساری زندگی تنہا ہی گزارنا ہے۔ اپنے ساتھ۔ ابھی سے عادت ڈالوں گا تو بات بنے گی۔“ ایک لمحے کو گردن جھکا کر اس نے کچھ سوچا پھر کہا ”تم اتنا تو کر سکتے ہو رفات کہ مجھے کسی اچھے کوٹھے کا راستہ دکھا دو۔ تم اسی علاقے کے رہنے والے ہو۔“

میں نے کہا ”میں اس علاقے میں رہتا ضرور ہوں لیکن اس بازار کی جانب جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی شوق ہے۔ ہاں! البتہ میں نے زمرہ بانی کے کوٹھے کی بہت تعریف سن رکھی ہے۔“

وہ جلدی سے بولا ”بس تو پھر وہیں تک راہ نمائی کر دو۔“

”اور میں نے پوچھ پچا کر نصیر احمد کو زمرہ بانی کے کوٹھے تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں گھر آ گیا۔ دوسرے روز میں نے ہوٹل جا کر نصیر احمد کے بارے میں دریافت کیا۔ اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔“

”اور تم نے سمجھ لیا کہ وہ واپس لاہور چلا گیا؟“ رفاقت کی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا۔

وہ بولا ”اور وہ کہاں جا سکتا تھا۔ اسے جتنا بڑا صدمہ پہنچا تھا اس کے بعد تو وہ لاکھ پور میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔“

”لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسی رات قتل کر دیا گیا۔“ میں نے کہا ”وہ کیسے آنے جانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔“

”بے چارہ۔ بڑا برا انجام ہوا جناب!“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے رفاقت علی سے پوچھا ”مجھے غریب نواز ہوٹل کے مالک نے بتایا تھا کہ مقتول نصیر احمد کے پاس کوئی سالانہ وغیرہ بالکل نہیں تھا۔ تم نے اس کے پاس کوئی ایسی چیز دیکھی تھی؟“

”نہیں جناب! اس کے پاس واقعی کوئی سالانہ نہیں تھا۔“

”نقدی وغیرہ تو ہو گی؟“

یہ سوال میں نے اس لئے کیا تھا کہ مجھے لاش کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ مقتول کے جسم پر ایک پتلون اور قمیص کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور تمام جیبیں بھی خالی تھیں۔ رفاقت علی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”نصیر احمد کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی جو وہ اپنی جیبوں میں ہی رکھتا تھا۔ میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ وہ اپنے پاس اتنے پیسے نہ رکھے لیکن میری بات اس نے مانی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔۔۔“

”وہ کیا رفاقت علی؟“

”ہو سکتا ہے کسی نے اسے رقم کے لئے قتل کر دیا ہو۔“

میں نے کہا ”ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ پھر پوچھا ”رقم کے علاوہ تم نے مقتول نصیر احمد کے پاس اور کوئی چیز دیکھی تھی؟“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”اس کی کلائی پر ایک غیر ملکی گھڑی تھی جو خاصی قیمتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ نصیر احمد کے گٹے میں سونے کی چین بھی تھی اور ہاں اس کی ایک انگلی میں کوئی انگوٹھی وغیرہ بھی تھی جو میرے خیال میں سونے کی ہی تھی۔ اس میں ایک بیش قیمت گھینہ بھی جڑا ہوا تھا۔ نصیر نے مجھے بتایا تھا کہ گھرے سبز رنگ کا وہ گھینہ زمرہ تھا جو اس نے ترکی کے ایک بازار سے خریدا تھا۔“

گویا نصیر احمد ایک اجنبی شہر میں اپنے قتل کا پورا سالانہ لئے بے فکری سے مگوم رہا تھا۔ میں نے رفاقت علی سے پوچھا ”تمہیں کچھ اندازہ ہے نصیر احمد کے پاس کتنی رقم ہو گی؟“

”میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا جناب!“

میں نے کہا ”تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری فراہم کردہ معلومات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ میں اس کی تصدیق بھی کروں گا۔“

”جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“ وہ بے خوفی سے بولا ”آپ جیسے جی چاہے تصدیق کر لیں۔“

میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا ہو گا لیکن میں اپنے خیالات سے اسے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ دو چار مزید سوالات کے بعد میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ ”تمہیں رات کو ڈیوٹی پر بھی جانا ہے رفاقت علی اس لئے گھر جا کر آرام کرو۔“

وہ میرا شکریہ ادا کر کے جانے لگا تو میں نے پیچھے سے کہا ”اور ہاں جب تک نصیر احمد کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا تم روزانہ تھانے میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور حاضری دو گے۔“

”آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔

میں نے ناکیدی لہجے میں کہا ”اور تھانے میں اطلاع دیئے بغیر تم شر سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”بہت بہتر جناب۔“

رفاقت علی کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا۔ نصیر احمد کو جو بھی حادثہ پیش آیا تھا اس کا زمرہ بانی کے کوٹھے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہو گا۔ ان کوٹھوں پر روزانہ لاتعداد کمائیاں جنم لیتی تھیں اور طرح طرح کے واقعات پیش آتے تھے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی میں گول بازار کے ایک کوٹھے پر جا چکا تھا۔ مجھے ایک گمشدہ شخص کی تلاش تھی جس کے بارے میں مجھے

پتہ چلا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مجرا دیکھنے اس بازار گیا تھا۔ میں نے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ اسی سلسلے میں چمپا ہائی کے کوٹھے پر چھاپا مارا تھا۔

رفات علی کی رہائی نصیر احمد کے زمرہ ہائی کے کوٹھے پر جانے کا سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ زمرہ ہائی پر اگر سختی کی جاتی تو تفتیش کی راہ میں سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے نصیر احمد کے قاتل تک پہنچنے کی لئے کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ شاید میں اس بات کا ذکر کرنا بھول گیا تھا کہ اس دوران میں ایک گاؤں کی حیثیت سے فضل شوز پر بھی گیا تھا اور فضل کریم کو بھی ٹھولا تھا لیکن وہ کسی طور بھی اس معاملے میں ملوث نظر نہیں آتا تھا۔ یہی خیال میرا فضل کریم کی بیوی زاہدہ کے بارے میں بھی تھا۔ زاہدہ نے اپنی صفائی میں مجھے جو داستان سنائی تھی، ابھی تک اس میں کوئی بات غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔ وہ سراسر بے گناہ نظر آتی تھی۔

میں نے آئندہ تفتیش کا رخ زمرہ ہائی کے کوٹھے کی جانب موڑ دیا۔ دوسرے روز میں دہرے کے وقت گول بازار پہنچ گیا۔ اس وقت میں سادہ لباس میں تھا اور میرے ساتھ کوئی دوسرا پولیس اہلکار نہیں تھا۔ دہرے کا وقت میں نے خاص طور پر منتخب کیا تھا کیونکہ دہرے میں کوٹھے ویران ہوتے ہیں۔ طوائفیں یا تو آرام کر رہی ہوتی ہیں یا پھر شام کی تیاریوں کے سلسلے میں مصروف ہوتی ہیں۔ ایسے وقت میں زمرہ ہائی سے زیادہ سہولت اور تفصیل سے بات ہو سکتی تھی۔

زمرہ ہائی نے بوے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ وہ اس وقت ایک مسمری پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ ”آئیے آئیے ملک صاحب۔ رہے نصیب۔ آج تو ہماری سرکار تشریف لائی ہے۔ اتنی رحمت کیوں کی حضور۔ باندی کو حکم دیا ہوتا۔ آپ کے پاؤں کی دھول خود چل کر آپ کے قدموں میں پہنچ جاتی۔“

اس نے مجھے کھنکھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے پاس ادھیڑ عمر کا ایک شخص موجود تھا جو ایک صوفے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں نے اس شخص پر نگاہ ڈالتے ہوئے زمرہ ہائی سے کہا ”میں ایک کیس کے سلسلے میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“

وہ میری نگاہ کا اشارہ سمجھ گئی ”قدور بھائی“ آپ دوسرے کمرے میں چلے جائیں۔“ زمرہ نے حقہ نوش شخص سے کہا پھر اندر کی جانب منہ کر کے پکارا ”نیلیم، کوئی ٹھنڈے گرم کا انتظام کرو۔ بوے معزز مہمان آئے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں زمرہ بائی۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا ”میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ مجھے امید ہے، تم تعاون کرو گی اور جو میں پوچھوں گا اس کا سچا اور سیدھا جواب دو گی۔“

وہ ایک ناز سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”تعاون کی کیا بات کرتے ہیں جناب۔ ہمارا تو دھندا ہی پولیس کے تعاون سے چلتا ہے پھر ہم آپ سے تعاون نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ بے شرمی سے ہنسی اور آنکھ بھی مار دی۔

میں نے اس کی یہ بے ہودہ حرکت نظر انداز کر دی اور براہ راست اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے پوچھا ”زمرہ بائی، میں نے سن رکھا ہے، طوائف کو ہر قسم کے آدمیوں کی بڑی پہچان ہوتی ہے؟“

”تشریف کا شکریہ ملک صاحب۔“ وہ زیر لب مسکرائی ”ہمیں بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ کی دعا سے یہ عاجز بندی چہرہ دیکھ کر دل کا حال جان جاتی ہے۔“

”چہرہ دیکھتی ہی ہو یا انہیں یاد بھی رکھتی ہو؟“

”یاد بھی رکھتی ہوں جناب!“ وہ فخریہ انداز میں بولی ”یہ تو میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ خدا کے فضل سے میری یادداشت بہت اچھی ہے۔“

میں نے کہا ”کوئی ڈیڑھ ماہ قبل، چودہ اگست کو ایک شخص تمہارے کوٹھے پر مجرا دیکھنے آیا تھا۔ کوئی پردہسی تھا، پتلون اور قمیص میں....“

میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا لیکن فوری طور پر سنبھل گئی اور مسکراتے ہوئے بولی ”آیا ہو گا جی۔ یہاں تو روزانہ درجنوں افراد مجرا دیکھنے آتے ہیں۔“

”میں درجنوں افراد کی نہیں، اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو پتلون قمیص میں تھا؟“

وہ بولی ”یہاں تو ہر ایک کے لئے ہمارا دروازہ کھلا ہے۔ چاہے کوئی سا بھی لباس پہن کر آجائے۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ واضح جواب دینے سے کترا رہی تھی۔ اس کے اس رویے نے میرے دل میں شک پیدا کر دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ مضطرب لہجے میں پوچھنے لگی ”آخر بات کیا ہے ملک صاحب! آپ کس قسم کی تفتیش کرنے یہاں آئے ہیں؟“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ مجھ

کے لئے کسی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری جانب سے کسی تشویش میں مبتلا نہ رہے اور میری آمد کا زیادہ اثر نہ لے۔

اس نے کریدنے والے انداز میں پوچھا ”ملک صاحب“ آپ پتلون قیص والے آدمی کے بارے میں کس قسم کی تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ کون تھا وہ تماش بین اور کہاں سے آیا تھا۔ خداخواستہ کوئی خطرناک بندہ تو نہیں تھا؟“

”بہت خطرناک بندہ تھا۔“ میں نے اسے مکمل اندھیرے میں رکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا ”شکر کرو“ اس نے یہاں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔“

وہ آہستہ آہستہ لائن پر آ رہی تھی ”مجھے یاد آ رہا ہے ملک صاحب، جس بندے کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہ ہمارے کوشے پر آیا تو تھا لیکن مجرا دیکھنے کے بعد خاموشی سے چلا گیا تھا۔“

میں نے دل میں اسے ایک ناقابل اشاعت ”خطاب“ سے نوازا پھر زبان سے کہا ”تمہاری قسمت اچھی تھی زمر بانی جو وہ خاموشی سے چلا گیا۔“

اس کے دل میں تجسس بھڑک اٹھا تھا۔ وہ بولی ”کیا وہ کوئی وارداتیا تھا؟“

”خوف ناک قاتل تھا وہ اور اشتہاری بھی۔“ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”لاہور کی کوٹ لکھیت جیل سے فرار ہوا تھا۔“

”حالانکہ شکل سے تو بہت معصوم لگتا تھا۔“ وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔

میں نے کہا ”تم نے ضرور کسی کی دعائی ہے۔ اگر وہ مفروز تمہارے کوشے سے گرفتار ہوتا تو تم اور تمہارے ساتھی سیدھے جیل چلے جاتے۔“

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی ”یا اللہ میری توبہ۔ آپ نے مجھے بہت بڑی مصیبت سے بچالیا۔“

میں نے اٹھتے ہوئے آخری وار کیا ”زمر بانی“ اگر اب وہ بندہ تمہارے کوشے کا رخ کرے تو اسے کسی طرح باتوں میں لگا کر مجھے اطلاع کر دینا۔ حکومت نے بہت بڑا انعام رکھا ہے اسکی گرفتاری پر.... اور گرفتار کرنے والے کی ترقی کا بھی وعدہ کیا ہے۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ وہ جلدی سے بولی پھر اپنی فطرت کے مطابق کہا ”انعام میں میرا بھی حصہ ہو گا تمہارے وار صاحب۔“

”ضرور ضرور۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر وہاں سے واپس آ گیا۔

زمر بانی میری نظروں میں پوری طرح مشکوک ہو چکی تھی۔ میں نے اتنی طویل گفتگو

سے نظریں چرا کر بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر ارادی طور پر اپنی انگلیوں کو بھی مروڑ رہی تھی۔ لاشعوری طور پر میری نگاہ اس کے ہاتھوں پر گئی اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ زمر بانی کے بایں ہاتھ کی انگشت شہادت میں مجھے ایک طلائی انگوٹھی نظر آئی جس میں گمرے سبز رنگ کا ایک عکینہ جگمگا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا، یہ انگوٹھی مقتول نصیر احمد کی ہے۔

میں نے بہ مشکل تمام اپنے اندرونی جذبات و احساسات کو چہرے پر ظاہر ہونے سے روکا۔ زمر بانی مجھے اپنی ہاتھوں کو گھورتے ہوئے دیکھ کر بولی ”ملک صاحب“ آپ یوں کیا دیکھ رہے ہیں؟“

میں نے فوری طور پر بات بنائی اور پرسکون لہجے میں کہا ”کچھ نہیں“ میں تمہاری انگوٹھی دیکھ رہا تھا۔ بڑی خوب صورت ہے!“

”سید پور کے چوہدری صاحب کا تحفہ ہے سرکار۔“ وہ ہونٹوں پر پھینکی مسکراہٹ سجا کر بولی۔

میں نے خوشگوار لہجے میں کہا ”کیا میں اسے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔“

”بڑی خوشی سے مائی باپ۔“ اس نے کہا تو بڑی بے پروائی سے تھا لیکن میں نے محسوس کیا، اس کے لہجے میں گریز نما گھبراہٹ پوشیدہ تھی۔

پھر اس نے انگوٹھی اتار کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ وہ ایک مردانہ انگوٹھی تھی اور اس کے رنگ پر دھاگا لپٹا ہوا تھا۔ میں نے انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا ”لگتا ہے“ یہ انگوٹھی ساز دے کر نہیں بنوائی گئی۔ اس کا ساز تمہاری انگلی سے خاصا بڑا ہے اسی لئے تم نے اس پر دھاگا لپٹ رکھا ہے۔“

وہ ایک اوا سے مسکرائی ”دل والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں سرکار۔ چوہدری صاحب کو میری بیٹی ستارہ کا رقص اتنا پسند آیا کہ ہاتھ سے زمر کی انگوٹھی نکال کر اس کے قدموں میں ڈال دی۔ آپ کا اندازہ درست ہے، یہ میرے ساز سے بڑی ہے میں تو چاہتی تھی، اسے ستارہ ہی پہنے لیکن اس کی تو دو انگلیوں میں بھی ڈال دیں تو نکل آئے۔ ماشاء اللہ میری ستارہ کی انگلیاں بڑی پتلی اور لمبی ہیں بالکل موی شمعوں جیسی۔ کبھی آپ رات میں آئیں تو.... اس کا رقص دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔“

میں نے انگوٹھی اسے واپس دیتے ہوئے کہا ”کبھی موقع اور وقت ملا تو ضرور آؤں گا۔“

اس وعدے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ بات میں نے محض اسے خوش کرنے

اس سے محض اس لئے کی تھی کہ اسے محسوس نہ ہو، میں اس کے خلاف سوچ رہا ہوں۔ میں جو کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، اس کے پیش نظر ضروری تھا کہ ساری کارروائی زمرہ بانی کی بے خبری میں کی جائے اور اسے کسی قسم کی چالاکي دکھانے کا موقع نہ مل سکے۔ مجھے یقین تھا کہ نصیر احمد کی موت اسی کوٹھے پر واقع ہوئی تھی۔



اسی رات میں نے سکندر علی کو چند سپاہی دے کر زمرہ بانی کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیا۔ اے ایس آئی سکندر علی کو میں نے ہدایت کر دی تھی کہ ہر قیمت پر زمرہ بانی کو گرفتار کر کے لانا ہے اور کسی رعایت سے کام نہیں لینا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی سکندر علی اپنے مشن سے کامیاب لوٹ آیا اور میرے کمرے میں آکر خوش خبری سنائی۔

”ملک صاحب، طوائف زمرہ بانی حوالات میں پہنچ چکی ہے۔“

”شبابش میرے شیر۔“ میں نے اس کے کارنامے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا

”اس سے ملنے جو بھی آئے، اسے بلا تردد حوالات میں بند کر دو۔“

سکندر علی نے کہا ”جناب، وہ آپ سے بات کرنے کو بہت بے چین ہے۔“

”اس سے بات ہوگی سکندر علی اور ضرور ہوگی۔ ذرا اس کی مت ٹھکانے آجائے۔“

میں نے گنبد لہجے میں کہا ”اور ہاں، اسے مکمل بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ کسی قسم کا ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے اور حملے کا کوئی بھی فرد اس سے کوئی بات نہ کرے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”جو آپ کا حکم جناب۔“ سکندر علی نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز میں تھانے پہنچا تو معلوم ہوا، رات کو میرے جانے کے بعد زمرہ بانی کا نام نداد دلال بھائی قادر بخش عرف قادی اپنی ”لاڈلی بہن“ کی خبر گیری کے لئے تھانے آیا تھا اور شبینہ ڈیوٹی والے حوالدار نے میری ہدایت کے بہ موجب اسے حوالات میں بند کر دیا تھا۔ زمرہ نے وہ پوری رات چیختے چلاتے اور خوفناک منہ کی دھمکیاں دیتے ہوئے گزاری تھی لیکن کسی نے اس کی بکواس پر کان نہیں دھرا تھا۔ قادی نے بھی تھوڑا بہت شور مچایا تھا لیکن زمرہ کے برعکس وہ آدھی رات کے بعد خاموشی کے ساتھ حوالات کے ٹھنڈے فرش پر پڑ کر سو رہا تھا جب کہ زمرہ ساری رات اکڑوں بیٹھی رہی تھی یا شلٹی رہی تھی۔

میں نے اس روز بھی دونوں میں سے کسی کو اپنے کمرے میں نہ بلایا اور نہ ہی ان کے پاس جا کر کوئی بات کی۔ میرا رویہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ زمرہ کے ساتھ ساتھ قادی کو بھی

بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ دوسری رات وہ بھی نہ سو سکا۔ اس دوران میں زمرہ کی حالت خاصی ابتر ہو چکی تھی۔

گرفتاری کے پورے اڑتالیس گھنٹے بعد میں نے زمرہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس کی حالت مردود کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا ”کیا خیال ہے بائی جی“ میں سوالات کا آغاز کروں یا ابھی کوئی کسر باقی ہے؟“

”پانچ۔“ اس کے منہ سے ٹھیف سی آواز خارج ہوئی۔

میں نے کہا ”پانی بھی لے گا۔ لیکن سچ بولنے کے بعد۔“

”میں کچھ نہیں چمپاؤں گی۔“ وہ کراہی ”خدارا“ مجھے کچھ کھانے کو دو۔“

میں نے اس کی التجا کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”نصیر احمد کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا۔ اب یہ نہ پوچھنا“ کون نصیر احمد۔ میں اسی قماش بین کا ذکر کر رہا ہوں جو چودہ اگست کی رات تمہارے کوٹھے پر مجرا دیکھنے آیا تھا۔۔۔ اور جس نے گہری نیلی چٹون اور آسمانی قمیص پہن رکھی تھی۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ وہ گلے کو سلاتی ہوئے سسکی ”مجھے دو بوند پانی دے دو۔ میری جان نکل رہی ہے۔“

میں نے سفاک لہجے میں کہا ”تمہارے جیسی عورتیں اتنی آسانی سے نہیں مر سکتیں فائنش۔ جب تک تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گی، تمہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ تم یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گی۔“ پھر میں نے حوالدار سلطان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اسے لے جا کر دوبارہ حوالات میں بند کر دو۔“

”میں ابھی سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔“ زمرہ نے نزار مگر کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا ”پہلے مجھے کچھ کھانے کو دیں تاکہ میں بول تو سکوں۔“

میری تدبیر کارگر ثابت ہوئی تھی۔ میں نے حوالدار سے کہا ”اسے پوچھ کچھ کے کمرے میں لے جاؤ اور تھوڑا کھانے پینے کو دو مگر صرف اتنا کہ یہ بولنے کے قابل ہو سکے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

حوالدار اسے لے کر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں پوچھ کچھ کے کمرے میں پہنچا تو زمرہ ہر قسم کے تعاون کی لئے تیار بیٹھی تھی۔ میرے ایک اشارے پر وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگی۔ دقوہ کی رات اس کے کوٹھے پر جو کچھ پیش آیا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے زمرہ بانی کا اقبالی بیان بھی سمجھ لیں۔

کی جان میں جان آئی تو ایک نئی پریشانی ان کی منتظر تھی۔ نصیر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ زمرہ نے اسے ہلا جلا کر دیکھا مگر اس میں زندگی کے آثار نظر نہ آئے۔ یہ دیکھ کر زمرہ اور قادی کے فرشتے کوچ کر گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ نصیر احمد مر چکا تھا۔ زمرہ کے شاطر ذہن نے فوری طور پر ایک راہ تلاش کر لی۔ اس نے قادی کو ہدایت کی کہ وہ خاموشی کے ساتھ نصیر کو لے جا کر کہیں ویران جگہ پر ڈال آئے۔ قادی موقع کی نزاکت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ بجلی کی سرعت سے معروف عمل ہو گیا۔ اس نے پوری احتیاط کے ساتھ نصیر کو اپنے کندھے پر لادا اور ایک تانگے پر سوار ہو کر دھوبی گھاٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ بے ہوش نصیر کو اس نے دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے تانگے کی سیٹوں کے پیچے بنے خانے میں گھسیرھوایا تھا۔

جب اس نے نصیر کے بے حس و حرکت جسم کو دھوبی گھاٹ کی جھاڑیوں میں پھینکا تو اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے نصیر کی کلائی پر سے قیمتی گھڑی، انگلی میں سے زمرہ کی انگوٹھی، گلے میں سے طلائی زنجیر اور جیبوں سے بھاری نقدی نکال لی۔ اس کھینچا تانی میں نصیر کے جسم میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی جس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ قادی نے ہمیشہ کے لئے اس سے نجات پانے کے لئے اپنا خنجر نکال لیا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ خنجر نصیر احمد کے سینے میں گھونپ دیا۔ اب وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ نصیر کے بدن نے ایک کمزور سا جھٹکا کھایا پھر ساکت ہو گیا۔ وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

قادی نے واپس آ کر زمرہ کو سب کچھ بتایا اور مسروقہ مال بھی اس کے حوالے کر دیا۔ اسے قادی کا یہ کارنامہ پسند نہیں آیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ چند روز بعد زمرہ نے طلائی زنجیر فیروزہ کو دے دی۔ زمرہ کی انگوٹھی اس نے دھاکا لپیٹ کر اپنی انگلی میں سجائی اور نقدی اور گھڑی کو بڑے صندوق میں محفوظ کر دیا۔

زمرہ کی قسمت بری تھی کہ وہ مسروقہ انگوٹھی کو اپنے استعمال میں لے آئی اور میں اس کی وجہ سے مشکوک ہو گیا۔ جب ستارے گردش میں ہوں تو انسان ایسی ہی حماقتیں کرتا ہے۔ زمرہ کے بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ قتل اس کے ہاتھ سے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ نصیر کی جان لینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، قادی کو بچانے کے لئے کیا تھا۔ نصیر احمد کا اصل قاتل قادی تھا لایچ نے جس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اگر وہ نصیر کو جھاڑیوں میں پھینک کر واپس آ جاتا تو ممکن تھا نصیر کا یہ حشر نہ ہوتا۔

زمرہ کے اقبالی جرم کے بعد قادی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی

حسب معمول مجرا ختم ہوا اور تماش بین یکے بعد دیگرے اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ تھوڑی دیر میں مجرا گاہ خالی ہو گئی لیکن ایک شخص ابھی بھی وہاں موجود تھا یعنی مقتول نصیر احمد۔ نو عمر رقصہ فیروزہ کے رقص پر اس نے دریا دلی سے ٹوٹ نچھاور کئے تھے۔ قادی نے نصیر سے کہا کہ وہ بھی چلتا پھرتا نظر آئے، کھیل ختم ہو چکا ہے لیکن نصیر احمد بھڑک گیا، اس کا اصرار تھا کہ وہ فیروزہ کا مزید رقص دیکھے گا۔ حیرت انگیز طور پر وہ فیروزہ کو زاہدہ کے نام سے مخاطب کر رہا تھا اور منت خوشامد سے اسے دوبارہ رقص کے لئے کہہ رہا تھا۔ قادی نے اسے زبردستی وہاں سے نکالنا چاہا تو وہ قادی سے الجھ گیا۔ اس نے قادی کو ایک زور دار دھکا دیا اور فیروزہ کی جانب جھپٹا پھر اس کی کلائی تمام کر کھینچنے ہوئے اسے باہر کی طرف لے جانے لگا۔ فیروزہ نے ایک زور دار چیخ ماری۔ اس دوران میں قادی بھی سنبھل چکا تھا۔ وہ نصیر کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گیا۔

اس کے بعد دونوں میں باقاعدہ ہاتھ پائی ہونے لگی۔ فیروزہ موقع ملتے ہی ایک اندرونی کمرے کی طرف لپک گئی۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ نصیر نے تڑپ کر اسے آواز دی ”زاہدہ رک جاؤ۔ مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔“ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قادی نے داؤ مار کر اسے فرش پر گرادیا۔ قادی اور زمرہ کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ کوئی پاگل شخص تھا جو فیروزہ کو زاہدہ کہہ کر پکار رہا تھا۔ کچھ بھی تھا، نصیر احمد، قادی پر ہر طرح سے بھاری تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس نے قادی کو چت کر دیا اور پھر اس کی سینے پر سوار ہو کر جنونی انداز میں اس کا گلا دبانے لگا۔

زمرہ نے یہ صورت حال دیکھی تو بوکھلا گئی۔ اب قادی کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آواز نکل رہی تھی۔ فوری طور پر زمرہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتی تو ممکن تھا، نصیر، قادی کی جان ہی لے لیتا۔ زمرہ نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے کے ایک کونے میں اسے جھاڑوں پڑا دکھائی دیا جس کا دستہ لکڑی کا تھا اور خاصا بھاری بھی تھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے وہ ڈنڈا نما دستہ نصیر احمد کے سر کے پچھلے حصے میں پوری قوت سے رسید کر دیا۔ اس پر بھی جب نصیر احمد نے قادی کی گردن نہیں چھوڑی تو زمرہ پے درپے اس کے سر پر ڈنڈے برسائے لگی۔ کچھ دیر اس نے نصیر کی بازو اور کندھے پر بھی کئے۔ اسی دوران میں سر میں گلنے والی ایک ضرب کاری ثابت ہوئی اور نصیر تیزوکار قادی کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔

زمرہ نے بہ مشکل قادی کو نصیر کے پیچے سے نکالا۔ قادی کے حواس بحال ہوئے اور اس



بھوک پیاس نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ تھانے کی مزید خاطر داری برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دونوں کا اقراری بیان قلم بند کر کے کیس کا چالان تیار کیا اور دو روز بعد انہیں حوالہ عدالت کر دیا۔ زمرہ کو زمرہ راس نہیں آیا تھا۔

لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کی تصدیق نہ ہو سکی۔ میری پوری تفتیش کے دوران میں کسی بھی مرحلے پر یہ بات سامنے نہیں آئی کہ مقتول نے کوئی نشہ آور شے استعمال کی ہو یا کسی دوسرے نے اسے ایسی کوئی چیز کھلائی ہو۔ میرے خیال میں وہ زاہدہ سے دائمی جہاد کی کا نشہ تھا جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نو عمر رقاصہ فیروزہ بھی اسے زاہدہ ہی نظر آ رہی تھی۔ زاہدہ اس کی آنکھ کی پتلی بن گئی تھی۔

